DEAD RECKONING

(ڈھاکہ کہانی — کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی)

سرمیلا بوس

DEAD RECKONING

ڈھاکہ کہانی

کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی

سرمیلا بوس

ترجمہ: نذر حسین کاظمی

آرمی پبلشنگ ہاؤس

انتساب

ددوا اور دیدا

چارو چندرا چودھری اور چھایا دیوی چودھرانی

ہر بات کے لیے

فہرست

اظہارِ تشکر

میں ان تمام افراد کی مشکور ہوں، جنھوں نے اس کتاب کے لیے تحقیق اور تصنیف کے دوران میری مدد کی۔ تمام افراد کا نام لے کر شکریہ ادا کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں صرف چند افراد کے نام ذیل میں درج کر رہی ہوں:

میں ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے حوالے سے اپنے تجربات پر مجھ سے گفتگو کی۔ ان سب کے نام کتاب میں جابجا شامل ہیں اس کے علاوہ ضمیمہ ۲ میں بھی ان کے نام درج کر دیے گئے ہیں، صرف چند افراد کے نام پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔

بنگلہ دیش میں، میں تنویز مکمل اور ان کی پوری ٹیم کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جنھوں نے مجھے واقعات کی تفتیش کرنے، عینی شاہدین سے رابطے کرنے، کتابیں اور سمعی و بصری مواد تلاش کرنے میں میری مدد کی اور ٹرانسپورٹ فراہم کی اور اس دوران بنگالی کھانوں سے میری تواضع کرتے رہے؛ راشد حیدر، جنھوں نے مجھے اپنی تالیف کردہ عینی شاہدین کے بیانات پر مشتمل جلدیں فراہم کیں جن کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی؛ مفیض الحق اور ان کے اسٹاف کا جنھوں نے لبریشن وار میوزیم سے اہم تحقیقی مواد فراہم کیا؛ اچنتیا، جس کے بغیر کھلنہ میں تحقیق کرنا ناممکن تھا؛ ظفر احمد جنھوں نے تحقیقی مواد اور انٹرویو کرنے کے لیے افراد کی نشاندہی کی۔ غلام حسنین اور انکے خاندان اور ڈھاکہ کی کریم فیملی کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔

پاکستان میں فرید اور زاہدہ احسان الدین کے خاندان کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے ہر معاملے میں میری مدد کی؛ عبدالحمید اور حوا آدم جی، مریم عمر بھائی اور ان کے خاندان کا بہترین مہمان نوازی کے لیے؛ اندو متھا اور ان کے خاندان کا میوزک اور اپنے گھر میں ٹھہرانے کے لیے؛ اشرف جہانگیر قاضی کا جنھوں نے میرے پہلے مقالے کے بارے میں سنتے ہی (بغیر پڑھے) مجھ سے رابطہ کیا؛ لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان کا جنھوں نے کتاب کے عنوان کے لیے مجھے اصطلاح بتائی اور بریگیڈیئر سلیم ضیا، بریگیڈیئر شوکت قادر، بریگیڈیئر جعفر خان، کرنل انیس احمد اور کرنل ثمین جان بابر کا

جنھوں نے دوسرے افسران سے میرے رابطے کرائے جو میری تحقیق میں معاون ثابت ہوئے۔
تین براعظموں میں، میں اٹی ابراہم، رکن ایڈوانی، گوری چٹرجی، سمن چٹوپادھے، اسٹیفن کوہن، سواپن داس گپتا، سنندا کے دتا رائے، میگھنا گوہاٹھاکرتا، اعجاز حیدر، برائن ہیچر، یاسمین حسین، انیتا اور نونیتا کالرا، جہانگیر کرامت، سکھاے لہری، ڈیوڈلڈن، اعجاز نبی، زرین نقوی، کلپسو نکولائے ڈس، پی مٹھائی، ولیم ملام، پولی اوہینلن، رام منوہر ریڈی، رجت رائے، آئی جے سنھگ، پوروی وورا، ڈیوڈ واشبروک؛ پروین آغا اور ایرن بروچا جنھوں نے دوران سفر معاونت کی۔ آخر میں میں ایلن اور اپنے بچوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔
میں، آنند بازار پتریکا، سیگور سینٹر برائے ایشین اسٹڈیز، جارج واشنگٹن یونیورسٹی، آفس آف دی ہسٹورین آف دی یو ایس اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ، دی برٹش لائبریری، بالخصوص نیوز پیپر سیکشن؛ سکتی رائے، آرکائیوز اور آنند بازار پتریکا کی لائبریری؛ امر چند منگلداس: ٹاٹا گروپ کے ارکان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میں .Hurst & Co اور Columbia University Press کی پوری ٹیم بالخصوص مائیکل ڈوائیر، مینجنگ ڈائریکٹر .Hurst & Co کے مشوروں اور حوصلہ افزائی پر ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔
ہارورڈ میں پبلک پالیسی میں شماریات کے اطلاق کے بارے میں پڑھتے ہوئے، میں نے سیکھا کہ اصل چیلنج تھیوری کے صاف ستھرے ماڈلوں کا اصل دنیا کی نامکمل اور ناقابل اعتماد معلومات پر اطلاق کرنا ہے۔ جب فیصلے کرنے ہوتے ہیں تو یہ ممکن نہیں ہوتا کہ تجزیات سے نکل کر سفارشات پر پہنچ جائیں صرف اس وجہ سے کہ ڈیٹا درست نہیں ہے۔
دوران جنگ اندھیرے میں ہیلی کاپٹر اڑاتے ہوئے پائلٹ ''Dead Reckoning'' کرتے ہیں، جب کسی کا بہترین فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ ایک خاص وقت تک ایک خاص رخ پر ایک خاص راستے سے جانے سے اپنی منزل مقصود یا اس کے قریب تر پہنچا جا سکتا ہے۔ ہیلی کاپٹر نہ اڑانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۹۷۱ء کی باہم متصادم یادوں سے حقیقت تلاش کرنا ایک ایسا ہی سفر تھا۔ حد نظر بہت ہی کم تھی جب کہ خطرناک موڑ بہت سے تھے جس میں غلطی کے امکانات موجود تھے۔ البتہ، کشادہ ذہن سے تحقیق اور ایماندارانہ تجزیہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے سے انشاء اللہ اپنی منزل مقصود کے قریب پہنچنا ممکن ہوا۔
میں ان سب کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں میری مدد کی، لیکن اس کے متن کی ذمہ دار صرف میں ہوں وہ نہیں۔

تعارف

تصادم کی یادیں

''لیکن کیا کوئی ایسا شخص ہے جو حقیقتاً اچھاہو؟ ہو سکتاہے کہ نیکی صرف ایمان پر استوار ہوتی ہو۔انسان بری چیزوں کو بھول جاتاہے اور اچھی چیزوں پر یقین رکھتاہے۔کیونکہ یہ عمل نسبتاً آسان ہوتاہے۔''

ـــ اکیرا کوروساوا کے راشومون کا ایک دیہاتی

یہ ۱۹۷۱ء کی ایک شام کا ذکر ہے جب کلکتہ شہر میں، میں اپنی والدہ کے ساتھ اپنے گھرون ووڈبرن پارک سے نیتاجی بھون کی طرف جارہی تھی۔نیتاجی بھون ایلگن روڈ پر واقع ہمارا آبائی گھر تھاجسے اَب ایک عجائب گھر اور ادارے کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا۔ہمارے پڑوس میں واقع مشرقی پاکستان میں ہونے والے پُرتشدد واقعات کے بعد بڑی تعداد میں پناہ گزین ہجرت کرکے ہماری جانب (مغربی بنگال) آرہے تھے۔میرے والد صاحب ماہر امراض اطفال تھے۔انھوں نے سرحد کے قریب ایک امدادی کیمپ لگا رکھا تھا۔میرا بڑا بھائی بھی حالات وواقعات کا جائزہ لینے کے لیے وقتاً فوقتاً وہاں جایا کرتا تھا۔البتہ مجھے وہاں جانے کی اجازت ہرگز نہ تھی۔میری والدہ بھی دیگر خواتین کے ساتھ امدادی کارروائیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ایک بار مجھے بھی اپنی والدہ کے ساتھ ایک ایسی ہی جگہ جانے کا اتفاق ہوا۔ہم ایک مجمع کی جانب بڑھ رہے تھے جو نیتاجی بھون کی نچلی منزل میں جمع تھا۔

راستے میں آنے والے چند موڑ اور فٹ پاتھ پر پڑی ہماری گم شدہ پالتو بلی کی لاش کے علاوہ مجھے کوئی اور خاص یاد نہیں۔بالآخر ہم نیتاجی بھون پہنچے لیکن وہاں آنے والے مہاجرین کے بارے میں کوئی قابل ذکر بات میرے ذہن میں نہیں، ماسوائے بینا داس کے چہرے کے جو مجھے دیکھ رہی تھی اور نرم سی آواز میں گویا ہوئی کہ ''یہ تو دکھوں کی شروعات ہے''

بیناداس اس بنگال کی ایک انقلابی شخصیت تھی۔ جوانی کے دور میں اس نے کلکتہ یونیورسٹی کے کنونشن کے دوران بنگال کے برطانوی گورنر پر گولی چلائی تھی اور پھر کافی عرصہ تک منظر عام سے غائب رہی۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جیلوں کی نذر ہو چکا تھا۔ قتل و غارت گری اور انقلابی تاریخ کے صفحات سے نکل کر ایک بار پھر کلکتہ کی گلیوں میں ظاہر ہو گئے تھے۔ ان نئے انقلابیوں کو نکسل باڑی (Naxalites) کہا جاتا تھا اور ہندوستان کی علاقائی سیاست سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

ان دنوں اگر ہم علی الصبح گھر سے باہر نکلتے تو کار کی کھڑکی سے کسی نہ کسی کی لاش سڑک پر پڑی ضرور دکھائی دیتی تھی یا گزشتہ رات کسی کارروائی کے نتیجے میں سڑک پر کوئی ایسا ملبہ ضرور دکھائی دیتا تھا جسے اب تک کسی نے راستے سے ہٹایا نہ ہو۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن اپنے طفلانہ اضطراب کے باعث میں گردن اونچی کر کے مجمع میں گھری ایک لاش کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میری والدہ بار بار مجھے اس حرکت سے منع کر رہی تھیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میدان سے گزرتے ہوئے ہم نے اپنے آگے چلنے والی ایک ایمبیسیڈر کار سے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنی دھماکے کے بعد اس گاڑی میں سے ایک انسانی جسم کو باہر پھینکا گیا جو بائیں جانب درخت کے ایک تنے سے جا ٹکرایا۔ ہماری گاڑی میں بیٹھے ہر فرد کا یہی خیال تھا کہ اس شخص کو ایمبیسیڈر کار کے پچھلے حصے سے باہر پھینکا گیا ہے۔ وہ گاڑی سڑک پر رواں دواں رہی اور ہماری گاڑی بھی چلتی رہی۔ جب میں نے ۱۹۷۱ء کے تنازع کے بارے میں تحقیق شروع کی تو میں نے کلکتہ میں اپنے کئی دوستوں سے مشرقی پاکستان میں ہلاک ہونے والوں کے بارے میں دریافت کرنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک ساتھی جو اس وقت کالج کا طالب علم تھا، کے جواب نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس کے مطابق ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والے واقعات دراصل اس طرح رونما نہیں ہوئے تھے جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔ مغربی بنگال میں لوگوں کو قتل کیا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ حکومتی ایماء پر ہو رہا تھا۔

اگر ایک جانب نکسل باڑیوں کی وجہ سے میں ہندوستان کی علاقائی سیاست سے متعارف ہوئی تھی تو دوسری جانب بنگلہ دیش میں لڑی جانے والی ۱۹۷۱ء کی جنگ سے مجھے بین الاقوامی سیاست سے آشنائی ملی۔ ون ووڈبرن پارک کے دروازے سے باہر کی دُنیا بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ کلکتہ میں بڑے بوڑھے اکثر یہ بحث کرتے دکھائی دیا کرتے تھے کہ انگریز کی غلامی سے نجات ملے ابھی دو دہائیاں ہی گزری ہیں کہ سرحد پار ہمارے بنگالی بھائیوں کو ایک مرتبہ پھر آزادی کی جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔ لیکن اس مرتبہ نہ جانے کیوں ان کے اپنے مغربی پاکستانی بھائی ان کی جانیں لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ دراصل تمام جرنیل مغربی پاکستان سے آتے تھے اور جنرل یحییٰ کے ہاتھوں میں

اختیارات کی باگ تھی۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ جنرل ٹکا خان ایک خونی جرنیل کے نام سے جانے جاتے تھے اور مشرقی پاکستان میں انچارج تھے۔ امریکی صدر نکسن پاکستان کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ جبکہ دوسری جانب ہندوستان کو سوویت یونین کی حمایت حاصل تھی۔ دشمنوں میں گھرے بنگالیوں کی امداد کرنے کے لیے وزیر اعظم اندرا گاندھی عالمی سطح پر تنہائی کا شکار نظر آ رہی تھیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے قیام سے ہمارے بچپن میں ہمیں کوئی خاطر خواہ تبدیلی محسوس نہ ہوئی، حالانکہ میرے ننھیال کا تعلق بھی وہیں سے تھا۔ میرے نانا نانی مشرقی بنگال کی زبان ہی بولتے تھے گوکہ انھیں کلکتہ آئے کافی وقت بیت چکا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کلکتہ پر بنگالی قوم پرستی کے جذبات سایہ فگن تھے۔ ہمارے پاس مشرقی پاکستان کے شعلہ بیان مقرر شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریر کا ریکارڈ موجود تھا۔ یہ ریکارڈ میں نے اتنی بار سنا تھا کہ شیخ مجیب کی پوری تقریر مجھے زبانی یاد ہو چکی تھی اور اس کے کچھ حصے تو اب بھی میرے ذہن میں موجود ہیں۔ یہ شیخ مجیب کی تقاریر ہی تھیں جن سے میں نے ''انشاء اللہ'' جیسے الفاظ کا استعمال سیکھا تھا۔ وہ یوں گرجا کرتے تھے ''ہم نے خون دیا ہے۔ ہم اور خون دینے کے لیے بھی تیار ہیں۔ میں اس سرزمین کے لوگوں کو آزادی دلوا کر رہوں گا۔ انشاء اللہ''[۲] جب میرے والد صاحب بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد پہلی مرتبہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے پہنچے تو انھوں نے میرے والد صاحب کا پرتپاک استقبال کیا اور جیسا کہ نو وارد وزیر اعظم صاحب کے لیے مشہور تھا میرے والد صاحب کو زور سے گلے لگایا اور اس موقع پر فرط جذبات سے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

پناہ گزینوں کی داستانیں دل دہلا دینے والی تھیں، اور ان کے مصائب واقعتاً قابل رحم تھے۔ کئی اہم شخصیات ان سے ملنے آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک امریکی سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی بھی تھے۔ غموں کے مارے انسانوں کے سمندر میں سینیٹر کا چمکتا دمکتا چہرہ اور نفیس لباس انھیں سب سے ممتاز کر رہا تھا۔ جارج ہیریسن بنگالی میں گا رہے تھے ''او خدایا آپ ہمیں تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے''۔ ایک بنگالی گلوکار کچھ اس انداز سے گا رہا تھا ''سنو ایک مجیب کی آواز میں لاکھوں مجیب کی آوازیں ہواؤں اور آسمانوں میں گونجتی ہوئی۔ بنگلہ دیش، ہمارا بنگلہ دیش۔''

بالآخر پاکستان اور بھارت کے مابین باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ چند سال پہلے بھی، جب میں بہت چھوٹی تھی بھارت اور پاکستان کے مابین ایک جنگ ہو چکی تھی۔ اس جنگ میں مشرقی پاکستان کے لوگ بھی بھارتیوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔[۳] اس جنگ کے بارے میں مجھے بس اتنا ہی یاد ہے کہ میں اپنے گھر وڈبرن پارک کے ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور

رات کے وقت جونہی سائرن بجنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو بالائی منزل پر مقیم میرے کزن اور چچا/ ماموں وغیرہ ہمارے پاس نچلی منزل پر آ گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ مجھ پر خوف طاری ہو جایا کرتا تھا اور میں اس بات کو سمجھ نہیں پائی تھی کہ آخر کیوں کوئی شخص ہمارے سروں پر بموں کی بارش کرنا چاہتا ہے۔ جنگ سے متعلق ایک اور بات جواب تک مجھے یاد ہے وہ یہ کہ میرے والد صاحب نے سفید کپڑے کے ایک تھان کو سیدھی پٹیوں کی شکل میں کاٹ لیا تھا اور انھیں کچھ اس انداز سے ہمارے گھر کی تمام کھڑکیوں کے شیشوں پر چسپاں کر دیا تھا کہ 'X' کی شکل بن گئی تھی۔ اس سارے عمل میں کافی وقت صرف ہوا تھا بالخصوص صحن کی جانب والی فرینچ ونڈوز پر جس کی تینوں کھڑکیاں صرف ڈرائنگ روم سے کھلتی تھیں۔ اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کے بالائی نصف حصے پر سیاہ رنگ سے پینٹ کر دیا گیا تھا۔

بہرکیف یہ جنگ زیادہ طویل نہ تھی۔ بھارت فتح مند ہوا اور بنگلہ دیش کو آزادی نصیب ہوئی۔ ہر سو جشن کا سماں تھا۔ بھارتی فوج کی کمان سام منیکشا کے ہاتھوں میں تھی جس کی چال ڈھال سے فخریہ جذبات نمایاں تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت اس وقت کے مشرقی کمانڈ کے کمانڈر جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کو حاصل تھی جو کہ جنرل اے اے کے نیازی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک نئی تاریخ رقم ہونے جا رہی تھی جنرل نیازی نے پاکستان کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی دستاویزات پر اپنے دستخط ثبت کیے۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو کہ نو ماہ سے مغربی پاکستان میں قیدی کی حیثیت سے موجود تھے اب ہیرو بن کر ڈھاکہ لوٹے تھے۔

بیس سال بعد میں بش ہاؤس لندن میں بی بی سی کے لیے ایک ریڈیو انٹرویو ریکارڈ کر رہی تھی جہاں میرے ذمے جنوبی ایشیا سے متعلق ایک پروگرام کی میزبانی کے فرائض تھے۔ مجھے دہلی میں بیٹھے جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کا انٹرویو کرنا تھا۔ جس دوران ساؤنڈ سسٹم صحیح کیا جا رہا تھا میں نے جنرل اروڑہ سے گفتگو کا آغاز کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں کلکتہ سے تعلق رکھتی ہوں اور انھیں جنگی ہیرو کے طور پر جانتی ہوں۔ ''شکریہ، عزیزہ'' کھڑکھڑاتی ہوئی لائن پر دوسری جانب سے ایک پر شفقت آواز آئی۔ گو کہ انٹرویو کا موضوع پنجاب میں سکھوں کے خلاف انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور TADA جیسے ظالمانہ قانون کے متعلق تھا۔ میں اس معاملے میں ذاتی ہمدردی رکھتی تھی۔ اس لیے انٹرویو خوشگوار ماحول میں جاری رہا۔ لیکن جنرل اروڑا زیادہ تر بے چین رہے۔ بعدازاں میرے علم میں یہ بات آئی کہ مذکورہ انٹرویو کو ہندوستانی زبان میں نہیں چلایا گیا اور جنرل اروڑہ اس انٹرویو کے نتیجے میں کافی پریشان رہے۔ موصوف جنرل جنگ ۱۹۷۱ء کے وہ ہیرو تھے جنھیں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر اسی سرزمین پر

شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں تضاد کے بارے میں کچھ نہ کچھ تحریر کرنا چاہتی تھی۔[۵]

اس چنگاری کو الاؤ بننے میں ایک دہائی کا عرصہ لگا اور اب میرے سامنے جنگ ۱۹۷۱ء کے تحقیقی پروجیکٹ کا کام تھا۔ اسی دوران میرے علم میں یہ بات آئی کہ خود جنرل اروڑہ کے بہت سے ساتھی انھیں جنگ ۱۹۷۱ء کا ہیرو ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان میں سے ایک لکھتے ہیں ''ان کی کمانڈ نے انھیں کبھی سنجیدگی سے ایک جنگجو سمجھا ہی نہیں تھا کیونکہ ان میں اپنے جوانوں میں مقبول ہونے کی کوئی صلاحیت پائی ہی نہیں جاتی تھی''۔[۶] ان کے ایک اور ساتھی حقارت کے ساتھ رقم طراز ہیں ''انھیں بطور کمانڈر آرمی میں کوئی خاص مقام حاصل نہ تھا'' اور یہ کہ ''وہ آرمی میں اپنے کئی فیلڈ کمانڈروں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہوگئے تھے''۔[۷] ان کے ایک ساتھی نے تو ان کی اہلیہ تک کو سخت تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔[۸] جنرل اروڑہ نے اپنی سوانح عمری نہیں لکھی۔ جس وقت میری ان سے بالمشافہ ملاقات ہوئی تو ان سے جنگ ۱۹۷۱ء کی تفصیلات پر بحث کرنا ممکن نہ تھا۔[۹]

اگر ایک فاتح کمانڈر کا مقدر یہ تھا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ شکست خوردہ کمانڈر کا کیا حال ہوا ہوگا۔ نتیجتاً مجھ پر انکشاف ہوا کہ جنرل نیازی ایک شاندار ماضی کے مالک تھے لیکن اب وہ ایک المیہ سے دو چار تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران برما کے محاذ پر بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے پر برطانوی حکومت نے انھیں ملٹری کراس سے نوازا تھا، اور جنھوں نے ایک گمنام ماضی سے ایک شاندار مستقبل تک حالات سے بے جگری سے لڑائی کی تھی۔ اپنی کتاب میں اور مجھ سے گفتگو کے دوران انھوں نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں جنرل ٹکا خان کی جانب سے کروائے جانے والے ملٹری آپریشن کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے سابق گورنر، جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کو بھی بحران کے آخری لمحات میں راہِ فرار اختیار کرنے پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔[۱۰] جنرل نیازی کی اپریل ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان آمد کے چند مہینوں بعد ہی بنگالیوں کی بغاوت پر قابو پا لیا گیا تھا۔ لیکن سیاسی تصفیہ کے مکمل فقدان کی وجہ سے ان کے جوان بھارتی امداد سے لڑنے والے گوریلوں کے خلاف مہینوں سے جاری ایک تھکا دینے والی جنگ سے اکتا چکے تھے اور پھر بھارت نے تمام اطراف سے ان پر حملہ کر دیا تھا، بھارتی افواج کو مقامی افراد کی مکمل حمایت حاصل تھی جو پاکستانی فوج سے متنفر تھے۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی پاکستانی فوج نے بھارتی افواج کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی وجہ سے جنرل نیازی کو اپنے وطن میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۷۱ء کا زیادہ تر ادب پاک — بھارت تنازع پر مشتمل ہے۔ ایک ایسی جنگ جو سرد جنگ

سے گرم جنگ میں تبدیل ہوئی تھی اور جس سرزمین پر یہ جنگ لڑی گئی وہاں کے باسیوں کو آخری حد تک دیوار سے لگا دیا گیا تھا۔ بھارت میں لکھی جانے والی کہانیاں فتح کے نشے سے بھرپور دکھائی دیتی ہیں جن میں چند ایسے افسران کی سوانح عمریاں بھی شامل ہیں جنھیں غالباً خودنمائی مقصود تھی یا دوسروں کی توہین۔ بہت سے کلیدی افراد نے اپنی یادداشتیں شائع ہی نہیں کروائیں۔ جہاں تک ۱۹۷۱ء کے واقعات کے بارے میں پاکستانی ادب کا تعلق ہے تو یہاں بھارت کے سامنے شکست یافتہ ہونے کے غم نے سخت تنقید کو جنم دیا جبکہ ان حلقوں کی جانب سے چپ سادھ لی گئی جو کہ واقعتاً مشرقی پاکستان میں خدمات سرانجام دے کر آئے تھے اور جو واقعات کے عینی شاہد تھے۔ بنگالی ڈراموں میں پاکستانیوں کو ولن اور بنگالیوں کو مظلومیت کی تصویر دکھایا جاتا رہا اور اس ڈرامائی تشکیل میں حقائق کو بڑی حد تک مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ تمام اطراف سے آنے والا مواد حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ بنگالیوں کو یہ شکوہ تھا کہ ان کی حالت زار پر عالمی برادری نے ذرا توجہ نہ دی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تین دہائیاں گزر جانے کے بعد بنگالی خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے تحقیقی ثبوت پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں جن کی مدد سے عالمی رائے عامہ کو ان کے حق میں ہموار کرنے میں کوئی مدد مل سکتی۔ ۱۹۷۱ء کے تنازع کے کئی پہلوؤں پر سنجیدگی سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

جنگ ۱۹۷۱ء پر صرف ایک ہی کتاب ایسی ملتی ہے جس میں تحقیق، تجزیہ اور معروضیت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب امریکی اسکالروں رچرڈ سیزن (Richard Sisson) اور لیو روز (Leo Rose) نے *War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh* (1991) کے نام سے تحریر کی ہے۔ سیزن اور روز نے یہ تحقیق ۱۹۷۱ء کی دہائی میں کی تھی اور اس ضمن میں انھوں نے پاکستان، بھارت، امریکہ اور بنگلہ دیش میں موجود کلیدی افراد کے انٹرویو بھی کیے۔ ان میں سے کئی سینئر افراد اس دارِفانی سے کوچ کر چکے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی کتاب اور بھی منفرد ہوگئی ہے۔ سیزن اور روز کے مطالعہ سے مجھ میں یہ تجسس بیدار ہوا کہ ۱۹۷۱ء کے حقائق معلوم کیے جائیں کیونکہ جس انداز سے انھوں نے جنگی حالات و واقعات کو قلم بند کیا تھا وہ ان کہانیوں سے یکسر مختلف تھے جو میں نے اپنے بچپن میں کلکتہ میں سنی تھیں، اور جن پر جنوبی ایشیا اور ان سے باہر کی دنیا میں یقین کیا جاتا تھا۔

سیزن اور روز کی کتاب میں ۱۹۷۱ء کے سفارتی اور پالیسی امور اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ میری تحقیق تصویر کا دوسرا رخ پیش کرتی ہے کہ کس طرح سے زمینی سطح پر لوگ جنگ میں

مشغول تھے۔ میں نے اپنی کتاب میں پاک۔ بھارت جنگ کے بجائے مشرقی پاکستان میں ہونے والی خانہ جنگی پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو بنگلہ دیش کی آزادی چاہتے تھے اور وہ جو پاکستان کو متحد رکھنا چاہتے تھے۔ گو کہ حریت پسندوں کے لیے بھارت کی جانب سے غیر معمولی مداخلت نے اس تفریق کو کسی حد تک معدوم کر دیا تھا۔ زیر نظر مطالعے میں چند چنیدہ واقعات کا جامع اور مکمل طور پر معلومات کے مختلف مآخذ استعمال کرتے ہوئے جائزہ لیا گیا ہے اور اس ضمن میں اصل حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے تمام پارٹیوں کے مؤقف کو بھی سامنے رکھا گیا ہے تاکہ ممکنہ حد تک مکمل تصویر پیش کی جا سکے۔ اس کا مقصد زمینی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاق و سباق اور انسانی جذبۂ خدمت کے حوالے سے مخصوص جنگی واقعات کا تفصیلی تجزیہ کر کے تنازع کی ایک کامل تصویر پیش کرنا ہے۔

ایسے کام کی کوئی نظیر نہ ہونے کی صورت میں مجھے اپنی حیثیت منفرد معلوم ہوتی تھی۔ ایک بنگلہ دیشی ہونے کے ناطے میرے لیے آسان تھا کہ بنگلہ دیش جاؤں، عینی شاہدین سے ملوں، جائے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور بنگالی زبان میں لکھے گئے مواد کا مطالعہ کروں۔ پاکستان میں چند دوستوں اور ساتھیوں کی مدد سے ۔ کافی تگ و دو کے بعد ۔ ان لوگوں تک رسائی حاصل ہوگئی جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں شریک تھے جن لوگوں تک اب تک کوئی نہیں پہنچ سکا تھا اور جن کی نظروں اور یادوں میں جنگ ۱۹۷۱ء کے واقعات محفوظ تھے۔ ان میں اکثریت پاک فوج کے افسران کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا مؤقف آج تک سامنے آ ہی نہیں سکا تھا۔ زیر نظر کتاب میں پہلی بار زمینی سطح پر جنگ کے تمام فریقین کے تجربات کو ہر لحاظ سے اکٹھا کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان کا موازنہ دیگر سمعی و بصری مواد سے کر کے جنگ ۱۹۷۱ء کے بارے میں ایک ایسی تاریخ محفوظ کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ اس پر جانبدار ہونے کے ضمن میں کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جو کہ جنگ ۱۹۷۱ء کے موضوع پر منظم طریقے سے، جذبات سے عاری ہو کر اور شواہد کی بنیاد پر مرتب کی جا رہی ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ دیگر اسکالرز کی جانب سے اس کام کو مزید آگے بڑھایا جائے گا۔ اپنی اہلیت اور طریق کار کے لحاظ سے میری کتاب سیزن اور روز کے کام کے بعد ایک منفرد حیثیت کی حامل ہوگی۔ کیونکہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے عینی شاہدین جن سے میں نے انٹرویو کیے ان میں سے بیشتر ضعیف ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دار فانی سے کوچ کرتے جائیں گے۔

اس کتاب میں شامل کیس اسٹڈیز کا تعلق مختلف اضلاع اور جنگ کے مختلف ادوار سے ہے، اس میں جنگجوؤں اور ظلم و ستم کا نشانہ بننے والوں کے مختلف گروپ شامل ہیں۔ اس لیے جامع نہ

ہونے کے باوجود بھی یہ خصوصی مطالعے اصل جنگی حالات کے آئینہ دار کہے جاسکتے ہیں۔اس مقصد کے لیے قومی سطح پر کسی پروجیکٹ کے تحت ہی کوئی کام ممکن ہوسکتا ہے جس کی نظیر اب تک تو سامنے نہیں آئی ہے۔بنگلہ دیشی سرکاری وغیر سرکاری اداروں نے اس سلسلے میں جو بھی کام کیا ہے اس میں حقائق تک پہنچنے کی بجائے من پسند واقعات کا انتخاب کیا گیا ہے جس سے ان میں جانبداری کا پہلو واضح ہے۔

جنگ کے بارے میں جن اہم واقعات کو زیرنظر تحریر میں موضوع بنایا گیا ہے ان کا انتخاب ان گنت بنگالیوں سے بحث مباحثے کے بعد کیا گیا جو کہ جنگ میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ان میں سے اکثریت آزادی کے حامیوں کی تھی۔وگرنہ دیگر افراد کے بارے میں ہر لحاظ سے وضاحت کر دی گئی ہے۔اس کتاب میں جنوری ۱۹۷۱ء، یعنی دسمبر ۱۹۷۰ء کے تاریخی انتخابات کے فوراً بعد، سے مارچ ۱۹۷۲ء، یعنی بنگلہ دیش کی آزادی کے تین ماہ بعد تک کے اہم واقعات کو شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ واقعات نے مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں میں جنم لیا تھا، ان میں جیسور، کھلنہ، چٹاگانگ، ڈھاکہ، نرسنگدی، میمن سنگھ، ٹنگیل، راج شاہی، سید پور، ٹھاکرگاؤں کے علاقے شامل ہیں۔ہمیں واقعات کے بارے میں شواہد ملتے ہیں کہ ڈھاکہ شہروں اور دیہاتوں سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک ان کا پھیلاؤ تھا جہاں تین اطراف سے بھارت نے بنگلہ دیش/مشرقی پاکستان کی سرحد کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

کتاب ہذا کے لیے بنگلہ دیش اور پاکستان سے معلومات ۲۰۰۶-۲۰۰۳ء کے دوران اکٹھی کی گئی ہیں اس سلسلے میں مختلف طریقہ ہائے کار کو اپنایا گیا جیسے جائے واقعات کے دورے، زندہ بچ جانے والوں کے انٹرویوز کرنا جن میں عینی شاہدین اور جنگ میں حصہ لینے والے افراد شامل ہیں وغیرہ وغیرہ۔نیز اس سلسلے میں انگریزی اور بنگالی زبانوں میں شائع شدہ مواد، یادداشتوں، تصاویر، فلموں اور غیر ملکی میڈیا رپورٹوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔اس عرصہ کے دوران میرا کئی مرتبہ بنگلہ دیش اور پاکستان جانا ہوا ہے۔کچھ تحقیق برطانیہ اور امریکہ میں بھی کی گئی ہے۔

جہاں تک محل وقوع سے متعلق کام کا تعلق ہے ابتدأ میرا زیادہ تر وقت بنگلہ دیش میں گزرا۔بنگلہ دیش میں ایک حلقہ ایسا بھی ہے جہاں کے لوگ آزادی سے خاص قلبی لگاؤ رکھتے ہیں اور اس دوران پیش آنے والے تمام واقعات کو محفوظ کرنے میں پرعزم دکھائی دیتے ہیں۔ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو مجھ سے اس بارے میں بات کرتے یا مجھے متعلقہ لوگوں تک پہنچا دیتے یا پڑھنے کے لیے مجھے مواد فراہم کر دیتے۔جب بھی میں نے کسی خاص مقام پر جانا چاہا تو مجھے اس جگہ پہنچانے میں

بھی ان لوگوں نے گہری دلچسپی ظاہر کی۔ یہ بات ان کے لیے انتہائی مسرت کا باعث تھی کہ میں ان کے ملک کی کہانی میں دلچسپی لے رہی تھی۔ میں ان لوگوں کی مہمان نوازی اور اس وقت کے لیے جو انھوں نے اپنی دکھ بھری داستانیں مجھے سنانے میں صرف کیا، ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بعض لوگ عجیب وغریب انداز سے بات کرتے تھے تو بعض لوگ بات کرتے کرتے آہیں بھرنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عورت چک نگر میں اپنے بیٹے اور شوہر کے اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کے بارے میں بات کرتے کرتے سسکیاں بھرنے لگی تو دیگر لوگوں کو آگے بڑھ کر اسے تسلیاں دینا پڑیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود میرے مدنظر یہ بات بھی تھی کہ مجھے خود کو جذبات کی رو میں بہنے سے روکنا ہے اور میری اوّلین ترجیح یہ تھی کہ حالات وواقعات کا غیر جانبداری سے جائزہ لوں۔ ایک مرتبہ مجھے شیاملی نسرین چودھری سے اس بات پر معذرت بھی کرنا پڑی کہ میں نے ان کے شوہر کے قتل کے بارے میں ان سے ایک وضاحتی سوال پوچھا تھا۔ ان کے شوہر کے قتل کا تعلق دسمبر 1971ء کے اس قتل عام سے بتایا گیا جس میں بنگالی قوم پرست زعماء اور دانشور نشانہ بنے تھے۔ انھوں نے جواباً کہا کہ انھیں ذرا بھی برا نہیں لگا اور یہ کہ انصاف کی خاطر انھیں جتنی مرتبہ سوالوں کے جوابات دینا پڑیں وہ اس سے گریز نہیں کریں گی۔

عجیب بات یہ ہے کہ میری مدد کے لیے لوگوں کا جو سیلاب امڈ آیا تھا وہ میرے لیے معاون ہونے کے بجائے مشکل کا باعث بن رہا تھا۔ مجھے لوگوں کے جم غفیر میں سے بمشکل ان لوگوں کا انتخاب کرنا پڑتا تھا جنھوں نے واقعتاً حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ کام اس وقت اس لیے بھی مزید مشکل تھا کہ ہر کوئی کہانی کو بیان کرنے کا خواہاں تھا چاہے وہ عینی شاہد ہو یا نہ ہو۔ مجھے بہت سے مبہم اور غیر اہم مواد میں سے چند متعلقہ باتوں کا انتخاب کرنا پڑتا تھا۔ بہت سے بنگالی دانشور جن سے میری ملاقات ہوئی حالات وواقعات کے بارے میں وضاحتی سوالات کے جوابات دینے سے گریزاں نظر آئے۔ کئی افراد تو ایسے تھے کہ ان کے پاس اپنے مخالفین کے لیے نفرت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات پڑھے لکھے افراد بھی حقائق اور افواہوں میں تمیز نہیں کر پاتے تھے۔ واقعات اور شخصیات کے بارے میں پوچھے گئے سیدھے سادے سوالات کے جوابات میں کبھی کبھی ایسی ایسی باتیں بتائی جاتی تھیں کہ ان کا اس سوال کے جواب سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہ بنتا تھا۔ لیکن عموماً یوں محسوس ہوتا تھا کہ جو لوگ اُن حالات سے گزرے تھے ان کی باتوں میں قدرے وزن بھی ہوتا تھا اور وہ قابل اعتبار بھی تھے۔ ان کے تجربات دل دہلا دینے والے ہوتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو خود نمائی کے خواہاں تھے اور بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد اب

اس ضمن میں کیے گئے ہر اقدام کو جائز قرار دینا چاہتے تھے۔ سب سے زیادہ مسئلہ ان لوگوں کے ساتھ بات کرنے میں پیش آیا جو کہ نہ تو عینی شاہدین تھے اور نہ متاثرین لیکن حقائق گھڑنے سے چنداں گریزاں نہ تھے۔ اس قسم کے لوگوں سے پاکستان میں بھی واسطہ پڑتا رہا۔

جلد ہی ایک اور مسئلہ بنگلہ دیش میں میرے سامنے آیا کہ میری مدد کرنے والے لوگوں کی اکثریت آزادی کے حق میں تھی اور ان لوگوں کے تعلقات اتحاد کے حامیوں سے انتہائی کشیدہ تھے۔ یہاں تک کہ آزادی کے حامی کیمپ میں سے بھی مختلف سول اور فوجی افراد اپنے سیاسی اختلافات کے ساتھ اب تک ۱۹۷۱ء کے تناؤ کا شکار دکھائی دیتے تھے۔ بعض لوگوں کو تو یہ بات بھی ہضم نہ ہوتی تھی کہ میں شفاف انداز میں حقائق تک پہنچنے کے لیے تمام فریقین سے گفتگو کروں۔ جب میں اپنے منصوبے کی مکمل وضاحت کے لیے اس بات کا انکشاف کرتی کہ زمینی حقائق جاننے کی غرض سے میں اس وقت بنگلہ دیش میں موجود پاکستانی فوجی افسران سے بھی ملاقاتیں کروں گی تو بہت سے بنگالی دانشور اس پر نفرت کا اظہار کرتے۔

جب میں نے ان لوگوں سے بات کرنا چاہی جو متحدہ پاکستان کے حق میں تھے یا با الفاظ دیگر بنگالی قوم پرستوں کے زیر عتاب تھے تو مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب میں نے پاکستانی حکومت کی جانب سے غیر بنگالیوں کے مبینہ طور پر بنگالیوں کے ظلم وستم کا نشانہ بننے سے متعلق تحقیقاتی رپورٹ کا ذکر کیا تو ڈھاکہ میں ایک بنگالی نے مجھ سے کہا کہ ''آپ قرطاس ابیض کی بات کیوں کرتی ہیں؟ یہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔'' جبکہ کھلنہ کے مقام پر بنگالیوں نے کھلم کھلا غیر بنگالیوں ''بہاریوں'' کے قتل عام کی روداد یں سنائیں۔[۱۲] جب میں نے میمن سنگھ کینٹ ایریا میں ہونے والے مبینہ قتل عام کے بارے میں استفسار کیا تو لبریشن وار میوزیم کے ڈائریکٹر نے ایسے کسی کینٹ ایریا کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب میں اس علاقے کے دورے پر گئی تو وہاں کے لوگوں نے انکشاف کیا کہ میمن سنگھ میں واقع ایسٹ پاکستان رائفلز کے سینٹر میں جسے مقامی طور پر ''کینٹ'' کہا جاتا تھا، بڑے پیمانے پر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا قتل عام کیا گیا تھا جیسا کہ قرطاس ابیض میں درج تھا۔ جبکہ دوسری جانب بنگلہ دیشی دانشوروں نے شائع ہونے والی غیر مصدقہ کہانیوں کو بھی من وعن قبول کر لیا تھا۔

بنگلہ دیش میں تو مسئلہ یہ تھا کہ بے شمار معلومات میں سے کس طرح متعلقہ اور مستند معلومات کو کشید کیا جائے لیکن دوسری جانب پاکستان میں ایسا کوئی شخص بات کرنے کو تیار ہی نہ تھا جو اس وقت مشرقی پاکستان میں موجود رہا ہو۔ مجھے ان پاکستانی فوجی افسران سے بات چیت کرنا تھی جو ۱۹۷۱ء

کی جنگ کے وقت مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ بالخصوص ان افسران سے جو کہ واقعات کے عینی شاہدین میں سے تھے۔ گو کہ گفتگو کا آغاز اس وقت کی ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر جنرل نیازی سے ہوا میری خواہش تھی کے میں ابتدا ان کے ماتحت افسران سے کرتی، کیونکہ اصلاً وہی لوگ تھے جو عملی طور پر میدان جنگ میں، مارشل لاء ڈیوٹی، بغاوت کو کچلنے اور جنگ لڑنے میں مصروف تھے۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے محض چند افسران کی موجودگی نے انھیں شدید مشکلات میں ڈال دیا تھا۔ کئی نوجوان افسران کو اپنے علاقوں میں ایسے فیصلے کرنے کے اختیارات دے دیئے گئے تھے جو وہ حالت امن حتیٰ کہ روایتی جنگی حالات میں بھی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے مجھے گفتگو کرنی تھی۔

میرا لسانی، مذہبی اور قومی پس منظر — اور صنف بھی، اسی بات کا متقاضی تھا کہ میں پاکستانی افسران سے یہ امید نہ کروں کہ وہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے تجربات مجھے دِل کھول کر بتائیں گے۔ میں اپنے تعلیمی پس منظر کے علاوہ ہر پہلو سے ان سے نہ صرف یکسر مختلف بلکہ متنازع بھی تھی۔ جنرل نیازی نے بھی ابتداً مجھ سے گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر بعد ازاں چند دوستوں کی مدد سے انھیں اور ان کی فیملی کو بات کرنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرے غیر جانبدار نقطہ نظر پر شدید حیرت کا اظہار کیا، البتہ ابتدائی استرداد بعد میں زبردست قبولیت میں تبدیل ہوگیا اور مجھے بنگالیوں جیسے جذبات یہاں بھی دیکھنے کو ملے۔

کئی دیگر افسران کے ساتھ بھی یہی صورتحال پیش آئی۔ کافی تگ ودو کے بعد بالآخر افسران سے فرداً فرداً انٹرویو کرنا میرے لیے ممکن ہو سکا۔ مجھے ان افسران تک رسائی حاصل کرنے میں پاکستانی اور امریکن دوستوں کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ چند افسران میری معروضیت اور غیر جانبداری سے بے حد متاثر ہوئے اور نتیجتاً مجھے اپنے دیگر ساتھی افسران تک رسائی دلوانے میں معاون ثابت ہوئے۔ بیشتر افسران جن کے انٹرویو میں نے کیے انھوں نے کم از کم اپنے ایک ساتھی سے ضرور متعارف کروایا، اور چند افسران تو ایسے بھی تھے جنھوں نے میری امیدوں سے بڑھ کر مجھ سے تعاون کیا۔ آخر کار تقریباً تین درجن کے لگ بھگ ایسے پاکستانی افسران مجھے انٹرویو کے لیے میسر ہوگئے جنھوں نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں ذمہ داریاں نبھائی تھیں۔ ان میں سے اکثر کا کہنا تھا کہ میں پہلی محقق ہوں جس نے ۱۹۷۱ء کے واقعات کی تحقیق کے لیے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان میں دو ایسے بنگالی افسران بھی شامل تھے جو آخری وقت تک پاک فوج کے ساتھ وفادار رہے۔ تقریباً تمام افسران ہی ریٹائر ہو چکے تھے اور تقریباً ہر افسر نے مجھے محض لائق اشاعت حقائق ہی سے آگاہ کرنے

کی کوشش کی ۔ چند ایک ایسے بھی تھے جنھوں نے نام شائع نہ کیے جانے کی شرط پر مجھ سے بات چیت پر رضا مندی ظاہر کی تھی ۔جب کہ کچھ ایسے افسران بھی ہیں جو آج بھی بات کرنے سے گریزاں ہیں۔

بنگلہ دیش کی مانند مجھے یہاں بھی خوش آمدید کہا گیا ۔ پاکستانیوں میں بھی مجھے ویسے ہی جذبات دیکھنے کو ملے جیسا کہ ان کا مقصد جائز تھا، دنیا نے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی اور یہ کہ بھائی کو بھائی سے لڑا کر ان کے ملک کو دولخت کر دیا گیا البتہ اس جانب ایک بات اضافی پائی جاتی تھی وہ یہ کہ مغربی پاکستان کی جانب سے مشرقی پاکستان کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے معترف پائے گئے ۔اس جانب اپنے ہی سیاسی رہنماؤں اور سب سے بڑے دشمن بھارت کے خلاف دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نفرت دیکھنے کو ملی ۔جبکہ بنگلہ دیش کے لوگوں کے برعکس پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں اپنے سابقہ ہم وطنوں کے لیے نفرت کے جذبات بڑی حد تک معدوم ہو چکے تھے۔

خواہ تحریر شدہ الفاظ ہوں یا زبانی انٹرویو ان سب کی بنیاد یادداشتوں پر ہی تھی، جنھیں مزید جانچنے کے لیے سمعی وبصری دستاویزی مواد کو بطور معاون استعمال کیا گیا ہے ۔کبھی کبھار ان دونوں ذرائع میں مطابقت پائی جاتی تو بعض اوقات ان کے مابین تضاد کی نہ پائی جانے والی خلیج حائل دکھائی دیتی ہے۔جبکہ بعض اوقات ان دونوں سے مختلف لیکن واقعات کو مختلف زاویوں سے جانچنے کے لیے بالکل صحیح نتائج اخذ کرنے میں مدد ملتی ہے ۔بلاشبہ ان لوگوں کی یادیں جو واقعات کے عینی شاہدین میں سے ہیں ان لوگوں کے ''نظریات'' سے زیادہ اہم ہیں جو اس وقت وہاں موجود نہ تھے لیکن اس کے باوجود ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یادداشتوں کی اپنی حدود ہوتی ہیں ۔اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد یادداشتیں بعینہ محفوظ نہیں رہ پاتیں۔اس کے علاوہ اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ عینی شاہد نے کوئی غلط معلومات فراہم نہیں کی ہوں گی یا کچھ چھپایا نہیں ہوگا۔ان تمام باتوں کے باوجود زمینی حقائق تک پہنچنے کے لیے ان یادداشتوں کی چنداں اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے ۔بعض اوقات شہادتوں کی جانچ قابل بھروسہ ذرائع سے ممکن ہو جاتی ہے تو بعض اوقات اپنی شہادتوں میں ابہام پائے جانے کے باوجود ان کو جھٹلانا ممکن نہیں ہوتا۔اس مسئلے کا ایک یہی قابل بھروسہ حل ہے کہ شواہد کے متعدد ماخذ استعمال کیے جائیں جیسا کہ اس تحقیق میں، میں نے کیا کچھ ایسی معلومات جو صرف ایک ذریعے سے ملی تھیں انھیں اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا۔ ۱۹۷۱ء لامحدود واقعات کا ذخیرہ ہے جن میں سے کئی ایک کو مستقبل میں جانچنے اور پرکھنے کی وسیع گنجائش موجود ہے۔

عوام الناس کی امیدوں کے برعکس غیر ملکیوں کی تحریریں اور پریس رپورٹیں یکساں طور پر قابل بھروسہ نہیں ہیں۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کی رپورٹوں پر جانبداری اور حالت جنگ کے دوران پروپیگنڈہ کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ غیر ملکی نمائندوں کی رپورٹوں کی باریک بینی سے جانچ پڑتال بھی از حد ضروری ہوتی ہے۔ ایسی رپورٹوں میں سے عینی شاہدین اور دیگر افراد کی قلم بند شہادتوں کو رپورٹ سے الگ کیا جانا ضروری ہے۔ انٹرویوز اور یادداشتوں کی مانند عینی شاہدین سے بھی غلط یا من گھڑت شواہد کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بہرکیف اس طرح کی رپورٹوں سے استفادہ کرنے میں کسی نہ کسی درجے میں اس قسم کے خطرات مول لینا ہی پڑتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی رپورٹ جزوی طور پر صحیح اور جزوی طور پر غلط ہو یعنی وہ جو رپورٹر نے خود دیکھا اور وہ جو اس نے اِدھر اُدھر سے سُنا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال ۱۳ جون ۱۹۷۱ء کو سنڈے ٹائمز میں اینتھونی میسکیر یناس (Anthony Mascarenhas) کی شائع ہونے والی رپورٹ ہے۔[۱۳] کومیلا سے اس کی رپورٹ بطور عینی شاہد کہ کس طرح ایک بنگالی، بالخصوص ہندو، محض ایک آرمی افسر کے اشارے پر جان سے جاسکتا تھا ایک سخت فوجی آپریشن کی غماز تھی۔ دوسری جانب ۲۶-۲۵ مارچ کو پرانا ڈھاکہ میں شنکر یپارہ کے مقام پر اس نے فوجی آپریشن کی بابت کسی ذرائع کے حوالے دیے بغیر رپورٹ شائع کر دی۔ نہ تو وہ خود شنکر یپارہ کے مقام پر موجود تھا اور نہ اسے کسی حصہ قد ذرائع سے خبر ملی تھی۔ بعدازاں شنکر یپارہ میں جب میں نے ان لوگوں سے انٹرویو کیے جو اب تک زندہ ہیں اور واقعات کے عینی شاہدین ہیں تو میری تحقیق کی روشنی میں وہ رپورٹ سراسر غلط نکلی۔

حتیٰ کہ جائز رپورٹوں کو بھی مخالفین نے بڑے ہی بھونڈے انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جانب اگر اینتھونی میسکیر یناس نے فوجی آپریشن کی مذمت کی ہے تو اسی رپورٹ میں اس نے بنگالیوں کے ہاتھوں غیر بنگالیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ ان میں فوج کی طرف سے مبینہ طور پر مارے جانے والوں کے اعداد و شمار بھی شامل ہیں۔ میسکیر یناس کی رپورٹ عوام کی سوچ سے کہیں زیادہ درست اور غیر جانبدارانہ ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور مثال بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے ۱۹۷۱ء کے واقعات پر مبنی سرکاری دستاویز (جلد نمبر ۱۴) کی تیاری ہے۔ اس دستاویز میں نکولس ٹومالن کی ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو سنڈے ٹائمز میں شائع ہونے والی رپورٹ کو محض اس لیے شامل کیا گیا کہ وہ رپورٹ قوم پرست بنگالیوں کے حق میں تھی۔ جبکہ دوسری جانب نکولس ہی کی ۲ اور ۴ اپریل کی رپورٹوں کو اس لیے دستاویز کا حصہ نہ بنایا گیا کہ اس

میں بنگالیوں کے ہاتھوں جیسور میں غیر بنگالیوں کے قتل عام کے عینی شواہد پیش کیے گئے تھے۔[۱۴] اسی قسم کی کئی دیگر مثالیں بھی ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے واقعات سے متعلق حقائق کو بری طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔

گو کہ میں نے اپنی تحقیق کے ضمن میں غیر جانبداری نبھانے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ ۱۹۷۱ء کے جن واقعات کو سنتے سنتے میں جوان ہوئی تھی ان میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی میرے سامنے نہ آئے گی۔ دہائیوں پر مبنی غلط، نامکمل اور جانبداری پر مبنی معلومات کے ہوتے ہوئے ضرورت اس امر کی تھی کہ تاریخ کو صحیح رخ پر لانے کے لیے واقعات کا معنی خیز انداز سے تجزیہ کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ بہت سے تفصیلی واقعات کا جائزہ لینے کے بعد میں واقعات کے درمیان موجود خلیج کو مختلف واقعات کے بارے میں درست معلومات اور تمام اطراف سے مناسب نمائندگی کے ذریعے پاٹ سکوں گی، اس طرح تصادم کو بہتر طور پر سمجھنے اور بہتر تجزیہ کرنے میں مدد ملے گی۔

لیکن جب میں نے تمام مواد کو یکجا کیا، تو سامنے آنے والی کہانی نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ گو چند اہم اور بڑے حقائق اپنی جگہ جوں کے توں تھے جیسا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، مذاکرات میں ناکامی، فوجی حکومت کا سیاسی مسائل فوجی انداز میں حل کرنا، ایک بھیانک برادرکش جنگ کا ہونا، اور بھارت کا بڑے پیمانے پر مداخلت کر کے پاکستان کو دولخت کرنا وغیرہ۔ لیکن جس انداز سے حالات اور واقعات کی تفصیلات کے مابین پائے جانے والے تفاوت نے مجھے اصل حقائق تک رسائی میں مدد فراہم کی تو کبھی تفاوت اس قدر تھی کہ ان کا موازنہ کر کے کوئی بھی تصویر مکمل کرنا ناممکن تھا۔ بہر حال میں نے ہر لحاظ سے ان لوگوں تک پہنچنے کی سعی کی ہے جو کہ حالات و واقعات کا حصہ تھے تا کہ کہانی صحیح رخ پر ہمارے سامنے آسکے۔

چونکہ حالات و واقعات کے اصل حقائق کو جانچنے کی غرض سے کوئی ایک پلیٹ فارم موجود نہیں تھا اس لیے مخالفین اپنی اپنی آراء قائم کرنے کے لیے پوری طرح منقسم تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسری جانب کے حقائق کو سرے سے تسلیم ہی نہ کیا گیا اور بہت سی کہانیوں کو کسی منطقی انجام تک پہنچائے بغیر ہی ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ جب میں نے اپنا مقالہ امریکہ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں خزاں ۲۰۰۵ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیش کیا، جو کہ حتمی شکل میں ایک بھارتی اکیڈمک جرنل اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی میں اکتوبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا تھا[۱۵] تو تمام فریقوں کی جانب سے شور کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ فریق اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ میں

ان کے حق میں یا کم از کم ان کے خلاف جانبداری کا مظاہرہ کروں گی لیکن نتائج نے انھیں حیران و پریشان کر دیا تھا۔ پاکستان میں ابتداً لوگوں کو حقائق بتانے کے لیے قائل کرنا انتہائی دشوار تھا لیکن میرے پہلے مقالہ کی اشاعت نے کچھ بند دروازے کھولنے میں میری مدد کی۔ جبکہ دوسری جانب بنگلہ دیش میں جہاں کہانی بتانے والوں کی ایک لمبی قطار تھی لیکن اب وہاں قوم پرستوں نے اپنی زبانوں پر تالے ڈال دیئے تھے۔ پاکستانیوں کی جانب سے مجھے مزید تعاون کی پیشکش ہوئی، بنگالیوں نے مجھے برا بھلا کہا اور میری تحریر میں موجود حقائق کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور بھارتیوں نے محض پاکستان کی صفائی پیش کرنے پر مجھے تنقید کا نشانہ بنایا اور سب سے آخر میں بہاریوں نے میرا بہت شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان پر ہونے والے مظالم کو اپنی تحقیق میں پیش کیا ہے۔ تاہم خدا کا شکر ہے کہ بھارتی اور بنگلہ دیشی اسکالروں نے قومی جذبات سے بالاتر ہو کر مجھ پر تعمیری تنقید کی جس سے مجھے اپنے مقالہ کو مضبوط بنانے میں مدد ملی۔

اس کتاب کو مرتب کرنے میں اصل چیلنج لگاؤ اور عدم لگاؤ کے مابین ایک توازن قائم کرنا تھا۔ ابتدا میں جنرل نیازی کا انٹرویو کرنے کے بعد میں نے ان پر یہ بات واضح کی تھی کہ میں جذبات کی سطح سے اوپر اٹھ کر ۱۹۷۱ء کے واقعات کو قلم بند کرنا چاہتی ہوں۔ اس پر انھوں نے مجھ سے کہا ''نہیں جذبات کو اپنے ساتھ رہنے دو۔ اس طرح تمہارا کام مزید نکھر جائے گا''۔ کئی سال بعد مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ ان کی بات بالکل صحیح تھی۔ کیونکہ اگر مجھے ۱۹۷۱ء کے واقعات سے جذباتی لگاؤ نہ ہوتا تو میں یہ کام کرنے کا بیڑہ ہی نہ اٹھا پاتی۔ میرے خیال میں اصل چیلنج یہ نہ تھا کہ میری تحقیق جذبات سے بالاتر ہو بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ فرط جذبات میں، میں حقائق سے صرف نظر نہ کرنے لگوں۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات میں پائے جانے والے تفاوت میں انسانوں سے متعلق کہانیاں پوشیدہ ہیں اور جذبات سے عاری ہو کر انسانی المیے کی داستان تک رسائی ممکن نہیں۔

میری تحقیق کا آغاز بنگالیوں کے حق میں بے پناہ ہمدردی کے جذبات سے ہوا تھا۔ میرے سامنے بنگالی بطور مظلوم قوم موجود تھے اور یہی انصاف کے تقاضے معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ دوسری جانب فوجی آمریت تھی جس نے الیکشن جیتنے والی پارٹی کو حکومت دینے سے انکار کر دیا تھا اور فوجی قوت کے ذریعے ان کی بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس شکوے سے بھی اتفاق کرتی تھی کہ انتہائی مصائب کے نتیجے میں جنم لینے والے بنگلہ دیش کو عالمی سطح پر نظر انداز کیا گیا گو کہ میں اس کی وجوہات سے ناآشنا تھی۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ بنگلہ دیش ایک غریب ملک تھا اور بنگالی گورے رنگ اور مال و دولت سے عاری ہونے کی وجہ سے سرد جنگ کے اس دور میں کوئی کردار ادا کرنے

سے قاصر تھے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو بنگالی خود اس بات کے سب سے بڑے ذمہ دار تھے کہ عالمی سطح پر ان کی کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔ کیونکہ آزادی کے تیس (۳۰) سال بیت جانے کے باوجود آج تک وہ اپنے حق میں کوئی ٹھوس شواہد پر مبنی دستاویزات، ۱۹۷۱ء کے تصادم کے بارے میں پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ میرے پیش نظر دراصل انہی حقائق کی تلاش تھی جن کی خاطر میں نے رونما ہونے والے واقعات کا بغور جائزہ لینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ پوری جنگ کی اصل صورتحال مکمل طور پر واضح ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔

مجھے اپنی تحقیق کے آخری مراحل تک ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی جو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے متاثرین تھے لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی اصل مظلوم میرے سامنے آتے گئے۔ بنگالی کئی گروہوں میں منقسم تھے — وہ بنگالی جو آزاد بنگلہ دیش دیکھنے کے خواہاں تھے، وہ جو پاکستان کو متحد دیکھنا چاہتے تھے اور وہ بنگالی جو کہ بنگلہ دیش تو نہیں چاہتے تھے لیکن مشرقی پاکستان کے لیے خودمختاری چاہتے تھے۔ کچھ ایسے بنگالی تھے جو اپنے اپنے مؤقف کی تائید میں جان کی بازی لگانے نکل پڑے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو ڈاکٹر زیواگو (Doctor Zhivago) کی طرح صرف زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن واقعات کی لپیٹ میں آگئے۔ کچھ لوگ جنگجو تھے، کچھ غیر محارب تھے تو کچھ تشدد کا نشانہ بننے والے تھے اور کچھ تشدد کرنے والے۔ دوسری جانب پاکستان میں بھی معاشرہ یک رخی منظر پیش نہیں کر رہا تھا۔ سیاسی اور فوجی طور پر لوگ مختلف آراء کے حامل تھے۔

اس پرتشدد اور برادرکش جنگ میں متاثرین کا تعلق ہر طبقے، زبان اور مذہب سے تھا اور دونوں اطراف سے سیاسی خلیج موجود تھی جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ ان واقعات میں انسانی اقدار کو تہہ و بالا کر دیا گیا تھا۔ دونوں جانب فریقین کے پاس اپنے اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کے لیے سیاسی جواز موجود تھے اور دونوں اطراف ان مؤاقف سے فائدہ اٹھانے والے موقع پرست افراد بھی موجود تھے جنھوں نے اپنے فائدے کے لیے تمام انسانی اقدار کو پامال کر دیا تھا۔ بہت سے بنگالی بطور حریت پسند — جن کا خیال تھا کہ وہ آزادی اور ملکی وقار کے لیے لڑ رہے تھے۔ اپنی جانب سے کیے جانے والے ہر ظلم کو جائز سمجھتے تھے اور دوسری جانب مغربی پاکستانی فوجی افسران ایک سیاسی بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ کوئی مغربی اور مشرقی پاکستان یا جمہوریت اور کلیت پسندی کے مابین جنگ نہ تھی۔ اس جنگ کو اتنی سادہ لیکن متضاد اصطلاحات میں بیان کرنا ممکن نہ ہوگا۔ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی ''نیکی'' اور ''بدی'' کے درمیان جنگ نہ تھی۔ اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو غالباً صرف اتنا کہ زندگی کے فطری چکر میں اس قسم کے

تصادم کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ بہرکیف جنگ کے اصل واقعات کو پرکھنا از حد ضروری ہے۔ جنگی واقعات کے بارے میں ایسے بہت سے افسانے جنھیں میں حقیقی سمجھتی ہوئی پروان چڑھی یا تو جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئے یا ان میں حقائق کو بری طرح مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ میری تحقیق کے دوران مجھ پر ایسی باتیں بھی منکشف ہوئیں جو ابھی تک سامنے نہیں آئی تھیں۔

اس کتاب کو تقریباً زمانی ترتیب میں مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز جنگ کی مجموعی صورتحال کے اجمالی جائزے کے ساتھ ساتھ چند مخصوص واقعات کو تفصیلاً بھی بیان کیا گیا ہے۔ باب اول کھلی کتاب (Call to arms) میں عام انتخاب کے ۱۹۷۰ء کے چند ایسے واقعات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے جنھیں یا تو نظرانداز کیا گیا تھا یا ان کی تشریح غلط انداز سے کی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ مذاکرات کی ناکامی اور بنگلہ قوم پرستوں کے شدید احتجاج کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ باب دوم فوجی اقدام سے گریز (Military Inaction) میں یکم مارچ سے ۲۵ مارچ کے دوران ہونے والے واقعات پر توجہ مرکوز رکھی گئی ہے، جب مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کے احکامات کے تحت ایک متوازی حکومت قائم کر لی گئی تھی۔ باب سوم فوجی اقدام (Military Action) ان واقعات پر روشنی ڈالتا ہے جنھوں نے بنگالیوں کی بغاوت کچلنے کے لیے فوجی آپریشن کی جانب راہ ہموار کی۔ اس ضمن میں 26-25 مارچ کے درمیان پاکستان آرمی کی جانب سے ڈھاکہ یونیورسٹی پر حملے کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب چہارم وحشیانہ جنگ (Uncivil War) میں، آنے والے ہفتوں میں ہونے والی خونی جنگ جس نے پورے صوبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، کا تجزیہ دس مختلف کیس اسٹڈیز کے ذریعے کیا گیا ہے۔ باب پنجم اور ششم بیواؤں کا گاؤں اور ہندوؤں کو ہراساں کرنا (Village of Widows اور Hounding the Hindus) ان بڑے بڑے منفرد واقعات کا احاطہ کرتے ہیں جس میں بڑے پیمانے پر ہندوؤں کی نسل کشی اور قتل عام کے الزامات لگائے جاتے ہیں، مذہبًا یہ لوگ بھارت کے پیروکار تھے۔ باب ہفتم مارو اور بھاگو (Hit & Run) بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ لڑنے والے زیرزمین جنگجوؤں کی کارروائیوں اور اس طویل محاذ پر آرمی کے ردعمل پر مشتمل ہے۔ باب ہشتم برادرکشی (Fratricide) میں جنگ کے آخری ایام میں ہونے والے تشدد، خون ریزی اور بنگلہ دیش کی آزادی کے ابتدائی مہینوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں جنگ کے آخری دنوں میں ڈھاکہ میں بڑے پیمانے پر ہونے والے دانشوروں کے قتل عام کی تفصیلات بھی بیان کی گئی ہیں۔ باب نہم الفاظ و تعداد کہانی کے مختلف تانے بانے آپس میں جوڑنے کی ایک کوشش ہے جس میں اس بات کا بغور جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا جنگ ۱۹۷۱ء میں واقعتاً ۳۰ لاکھ بنگالیوں کو نسل کشی کی بھینٹ چڑھایا گیا۔

عرصۂ دراز سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے جن واقعات کو من و عن حقائق تصور کیا جاتا رہا انھیں

ماننے سے پاکستان انکاری رہا اور پاکستان کے اس مؤقف کی تائید ایک ایسی تحقیق سے ہوئی ہے جس کی توقع کسی کو بھی نہ تھی۔ اس کے برعکس ہم بنگلہ دیش اور بھارت میں لوگوں کو اصل حقائق سے آنکھیں چراتے ہوئے پاتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں سیاسی نظام کے قیام کے پس منظر میں ہمیں کئی طرح سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے واقعات خود کو دہراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں ہر واقعہ اپنی جگہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ آزاد بنگلہ دیش کے حامی ۱۹۷۱ء میں قوم پرست بنگالی غیر بنگالیوں یا غیر قوم پرست بنگالیوں کے قتل عام کا یا تو سرے سے انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں یا ان کی تعداد انتہائی کم کر کے بتاتے ہیں یا پھر ان کے قتل عام کے جائز ہونے کے جواز گھڑنے لگتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات نے جس تشدد کو جنم دیا اس کا اندازہ بعد تک کے واقعات سے بھی ہوتا ہے۔ ان واقعات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ من گھڑت قصوں نے انسانوں میں نفرت کے ایسے بیج بوئے کہ آنے والی نسلوں کو بھی اس کی فصل کاٹنا پڑی۔

اپنی تحقیق کے اختتام پر مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے اختتام کے بعد خوابوں کی وہ جنت بنگلہ دیش میں کیوں چکنا چور ہوگئی جس کے خواب وہاں کے لوگوں نے دیکھے تھے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو براستہ لندن و دہلی شیخ مجیب الرحمٰن کے بطور ہیرو ڈھاکہ پہنچنے پر پیٹر ہیزلہرسٹ (Peter Hazelhurst) نے دی ٹائمز (The Times) میں بھارتیوں کے خلاف عوامی جذبات، نجات دہندگان پر گل پاشی، نئی حکومت سے غیر متوقع توقعات اور غیر بنگالیوں کے خلاف شدید نفرت کہ ''صرف انہی افراد کو دھرتی کے بیٹے تصور کیا جائے گا جو خالصتاً مشرقی بنگالی زبان بولتے ہوں گے'' کے بارے میں رپورٹ شائع کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن اور اس کی عوامی لیگ نے، جنھوں نے کچھ ہی عرصہ قبل اصل جمہوریت کی خاطر ایک طویل جدوجہد کی تھی، اب بنگلہ دیش کو ایک شخص کی ذاتی بادشاہت میں تبدیل کر کے رکھ دیا تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن اپنی ذات میں ایک ریاست کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگست ۱۹۷۵ء میں جنگ آزادی میں لڑنے والے آرمی افسران نے شیخ مجیب کو قتل کر دیا۔ انھوں نے مجیب الرحمٰن کے پورے خاندان ماسوائے دو بیٹیوں کے جو اس وقت وہاں موجود نہ تھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ درجنوں ''حریت پسندوں'' اور مجیب کی کابینہ کے افراد کو پابند سلاسل کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جنرل ضیاء الرحمٰن کے منظر عام پر آنے تک آزادی کے لیے لڑنے والے فوجی اب آپس میں برسرپیکار تھے۔ جنرل ضیاء کا تختہ ۱۹۸۱ء میں الٹ کر انھیں بھی قتل کر دیا گیا اور حقیقتاً ۱۹۹۰ء کی دہائی تک بنگلہ دیش عملاً فوج کی عملداری میں رہا۔ بعدازاں ایک نیا جمہوری دور آیا جس میں قتل ہونے والے ایک لیڈر کی بیٹی اور دوسرے کی بیوہ پرشکوہ انداز

سے ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم اس سیاسی دور میں بھی مخالف پارٹی کو نیچا دکھانے کی غرض سے تشدد کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔

اسی دوران پاکستان میں بھی ایک طویل فوجی حکومت نے اپنی راہ ڈھونڈ نکالی اور اب تک فوج کئی علاقوں میں باغیوں سے نبردآزما ہے۔ بھارت نے ۱۹۷۵ء میں ایک مرتبہ پھر ایک پڑوسی ملک کے امور میں دخل اندازی کی اور سکم (Sikkim) کی سلطنت کو بھارت میں شامل کرلیا۔ بنگلہ دیش میں آزادی اور جمہوریت کی دیوی اندرا گاندھی نے خود بھارت میں ذاتی آمریت قائم کر لی۔ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ یہ ناکام ریاستیں ہیں یا ناکام ہونے جارہی ہیں۔ ان کے بارے میں خدشات بھی ظاہر کیے جاتے رہے ہیں کہ ''دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ'' میں یہ دونوں اطراف سے اپنا کردار رکھتے ہیں۔

بلاشبہ آنے والے وقتوں میں ۱۹۷۱ء کی مزید تواریخ خود کو زمان ومکان کی قید سے دور ظاہر کریں گی اور شاید ان سے متعلق حقائق تک بذریعہ تاریخی دستاویزات رسائی بھی ممکن ہوگی۔ ۱۹۷۱ء کے تصادم سے متعلق اس تحقیق اور اس کے دوررس اثرات کو سمجھنے میں اس عمل سے مزید تقویت ملے گی۔ تاہم دو عناصر جنھوں نے زیرنظر کتاب میں روح پھونکی، اس وقت کے کام میں عدم موجود رہیں گے۔ وہ لوگ جو زمینی حقائق کے عینی شاہدین ہیں اس دارفانی سے کوچ کر چکے ہوں گے اور مستقبل کے لکھاریوں کو اس مسئلے سے وہ ان دیکھا اور غیرمحسوس جذباتی لگاؤ نہ ہوگا جو راقم الحروف کو ہے۔ آخرکار میرا تعلق اس آخری نسل سے ہے جو اب تک ۱۹۷۱ء کے واقعات میں باہمی ربط تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

باب اول:

کھلی کتاب

بنگالی قوم پرستوں کی بغاوت

''بنگالی بہت مہذب لوگ ہیں، فنون لطیفہ سے محبت اُن کا طرۂ امتیاز ہے، اُن کی موسیقی بے حد مسحور کن اور اُن کی زبان بہت میٹھی ہے، ...... لیکن جب وہ سرکشی پر اُتر آتے ہیں تو شہد کی مکھیوں کے جھلڑ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں ۔ جب وہ فساد کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں تومجرم اورمعصوم کا امتیاز کیے بغیرہر کسی کواپنے غضب کا نشانہ بناتے ہیں، اگر وہ ایک بار بپھر جائیں تو پھر انہیں اپنی حفاظت کی پرواہ بھی نہیں رہتی۔''

— میجر جنرل حکیم ارشد قریشی، پاک فوج[1]

''سینکڑوں بنگالی اپنی دکانوں اوردفاتر سے چیختے چنگھاڑتے چلے آرہے تھے جو اُن کے غصے کا فوری ردعمل تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ شہد کی مکھیوں کا ایک ایسا جھلڑ ہے جس کے چھتے کو کسی نے چھیڑدیاہو۔''

— آرچر بلڈ(ARCHER BLOOD)،قونصل جنرل امریکہ، ڈھاکہ ۱۹۷۱ء[2]

یہ پاکستانی جنرل اورامریکی سفارت کار، دونوں ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں مقیم تھے، یہ دونوں شخصیات ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھیں لیکن بنگالیوں کا احتجاج دیکھ کر حیرت انگیز طور پر دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے۔آرچر بلڈ ڈھاکہ میں امریکہ کے قونصل جنرل کی حیثیت سے تعینات تھے جنھوں نے بنگالیوں کی بغاوت کے خلاف پاکستانی حکومت کی فوجی کارروائی اور امریکہ کی طرف سے

اِس کارروائی کی مذمت نہ کرنے کے خلاف آواز بلند کر کے شہرت حاصل کی تھی۔ حکیم ارشد قریشی ایک پاکستانی جنرل ہیں جنھوں نے مشرقی پاکستان میں بنگالی قوم پرست باغیوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں شخصیات مارچ ۱۹۷۱ء میں اُس وقت مشرقی پاکستان میں موجود تھیں جب بنگالی قوم پرست سیاست دان اور بغاوت کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن نے بھرپور عوامی تحریک شروع کردی تھی جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور الگ ملک کی حیثیت سے بنگلہ دیش کے قیام کے ضمن میں حتمی سیاسی مرحلہ ثابت ہوئی۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں یعنی صرف تین ماہ قبل، جنرل یحییٰ خان کی فوجی حکومت نے ملک بھر میں عام انتخابات منعقد کرائے تھے جنھیں پاکستان کے پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ انتخابات ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوئے اور منظم دھاندلی پر مبنی سابقہ انتخابی طریقہ کار کو مسترد کر دیا گیا۔ نئے انتخابی طریقہ کار کی بدولت بنگالیوں کو مشرقی پاکستان میں واضح مجموعی برتری کی ضمانت حاصل ہوگئی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے اِن انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ جنرل یحییٰ خان نے جنوری ۱۹۷۱ء میں شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کے بعد یہ عندیہ دیا کہ ''شیخ مجیب الرحمٰن ہی پاکستان کے آئندہ وزیراعظم ہوں گے اور اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ اَب میرا کام ختم ہوگیا ہے، میں اپنا عہدہ چھوڑنے کی تیاری کر رہا ہوں اور اقتدار کی منتقلی جلد عمل میں آجائے گی''۔[۳] اِس صورتحال کو پاکستان میں مجموعی وفاق کے ایک نئے دور کا آغاز بننا چاہیے تھا۔ لیکن اِس کے بجائے ملک دولخت ہوگیا۔

سابق امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے ملک ٹوٹنے کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے ۱۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو اپنے خفیہ مراسلے میں صدر نکسن کو لکھا کہ ''یہاں دو بنیادی مسائل ہیں''۔ اول ''شیخ مجیب الرحمٰن نے گاندھی کی طرز پر عدم تشدد پر مبنی عدم تعاون کی تحریک چلائی جس نے جبر و تشدد اور تسلط کے جواز کو مشکل تر بنادیا''۔ دوم ''مغربی پاکستانیوں میں اتنی فوجی استعداد نہیں تھی کہ وہ اِس ہمہ گیر بغاوت کو طویل عرصے تک دبا کر رکھ سکتے''۔[۴]

کسنجر کی دوسری بات تو ٹھیک تھی لیکن پہلی بات سراسر غلط تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے مشرقی پاکستان میں چلائی جانے والی بغاوت کی تحریک کا ہندوستان میں برطانوی راج کے خلاف چلائی جانے والی گاندھی کی عدم تشدد کی تحریک سے کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہر حال کسنجر کی یہ بات اُن مختلف ذرائع میں سے ایک ہے جن کی بنیاد پر بنگالی بغاوت کی تصویر کشی کی جاسکتی ہے، اِن ذرائع میں خود بنگالی، بھارتی اور دوسرے ذرائع بھی شامل ہیں۔ اگر ہم زیادہ واضح اور کھلی

اصطلاحات کی صورت میں بیان کریں تو مشرقی پاکستان کے تنازع کی تصویر کشی زیادہ آسانی کے ساتھ ہوسکتی ہے مثلاً یہ سویلین ــ ملٹری تنازع تھا، بنگالیوں اور مغربی پاکستانیوں کی لڑائی تھی، مقبول جمہوریت اور فوجی آمریت کے درمیان جنگ تھی یا یہ عدم تشدد اور تشدد کے درمیان کوئی معرکہ تھا۔ لیکن اگر ہم اِس بات کو اختصار اور تسہیل کے ساتھ بیان کریں تو ہم حقیقت تک نہیں پہنچ پائیں گے اور ہم اِس امر کے تجزیے کو خلط ملط کر دیں گے کہ اُس سال مشرقی پاکستان میں اور پھر آنے والے برسوں کے دوران آزاد بنگلہ دیش میں کیا کچھ ہوا۔ اِس باب میں دسمبر ۱۹۷۰ء کے کامیاب انتخابات، یحییٰ حکومت اور شیخ مجیب کے درمیان ہونے والے ناکام مذاکرات، خانہ جنگی میں تبدیل ہوجانے والی بنگالی قوم پرستوں کی مزاحمت، پاک ــ بھارت جنگ اور بنگلہ دیش کے قیام کے باعث بننے والی جنوبی ایشیاء کی دوسری تقسیم کے بعض نظر انداز شدہ اور غلط طور پر پیش کیے جانے والے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات[5]

۱۹۵۸ء میں اقتدار پر قبضہ کرنے والے پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ایوب خان کی جگہ ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے لے لی تھی۔ فوجی حکومت کے خلاف جمہوری قوتوں کی جدوجہد صرف بنگالیوں یا مشرقی پاکستان ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ پورے پاکستان کا معاملہ تھا اور ۱۹۶۸ء سے مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں حصوں میں بھرپور عوامی تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اقتدار پر ایوب خان کی گرفت کے کمزور ہوتے ہی اِن کے سابق وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ایک نئی سیاسی جماعت ''پاکستان پیپلز پارٹی'' تشکیل دے کر اپوزیشن کی قوتوں کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

جنرل یحییٰ خان نے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے کئی ایسے اقدامات کیے جن سے اُن کے اِس عزم کا اظہار ہوتا تھا کہ وہ جلد از جلد اقتدار منتخب سول حکومت کو سونپنا چاہتے ہیں۔ جنرل یحییٰ نے انتخابات کے طریقہ کار اور آئندہ کے نظام حکومت کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کیے۔ نئے انتخابی نظام اور نئے آئین کے راہنما اصولوں کی تیاری کے لیے ایک مسودہ ساز کمیٹی تشکیل دی گئی جس کی سفارشات نومبر ۱۹۶۹ء میں منظر عام پر آئیں۔

نئے فوجی حکمران جنرل یحییٰ بنگالیوں کی شکایات کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ ''انھوں نے اپنے بیانات میں یہ بات واضح کردی تھی کہ وہ مغربی پاکستان کے خلاف مشرقی پاکستان کی

اقتصادی شکایات کے قانونی جواز کو تسلیم کرتے ہیں، یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو ایوب خان حکومت کے خاتمے کے بعد ملک کا سب سے بڑا عوامی مسئلہ بن کر اُبھرا تھا"۔[۲] انھوں نے پچھلے آئینوں میں دیے گئے "اصول مساوات" کو بھی مسترد کر دیا تا کہ براہ راست حق رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرائے جاسکیں۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جو مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے حق میں جاتا تھا اور انھیں اِس سے فطری طور پر فائدہ حاصل ہونا تھا۔

جنرل یحییٰ خان نے اقتدار میں آنے کے ایک سال بعد مارچ ۱۹۷۰ء میں اُن راہنما اصولوں کا اعلان کیا جنھیں لیگل فریم ورک آرڈر (ایل ایف او) کا نام دیا گیا اور اِس لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت قومی اور صوبائی انتخابات اکتوبر ۱۹۷۰ء میں ہونا قرار پائے۔ مشرقی پاکستان میں بدترین سیلاب اور اس کے بعد آنے والے تباہ کن طوفان کے باعث یہ انتخابات دسمبر ۱۹۷۰ء میں منعقد ہوئے۔ اِن انتخابات میں فوج ہر طرح سے غیر جانبدار رہی اور یہ بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہونے والے پاکستان کے پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات تھے۔ جنرل یحییٰ خان ملک کے واحد فوجی حکمران تھے جنھوں نے اقتدار میں آنے کے ایک سال کے اندر ملک کو جمہوریت کی طرف واپس لانے کے لیے اپنے قول کی پاسداری کی تھی۔ لیکن بعد ازاں انھیں ملک میں خانہ جنگی کی صورتحال، بھارت کے ساتھ جنگ، اِس میں شکست اور اپنے ملک کے ٹوٹنے جیسے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

قومی انتخابات کے طور پر علاقائی انتخابی مقابلے

ان انتخابات میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ نے اپنی توجہ مشرقی پاکستان پر مرکوز رکھی اور مغربی پاکستان کی کل ۱۳۸ نشستوں میں سے صرف ۷ نشستوں پر اپنے اُمیدوار کھڑے کیے۔ اسی طرح بھٹو کی پیپلز پارٹی نے اپنی تمام تر توجہ مغربی پاکستان پر مرکوز رکھی اور مشرقی پاکستان میں سرے سے اپنا کوئی اُمیدوار کھڑا ہی نہیں کیا۔ کئی چھوٹی سیاسی جماعتوں نے سرکاری طور پر تو دونوں حصوں میں اپنے اُمیدوار کھڑے کیے لیکن اُن کی قیادت اور حمایت ایک حصے تک محدود رہی۔ پارٹی راہنماؤں نے بھی صرف اپنے اپنے علاقوں پر توجہ دی۔ سیزن اور روز کے مطابق " ان انتخابات میں دراصل دو علیحدہ علیحدہ انتخابی مہمیں چلائی گئیں ـــ ایک مہم مشرقی پاکستان میں چلی اور دوسری مغربی پاکستان میں"۔[۳]

جب فطری جمہوری عمل، سیاسی جماعتوں اور اُن کے راہنماؤں کو علاقائی ڈھانچے کی طرف

لیے گیا (یعنی جمہوری عمل نے سیاسی جماعتوں اور اس کے راہنماؤں کو مختلف علاقوں تک محدود کر دیا) تو ایک قومی پلیٹ فارم تشکیل دینے کا واحد راستہ یہی رہ جاتا تھا کہ سیاسی شعبدہ بازی کے ذریعے مصنوعی طور پر یہ قومی پلیٹ فارم تشکیل دیا جاتا۔ لیکن یحیٰی خان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا کہ مذکورہ طریقہ کار کے متعلقہ قواعد کو بڑے سیاسی راہنماؤں اور بڑی سیاسی جماعتوں کی توقعات کی عکاسی کرنی چاہیے، اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ انتخابی عمل میں شرکت سے انکار کر دیں گے۔ جن لوگوں کو بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کرانے کے نظام کے متعلق تحفظات تھے، انھوں نے جنرل یحیٰی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمام سیاسی راہنماؤں کی شناخت قومی نہیں بلکہ صوبائی سطح کی ہے، تو کہا جاتا ہے کہ یحیٰی خان نے اُن سے پوچھا کہ پھر قومی سطح کے راہنما کون ہیں: ''اُن ہی لوگوں کو آگے آنے دیا جائے۔ میں اُن سے ملاقات کر کے اُن کے ساتھ مذاکرات کروں گا''۔[۸] اِس فوجی حکمران نے یہ بات ذہنی طور پر تسلیم کر لی تھی کہ اُسے مصنوعی طریقے سے ''زیادہ پسندیدہ لوگ'' تیار کرنے کے بجائے اُن ہی سیاستدانوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا جو اصلاً ملک نے پیدا کیے ہیں۔

۱۹۷۰ء تک بہت سے بنگالی پہلے ہی اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں سے دُوری اور بیگانگی محسوس کرتے تھے جس کی وجہ وہ عمل اور رویہ دکھائی دیتا ہے جو ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت سے ہی شروع ہو گیا تھا۔[۹] بنگالیوں کا مطالبہ تھا کہ انھیں وسیع تر علاقائی خودمختاری دی جائے اور اقتدار اور معیشت میں انہیں منصفانہ حصہ دیا جائے۔ شیخ مجیب نے اپنے مشہور چھ نکات پیش کیے جن میں بنگالیوں کی شکایات دُور کرنے کے لیے بڑی آئینی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا گیا۔[۱۰] بنگالیوں میں پائے جانے والے محرومی اور استحصال کے احساس کا شیخ مجیب کی طرف سے چلائی جانے والی مہم میں بھرپور فائدہ اٹھایا گیا اور مغربی پاکستان پر مشرقی پاکستان کے ساتھ امتیازی سلوک اور نوآبادیاتی استحصال کرنے کا الزام لگایا گیا جبکہ مجیب کے مخالفین نے اسے شیخ مجیب اور عوامی لیگ کی طرف سے مغربی پاکستان کے لوگوں کے خلاف منافرت پیدا کرنے کی مہم قرار دیا۔ مشرقی پاکستان میں سیلابوں اور طوفانوں سے پیدا ہونے والی موسمیاتی صورتحال نے مشکلات کے احساس کو شدید تر کر دیا جس کے نتیجے میں عوام کو شدید تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ بنگالی طویل عرصہ سے خود کو امتیازی اور استحصالی پالیسیوں کا شکار سمجھتے تھے لیکن وہ بعض اوقات اِس بات کو ثابت کرنے کے لیے غلط اعداد و شمار کا بھی سہارا لیتے تھے — یہ اعداد و شمار عدم مساوات کے عکاس تو ہوتے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ ان اعداد و شمار

کے ذریعے امتیازی سلوک بھی ثابت ہو سکے۔ حقیقت یہ تھی کہ 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت سے ہی مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کے مقابلے میں زیادہ غریب اور معاشی طور پر زیادہ کمزور تھا۔ سول سروس، مسلح افواج اور انتظامی عہدوں پر شروع ہی سے بنگالیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ عدم مساوات بہرحال ایک حقیقت تھی جسے راتوں رات ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ امتیازی سلوک کو ثابت کرنے کے لیے اعداد و شمار کی چھان بین کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں مثلاً اعداد و شمار پیش کرتے وقت یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ کیا مشرقی پاکستان کو منصفانہ طور پر تمام مواقع فراہم کیے گئے۔

امتیازی سلوک کی حقیقی تصویر کشی ایک متنازع امر ہے لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ بنگالیوں میں پاکستان کے دوسرے درجے کا شہری ہونے کا احساس پایا جاتا تھا اور یہ ایک اہم سیاسی مسئلہ تھا۔[۱۱] اگر احساس محرومی اور شکایات کی بنیاد پر سیاست کی جائے تو یہ امتیازی سلوک کی اصل صورتحال سے زیادہ بڑھ چڑھ کر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کے ادوار میں اہم عہدوں پر کام کرنے والے ایک بنگالی افسر جی ڈبلیو چودھری سمجھتے تھے کہ اقتصادی عدم مساوات ایک حقیقی اور سنگین مسئلہ ہے جس کو ناقص انداز میں حل کرنے کی کوششیں کی گئیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے لکھا کہ ''بنگالی محنت اور تعمیری سرگرمیوں کے بجائے اپنے منفی اور تباہ کن رویے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں اور اِن میں دوسروں پر الزام دھرنے کا بہت زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ آزادی سے پہلے انگریزوں اور ہندوؤں پر الزام دھرتے تھے حالانکہ بنگالیوں کا زندگی کے کسی بھی شعبے میں اِن کے ساتھ مقابلہ نہیں تھا''۔[۱۲]

جی ڈبلیو چودھری کی رائے ایک اور بنگالی مصنف نرادسی چودھری سے ملتی جلتی ہے جو اپنے لوگوں کے متعلق بے لاگ اور سپاٹ تجزیوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ نرادسی چودھری نے مشرقی پاکستان کے انتخابات کے بعد لکھا کہ ''مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں مغربی پاکستان کے خلاف شدید اشتعال پایا جاتا ہے لیکن زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ان مشکلات اور تکالیف سے نکلنے کے لیے بھرپور اقدامات کرنے کے بجائے بنگالی اپنی تکالیف کو بنیاد بنا کر اور خود کو قابل رحم حالت میں پیش کر کے حریص نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ میرے اپنے خیال میں ایک جذباتی اطمینان کے لیے خود کو قابل رحم حالت میں پیش کرنا اور مشکلات کے نام پر کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، تمام بنگالیوں کا وطیرہ بن چکا ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان''۔[۱۳]

منقسم انتخابی نتائج

چونکہ اِن قومی انتخابات کی نوعیت صوبائی سطح کے انتخابات جیسی بن کر رہ گئی تھی۔ اس لیے توقع تھی کہ انتخابی نتائج بھی علاقائی خصوصیات کے حامل ہوں گے لیکن نتائج کی حد درجہ تقسیم نے مبصرین اور ووٹروں دونوں کو حیران کر دیا۔ شیخ مجیب کے شدید مخالف سیاستدان مولانا بھاشانی نے آخری دنوں میں انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ شیخ مجیب کی جماعت عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۱۶۰ نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور مشرقی پاکستان میں ۷۵ فیصد ووٹروں نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ عوامی لیگ مغربی پاکستان سے ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکی۔ اِس کا یہ مطلب ہوا کہ ملک کے کل ووٹوں میں سے ۳۸ فیصد عوامی لیگ نے حاصل کیے اور قومی اسمبلی کی ۳۰۰ نشستوں میں سے مشرقی پاکستان نے ۱۶۰ نشستیں حاصل کیں جو قومی اسمبلی کی کل نشستوں کا ۵۳ فیصد تھیں۔ اِس طرح قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کو واضح اکثریت حاصل ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کی باقی دو نشستوں پر نورالامین اور چکمہ قبیلے کے سردار راجہ تری دیورائے کو کامیابی ملی۔

اُدھر مغربی پاکستان میں بھٹو کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے پنجاب سے قومی اسمبلی کی ۸۲ نشستوں میں سے ۶۲ اور صوبہ سندھ کی ۲۷ نشستوں میں سے ۱۸ پر کامیابی حاصل کی نیز شمال مغربی سرحدی صوبے (موجودہ خیبر پختونخوا) سے بھی اُسے ایک نشست مل گئی۔ اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کی ۱۳۸ نشستوں میں سے ۸۱ نشستیں حاصل کیں (مشرقی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے اپنا کوئی اُمیدوار کھڑا ہی نہیں کیا تھا)۔ پیپلز پارٹی کو ملک کے کل ووٹوں میں سے ۲۰ فیصد ووٹ ملے اور قومی اسمبلی میں اس کی نمائندگی کا تناسب ۲۷ فیصد رہا، یوں مغربی پاکستان سے اس نے ۵۹ فیصد نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔

اگرچہ شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان سے واضح طور پر بھرپور مینڈیٹ حاصل کیا اور ڈالے گئے ووٹوں میں سے ۷۵ فیصد ووٹ حاصل کیے اور تقریباً تمام نشستیں جیت لیں لیکن ڈالے گئے ووٹوں کے یہ اعداد و شمار بہت عجیب و غریب منظر پیش کرتے ہیں۔ مشرقی بنگال جیسے سیاسی طور پر باشعور علاقے میں جہاں امتیازی سلوک اور علاقائی خود مختاری یا متوقع علیحدگی جیسے موضوعات ایک شدید جذباتی معاملہ بن چکے تھے وہاں لوگوں کا بڑی تعداد میں ووٹ ڈالنا کافی حد تک متوقع امر تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ڈالے گئے ووٹوں کی شرح پنجاب کے مقابلے میں کم رہی، مشرقی پاکستان میں ۵۶ فیصد ووٹ ڈالے گئے۔ پنجاب میں ڈالے گئے ووٹوں کا تناسب ۶۷ فیصد،

سندھ میں ۵۸ فیصد جبکہ سرحد اور بلوچستان میں یہ شرح بالترتیب ۴۷ فیصد اور ۳۹ فیصد رہی۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے 44 فیصد ووٹروں نے اپنے صوبے کے لیے ہونے والی بڑی آئینی تبدیلی (جس کا نتیجہ علیحدگی بھی ہوسکتا تھا) کے حق یا مخالفت میں اپنی رائے کا اظہار ہی نہیں کیا۔

اگرچہ ووٹوں کا تناسب مقابلتاً کم رہا لیکن شیخ مجیب اپنا ووٹ حاصل کرنے میں انتہائی کامیاب رہے کیونکہ ووٹ ڈالنے والوں کی اکثریت نے عوامی لیگ کے حق میں ووٹ ڈالے۔ کل ڈالے گئے ۵۶ فیصد ووٹوں میں سے ۷۵ فیصد ووٹ حاصل کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان کے کل ووٹروں میں سے ۴۲ فیصد نے عوامی لیگ کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حالانکہ عوامی لیگ کے حق میں ووٹ ڈالنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوسکتے ہیں جو پاکستان سے علیحدہ ہونے کی خواہش رکھتے ہوں لیکن اکثریت نے وسیع تر علاقائی خودمختاری اور اپنے اقتصادی اور دیگر مسائل کے حل کے لیے عوامی لیگ کو ووٹ دیا تھا۔ جیسا کہ جی ڈبلیو چودھری نے نشاندہی کی کہ ''شیخ مجیب نے انتخابات کے دوران کسی مرحلے پر بھی یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے الگ ریاست بنانے کے لیے ووٹ دو بلکہ انھوں نے تو مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع ہونے کے دن تک مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنے کے لیے مذاکرات جاری رکھے جس کے نتیجے میں انھیں پورے پاکستان کا وزیراعظم بننا تھا۔

بے نتیجہ مذاکرات

انتخابات میں ملنے والی کامیابی نے شیخ مجیب اور عوامی لیگ کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ علاقائی عدم مساوات اور امتیازی سلوک کے مسائل حل کریں جس کی وہ عرصہ دراز سے شکایت کرتے رہے تھے۔ انتخابات کے بعد تین ماہ کے عرصہ کے دوران بعض سیاسی وسماجی اتار چڑھاؤ کے باوجود آخری وقت تک یعنی اگر ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کا نام نہ بھی لیا جائے تو کم از کم ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء تک اِس بات کی قوی توقع کی جارہی تھی کہ اس معاملے میں اُبھر کر سامنے آنے والے تینوں بڑے کھلاڑی یعنی جنرل یحییٰ خان، مجیب اور بھٹو منقسم انتخابی نتائج سے پیدا شدہ صورتحال کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرلیں گے۔

اِن کھلاڑیوں کے درمیان ہونے والے طویل مذاکرات کے بارے میں اگرچہ کئی دلچسپ تبصرے کیے گئے لیکن ان مذاکرات کی ناکامی کے متعلق مستقبل کے دانشور کوئی حتمی تبصرہ اسی صورت میں کرسکیں گے جب انھیں متعلقہ دستاویزی مواد تک رسائی حاصل ہوگی جس میں ان راہنماؤں اور اُن کی ٹیموں کے مابین ہونے والی گفت وشنید کی مبینہ آڈیو ٹیپس بھی شامل ہیں۔[۴۱] دستیاب مواد کی بنیاد پر جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے، وہ کافی حد تک تصوراتی ہی ہے جس میں فوجی حکمران جنرل

یحییٰ خان کا کردار اس طرح سے نظر آتا ہے جیسے انھوں نے سیاستدانوں یعنی مجیب اور بھٹو کو مذاکرات کی میز پر لانے کی سرتوڑ کوشش کی ہو تاکہ نئی اسمبلی اور منتخب حکومت کو اقتدار کی منتقلی کے لیے کسی ایک طریقہ کار پر اتفاق ہو سکے۔ بھٹو اور دوسرے راہنماؤں نے مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا اور اسی طرح جب مجیب نے بھی مغربی پاکستان آنے سے انکار کر دیا تو جنرل یحییٰ خود ڈھاکہ آئے لیکن انتہائی کشیدہ صورتحال کے باعث جنرل یحییٰ کی ثالثی غیر معمولی طوالت کا شکار ہو گئی۔

...... مذاکرات کے دوران مجیب اور بھٹو دونوں نے ایک دوسرے کو محض ترچھی نظروں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ پہلے انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرنے سے انکار کیا اور پھر جب مذاکرات اور ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتو یہ دونوں لیڈر ہر ملاقات میں تقریباً منہ موڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ صدر یحییٰ نے اُن کے اِس رویے پر اُن کی سرزنش کی اور کہا کہ ''وہ دونوں ایک اہم ملک کی سیاسی قیادت جیسا رویہ اپنانے کے بجائے نئے شادی شدہ جوڑے کی طرح شرما رہے ہیں۔'' یحییٰ خان نے خود دونوں کے ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کے قریب کیا اور کہا کہ انھیں اُس وضع داری کا مظاہرہ ضرور کرنا چاہیے جس کی یہ صورتحال متقاضی ہے۔[۱۵]

شیخ مجیب یہ توقع رکھنے میں حق بجانب تھے کہ انتخابات کے فاتح کے طور پر اقتدار انھیں منتقل ہونا چاہیے، لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ تہیہ کر چکے تھے کہ وہ ملک میں مکمل آئینی تبدیلی کے لیے پیش کیے گئے اپنے چھ نکات پر اَب کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ دوسری طرف بھٹو نے عام انتخابات میں اکثریت حاصل نہ کرنے کے باوجود یہ مطالبہ کر دیا تھا کہ اقتدار انھیں منتقل کیا جائے۔ اِس صورتحال میں صدر یحییٰ دونوں سیاسی راہنماؤں کے غیر لچکدار رویے اور بلند و بالا خواہشات کے درمیان پھنس کر رہ گئے۔ اِن دونوں سیاسی راہنماؤں میں سے ہر ایک کو یہ بدگمانی اور شبہ تھا کہ صدر یحییٰ اُس کے ساتھ نہیں بلکہ دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ بہرحال یہ مذاکرات انتہائی کشیدہ ماحول میں منعقد ہوئے اور اس کے بعد یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے التواء کا اعلان کر دیا گیا۔ التواء کے اس اعلان نے مشرقی پاکستان میں کھلی بغاوت کا دروازہ کھول دیا۔ وفاقی حکومت نے ہر طرح سے کام کرنا بند کر دیا اور شیخ مجیب کے فرمان پر ایک متوازی حکومت نے ۲۵ مارچ تک مشرقی پاکستان پر حکمرانی کی۔

بنگالیوں کی بغاوت

یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے التواء کے ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈھاکہ میں پچاس

سے ساٹھ ہزار افراد بانس کی لاٹھیاں اور آہنی ڈنڈے ہاتھوں میں اٹھائے سڑکوں پر نکل آئے اور انھوں نے ہوٹل پُر بانی کے سامنے واقع سڑکیں جام کر دیں۔ وہ انتہائی شدت سے نعرے لگا رہے تھے۔ انھوں نے پاکستانی پرچم اور جناح کی تصویر کو بھی نذرِ آتش کیا۔ شیخ مجیب نے فوری طور پر پریس کانفرنس طلب کی اور ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے ۷ مارچ کو ریس کورس میں ایک جلسے کا بھی اعلان کیا۔[16] ایک پرجوش نوجوان طالب علم ''رُومی'' نے یکم مارچ کی شام گھر آ کر یہ بات اپنی ماں جہاں آراء امام کو بتائی۔ وہ تمام دن اپنے دوست کی ہونڈا موٹرسائیکل پر بیٹھ کر جلسوں میں شرکت کرتا اور شعلہ فشاں تقاریر سنتا۔ وہ چونکہ سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا، اس لیے اُس کی ماں بہت پریشان رہتی، وہ اپنے بیٹے اور اُس کے دوستوں کے لیے برگر بنا کر رکھتی تھی جو پڑے پڑے ٹھنڈے ہو جاتے۔ رُومی رات گئے اپنے گھر ان سنسنی خیز واقعات پر گفتگو کے دوران نصف درجن برگر کھانے کا وعدہ کرتا تھا۔

مشرقی پاکستان سے منتخب ہونے والے دو غیر عوامی لیگی اراکین اسمبلی میں سے ایک اور چکمہ قبیلے کے سردار راجہ تری دیورائے یکم مارچ کو ڈھاکہ میں تھے، جہاں انھیں ۳ مارچ کو ہونے والے قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ وہ اُس وقت ڈھاکہ کلب میں جام نوش فرما رہے تھے جب انھوں نے ریڈیو پر قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کی خبر سنی۔ اِس اعلان کے ہوتے ہی ایک گھنٹے کے اندر اندر جلوس نکلنا اور نعرے لگنا شروع ہو گئے اور غیر بنگالیوں کی دکانوں، ریستورانوں اور سینما گھروں کو لوٹا اور نذرِ آتش کیا جانے لگا۔[17]

جی ڈبلیو چودھری نے لکھا ہے کہ ''جونہی ریڈیو پر اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کا اعلان نشر ہوا، ڈھاکہ میں پُرتشدد ردِعمل سامنے آیا۔ شیخ مجیب نے وہ کام شروع کر دیا جسے اُس نے پُرامن عدم تعاون کا نام دیا تھا؛[18] لیکن یہ گاندھی کے طرز کا پُرامن عدم تعاون نہیں تھا''۔ جی ڈبلیو چودھری کا یہ بیان شیخ مجیب کے ''غیر متشددانہ عدم تعاون'' کے بار بار دہرائے جانے والے دعویٰ کی ایسی نفی ہے جو گاندھی کے ہاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب بغاوت نے مکمل اور یقینی ''عدم تعاون'' کی شکل اختیار کر لی تو پھر یہ نہ تو پُرامن رہی اور نہ ہی اس کا گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفے کے ساتھ فلسفیانہ لحاظ سے یا عملی طور پر کوئی تعلق رہا۔ صرف مجیب نے ہی اس بغاوت کو ''غیر متشددانہ'' نہیں کہا بلکہ بعض دیگر لوگ بھی اس تحریک کو یہی عنوان دیتے نظر آتے ہیں حالانکہ شواہد اس کے بالکل برعکس ہیں۔[19]

اس تحریک کو گاندھی کے عدم تشدد کی تحریک سے نسبت دینے کی کوششوں کی وجہ بظاہر یہ نظر

آتی ہے کہ گاندھی نے برطانوی راج کے خلاف جو پر امن جدوجہد شروع کی تھی، اُسے قانونی اور اخلاقی جواز حاصل تھا اور اَب اسے گاندھی کے ساتھ جوڑ کر قانونی اور اخلاقی جواز فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجیب کی اس تحریک کو غیر متشددانہ عدم تعاون کا نام دینے کی ایک اور خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ تحریک فوجی حکومت کے خلاف تھی۔ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کی بغاوت نہ صرف فکر و عمل کے لحاظ سے گاندھی کی تحریک سے متاثر نہیں تھی بلکہ گاندھی کی طرف سے چلائی جانے والی سول نافرمانی کی تحریک بالخصوص بنگال میں کبھی بھی مقبول نہیں رہی تھی۔ بنگال میں تو برطانوی راج کے خلاف پر تشدد جدوجہد کی روایات دیکھنے کو ملتی ہیں اور مشرقی پاکستان کے باغیوں کو تو یہ دعویٰ کرنا چاہیے تھا کہ پر تشدد جدوجہد ان کا تاریخی ورثہ ہے۔ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کے حامیوں کو بلا شبہ یہ جنگجو روایات ورثہ میں ملی تھیں۔ اس تحریک کے کسی دوسری تحریک سے متاثر ہونے کے حیران کن دعوے کیے گئے حالانکہ زمینی حقائق اس سے بالکل مختلف تھے۔

ڈھاکہ میں تعینات امریکی قونصل جنرل، آرچر بلڈ(ARCHER BLOOD) کی ہمدردیاں بنگالیوں کے ساتھ تھیں اور وہ اُن کی شکایات اور اِس احساس کو جائز سمجھتے تھے کہ اُن کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ جب متبادل تاریخ کا اعلان کیے بغیر قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا تو انھوں نے لوگوں کو سڑکوں اور گلیوں میں نعرے لگاتے اور احتجاج کرتے دیکھا۔ اُس وقت انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ''میں یہ بات جانتا ہوں کہ یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں...... وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ انتخابی نتائج کی پاسداری نہیں کی گئی''۔ انھوں نے آنکھوں دیکھا حال لکھتے ہوئے کہا کہ ''بہت سے لوگوں نے لاٹھیاں اٹھا رکھی ہیں اور وہ کسی طرح بھی پر امن نظر نہیں آ رہے...... مختلف رہائشی علاقوں سے دھواں اٹھ رہا ہے...... عوام کا سب سے بڑا مجمع پُر بانی ہوٹل کے سامنے ہے جہاں عوامی لیگ کی اعلیٰ قیادت بھی پہنچنے والی ہے...... شیخ مجیب ابھی ابھی وہاں پہنچے ہیں۔ مجمع عوامی لیگ کے راہنماؤں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ اس ہوٹل میں مقیم مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ارکان قومی اسمبلی کو اُن کے حوالے کیا جائے''۔[۲۰]

ایک پاکستان صحافی ANTHONY MASCARENHAS جو فوجی حکومت کی طرف سے بغاوت کو ظالمانہ طریقے سے دبانے کے متعلق برطانوی اخبار سنڈے ٹائمز میں مضمون لکھنے اور پھر برطانیہ فرار ہو جانے کی وجہ سے مشہور ہوئے تھے، انھوں نے یکم مارچ کے واقعات کے بارے میں لکھا کہ

......لوگوں کی بڑی تعداد پلٹن میدان کے روایتی جلسہ گاہ کی طرف چلی آ رہی ہے۔ اُن کے چہرے غصے سے

بھرے اور سرخ ہیں اور انھوں نے بانس کی لاٹھیاں، لوہے کے راڈ، ہاکیاں اور حتیٰ کہ سڑکوں کے کنارے لگے ناریل کے درختوں کے کٹے ہوئے ڈنڈے بھی اٹھا رکھے ہیں...... جلسہ کے شرکاء کی تعداد بڑھ کر شام ساڑھے چار بجے تک پچاس ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے اور اس وقت شیخ مجیب اور اس کے ساتھی پربانی ہوٹل میں جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں...... بے انتہا نعرہ بازی کے بعد لوگوں کی ایک بڑی تعداد مجمع کو چھوڑ کر جناح ایونیو کے تجارتی علاقے کی طرف چلی گئی ہے جہاں انھوں نے مغربی پاکستانیوں کی دکانوں کے شیشے توڑ دیے، لوٹ مار شروع کردی اور کپڑے کی ایک دکان کو آگ لگا دی۔ ہنگامہ آرائی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ دریں اثناء پربانی ہوٹل میں کہیں سے پاکستانی جھنڈا لا کر اُسے نذرِ آتش کردیا گیا۔ ہوٹل کے پڑوس میں واقع پی آئی اے کے دفتر کی کھڑکیاں توڑ دی گئیں۔ چند نوجوانوں نے ہوٹل کے اندر واقع مغربی پاکستانیوں کی دکانیں لوٹنے کی کوشش کی۔

اُس کے مطابق شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریر عوامی جذبات کی ترجمان نہیں تھی۔ انھوں نے ہنگامہ آرائی کرنے پر لوگوں کی سرزنش کی اور حکم دیا کہ لوٹا ہوا سامان فوراً واپس کردیا جائے لیکن ''مشتعل لوگ وہاں سے منتشر ہو گئے اور شہر میں ہنگامہ آرائی کرنے کے لیے پھیل گئے۔ اُس رات پورے ڈھاکہ میں پولیس اور بلوائیوں کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں۔ غیر بنگالیوں اور ان کی جائیدادوں پر حملے کیے گئے اور آگ لگانے کے بہت سے واقعات بھی پیش آئے۔ اس صورت حال میں اگر عوامی لیگ کے کسی رضا کار نے مداخلت کی کوشش بھی کی تو مشتعل ہجوم میں شامل لوگوں نے اُسے بھی آڑے ہاتھوں لیا...... یہ ۲۵ روزہ بھرپور عوامی احتجاج کا آغاز تھا......''[۲۱]

یہ چیزیں معمول کا حصہ بن گئی تھیں۔ شیخ مجیب اَب اپنے عوام کو قابو کرنے سے قاصر تھے جنھیں انھوں نے خود مشتعل کیا تھا۔ دوسری طرف اُن کا ہر لفظ قانون تھا اور وہ عسکریت پسندی کی حوصلہ افزائی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بنگالیوں کی بہت سی تحریروں میں یہ انکشاف موجود ہے کہ، شیخ مجیب کی طرف سے پرامن رہنے کے بعض بیانات کے باوجود بنگالیوں کی بغاوت کھلم کھلا اور فخریہ طور پر مسلح اور عسکریت پسندانہ تھی۔ 7 مارچ کو ریس کورس میں شیخ مجیب کی تقریر سننے کے لیے ایک بہت بڑا مجمع جمع ہو گیا تھا، ''......لوگ اپنے ساتھ مختلف قسم کے ہتھیار، بندوقیں، تلواریں، نیزے، بانس کی لاٹھیاں اور لوہے کے راڈ لے کر آئے تھے''۔[۲۲] اُس وقت ہر طرف ایک ہی نعرہ گونج رہا تھا ''بیر بنگالی اوستر و ڈھورو، بنگلہ دیش سوادھن کورو'' یعنی بہادر بنگالیو! ہتھیار اٹھاؤ اور بنگلہ دیش آزاد کراؤ۔ بنگالی تذکروں میں لکھا ہے کہ لوگوں کا سیاسی اجتماعات میں ہتھیار لے کر آنا ایک معمول بن چکا تھا۔

امریکی قونصل جنرل نے بنگالیوں کے ساتھ اپنی تمام ہمدردیوں کے باوجود یہ لکھا کہ

مظاہروں کا ایک قابل اعتراض اور ناخوشگوار پہلو یہ ہے کہ یہ مظاہرے بہت جلد آتشزدگی، لوٹ مار، مغربی پاکستانیوں اور غیر ملکیوں کو ڈرانے دھمکانے اور فوج کے ساتھ محاذ آرائی میں تبدیل ہوگئے۔ ڈھاکہ کے ایک رہائشی علاقے "فارم گیٹ" میں بنگالیوں نے وہاں رہائش پذیر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے گھروں اور دکانوں پر حملے کر دیے۔ انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں جہاں غیر ملکی آکر ٹھہرتے تھے وہاں عوامی لیگ کے نوجوانوں نے تمام انگریزی چیزوں کو توڑ ڈالا...... پستول سے مسلح ایک طالب علم نے ہوٹل میں فائرنگ کردی...... ڈھاکہ کی ایک گلی میں نیویارک ٹائمز کے نمائندے اور اس کی اہلیہ پر نوجوان لڑکوں نے حملہ کر دیا لیکن وہاں گشت پر مامور عوامی لیگ کے کارکنوں کی مداخلت پر اُن کی جان بچ گئی...... بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے طلبا نے برٹش کونسل کو جلانے کی بھی کوشش کی۔[۲۳]

مارشل لاء حکام کے ایک پریس نوٹ میں یہ بتایا گیا کہ مارچ کے پہلے ہفتے کے دوران ہنگامہ آرائی کے دوران ۱۷۲ افراد قتل کیے گئے اور ۳۵۸ افراد زخمی ہوگئے۔ جبکہ عوامی لیگ کا دعویٰ تھا کہ اصل تعداد اِس سے کہیں زیادہ ہے۔ ۲۴ مارچ تک امریکی قونصلیٹ پر "فائرنگ اور غیر مؤثر بم حملوں" کے کئی واقعات پیش آئے۔

جہاں آراء امام نے دیکھا کہ اُس کی گلی میں لوگ اُس کی امریکی مہمان کٹی (KITTY) کو معاندانہ انداز سے دیکھ رہے ہیں۔ کٹی ڈھاکہ یونیورسٹی میں تحقیق کے لیے آئی ہوئی تھی اور بنگالی زبان سیکھنے کے لیے ایک بنگالی خاندان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ اُس نے مسز امام سے پوچھا کہ بنگالی اچانک اُسے ایسی معاندانہ نظروں سے کیوں دیکھنے لگے ہیں۔ مسز امام نے لکھا ہے کہ انھوں نے اُسے اِس کا جواب مشرقی پاکستان کی تاریخ بتا کر دیا۔[۲۴] یہ واضح نہیں کہ مسز امام نے یہ وضاحت کی ہو کہ بنگالیوں کی تنگ نظر نسلی و لسانی قوم پرستی پر مبنی حقارت کا یہ معاندانہ اظہار اِس بغاوت کی علامت بن چکا ہے۔

مشرقی پاکستان میں ایک منظم انداز میں ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دینے کا بھی آغاز کر دیا گیا اور اصلی اور نقلی دونوں قسم کے ہتھیاروں کے ساتھ فوجی طرز کی پریڈیں ہونے لگیں۔ ۲۵ اور ۲۶ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جگن ناتھ ہال پر فوج کے حملے میں زندہ بچ جانے والے ایک کمیونسٹ کارکن "کالی رنجن شیل" نے اپنی یادداشتوں میں لکھا کہ "یکم مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے ملتوی ہونے اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہونے کے بعد یونیورسٹی کی طلبا یونین نے جدو جہد کے حصے کے طور پر جنگ کی تیاری کے لیے نقلی رائفلوں کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے جمنیزیم میدان میں تربیت شروع کرادی...... میں نے بھی ایک گروپ کے ساتھ تربیت حاصل کی۔ چند روز بعد ہماری تربیت مکمل ہوگئی۔ طالبات کا ایک گروپ بھی ہمارے ساتھ شامل تھا اور تربیت

کے بعد ہمارے تین گروپوں نے سڑکوں پر ہونے والے مارچ پاسٹ میں حصہ لیا''۔[25] اسی دوران پریڈ کرتی ہوئی رائفل بردار لڑکیوں کی تصاویر غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں شائع ہوئیں، مارچ پاسٹ اور اس طرح کے اجتماعات کی تصاویر ڈھاکہ کے جنگ آزادی میوزیم میں بڑے فخر کے ساتھ آویزاں کی گئی ہیں۔[26]

۱۹۷۱ء کی بنگالی بغاوت کے ساتھ گاندھی کا نام نتھی کرنا نہ صرف کلیتًا نامناسب ہے بلکہ یہ سراسر لغو اور احمقانہ بات ہے۔ اس ''احتجاجی تحریک کے قائد''[27] شیخ مجیب جو اپنی زبردست خطابت اور انتخابی سیاست کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے، انھوں نے نہ تو کبھی گاندھی جیسی زبان استعمال کی اور نہ ہی وہ گاندھی کے فکری انداز میں سوچتے تھے۔ بندوقیں، لوہے کے راڈ اور برچھیاں اٹھا کر (شیخ مجیب کے جلسوں میں) شریک ہونے والے بنگالی گاندھی جیسی باتیں سُننے کے لیے تو نہیں آتے تھے۔ گاندھی نے تو ۱۹۲۲ء میں ''چوری چورا'' کے مقام پر ہجوم کی طرف سے تشدد کے صرف ایک واقعے کے بعد عدم تعاون کی اپنی پوری تحریک کو ختم کردیا تھا کیونکہ یہ واقعہ ان کے اصولوں کے خلاف تھا...... حالانکہ اس فیصلے پر اُن پر بہت تنقید بھی ہوئی تھی اور اُن کے حامیوں میں مایوسی بھی پھیلی تھی۔

مجیب نے ۷ مارچ کو رمنا ریس کورس کے جلسے میں اپنے حامیوں سے کہا کہ تم ہر گھر کو ایک قلعے میں بدل دو اور جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے، اُس کی مدد سے دشمن سے جنگ کرو (پراتیک گھورے گھورے دُرگو گورے ٹولو — تو ماندر جا اچھے تائی دی شاترُ مقابیلہ کورتے ہوبے)۔ شیخ مجیب کے حامیوں نے وہی کچھ کیا جو انہیں کرنے کو کہا گیا تھا۔ جہاں آراء امام نے ۱۶ مارچ کو اپنے بیٹے کے کمرے میں دھماکہ خیز مواد اور بم بنانے کے آلات پڑے ہوئے دیکھے۔ شیخ مجیب نے 7 مارچ کے جلسے میں اگرچہ یہ بات گھن گرج کے ساتھ کہی تھی کہ ''یہ وقت جدوجہد کرنے کا ہے، یہ وقت اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا ہے (ایبارر سونگرم امادر مکتیر سونگرم، ایبارر سونگرم سوادھی نیتار سونگرم) لیکن جلسہ میں ملک کی آزادی کا اعلان کیوں نہیں کیا گیا۔ اِس کی اصل وجہ یہ تھی کہ شیخ مجیب ابھی تک مذاکرات جاری رکھے ہوئے تھے تاکہ وہ پورے پاکستان کے وزیراعظم بن سکیں۔ عوام مجیب کے اُکسانے پر اشتعال میں آچکے تھے اور اُن کی پُرتشدد کارروائیوں سے ان کے راہنما نے لاپروائی اختیار کرلی تھی۔ عوام اس بات کو نہیں سمجھ سکی کہ شیخ مجیب دوہرا کھیل کھیل رہے ہیں، وہ ایک طرف تو عوامی جذبات کو بھڑکا رہے تھے اور دوسری طرف نجی طور پر مذاکرات بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ لندن فرار ہونے والے پاکستانی صحافی ANTHONY MASCARENHAS کے

مطابق شیخ مجیب نے جب جنوری 1972ء میں نوتشکیل شدہ بنگلہ دیش واپس جاتے ہوئے لندن میں مختصر قیام کیا تو وہ اُس وقت بھی (عرصہ دراز کے بعد نیند سے بیدار ہونے والے امریکی افسانوی کردار RIP VAN WINKLE) کی طرح بھٹو کے ساتھ کوئی ایسا سمجھوتہ کرنے پر غور کر رہے تھے جس کی بنیاد پر بنگلہ دیش اور پاکستان میں ''تعلق'' برقرار رہ سکے۔[۲۸]

۱۹۷۱ء کی بنگلہ دیش تحریک کے بعض پہلو بیسویں صدی کے آغاز میں انگریز راج کے خلاف چلائی جانے والی پُر تشدد اور زیر زمین انقلابی تحریک سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ یہ تحریک ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے خلاف چلائی گئی تھی (انگریزوں نے بعد ازاں ۱۹۱۱ء میں بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا)۔ بنگال میں عسکریت پسندانہ سرگرمیوں کی ایک اور لہر ۱۹۳۰ء کے اوائل میں چٹا گانگ کے فوجی حملے یا مدنا پور میں انگریز مجسٹریٹوں کے یکے بعد دیگرے قتل جیسے واقعات کے ساتھ اٹھی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں زیر زمین سرگرم رہنے والے جنگجوؤں کو بنگلہ دیش میں اُسی طرح ہیرو اور شہید تصور کیا جاتا تھا جس طرح بھارت کی قوم پرستی پر مبنی مجسمہ نگاری میں ہیروز کو پیش کیا جاتا ہے۔

شیخ مجیب کی قوم پرستانہ تحریک کے نتیجے میں پھوٹنے والا تشدد اب کسی کے قابو میں نہیں رہا تھا بلکہ یہ افراتفری پر مبنی تشدد کی ایک لہر تھی۔ یہ تشدد کسی بڑی حکمت عملی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ دباؤ ڈالنے کی ایک شاطرانہ چال تھی۔ پاک فوج کے سب سے سینئر بنگالی افسر نے لکھا ہے کہ سیاسی مذاکرات کے دوران اُس نے شیخ مجیب سے کئی مرتبہ رابطہ کیا اور ''دشمن'' کے خلاف بنگالی افسروں اور جوانوں کی طرف سے پہلا حملہ کرنے کی تجویز دی لیکن مجیب نے اُسے مذاکرات کا نتیجہ آنے تک انتظار کرنے کے لیے کہا۔[۳۰] بنگال کے ایک اور مشہور سپوت سبھاش چندر بوس نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے انڈین نیشنل آرمی تیار کرلی تھی، لیکن مجیب نے میدان جنگ (مشرقی پاکستان) میں قومی سیاسی قیادت کے تحت منظم مسلح جدوجہد شروع کرنے کا راستہ اختیار نہیں کیا۔[۳۱] جب بغاوت کو کچلنے کے لیے فوجی کارروائی کی پہلی شب مجیب کو گرفتار کرلیا گیا تو بنگالی فوجی افسر انفرادی طور پر میدان میں کود پڑے اور از خود کارروائیاں شروع کیں، جس کے نتیجے میں فوج میں بغاوت کے کئی واقعات رونما ہوئے اور ظلم وستم کی نئی داستانیں رقم ہوئیں جو بنگالیوں کی طرف سے تشدد اور احتجاج کے ورثے کا تسلسل تھا۔

۱۹۴۷ء میں جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے طور پر پاکستان کی تخلیق کے لیے چلنے والی تحریک کا مرکز مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کا علاقہ تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے

ساتھ ساتھ ہندو مسلم نسلی فسادات میں لاتعداد انسانی جانیں بھی ضائع ہوئیں۔ یہ ہلاکتیں تقسیم کے وقت اور پھر دونوں علاقوں میں آبادی کی منتقلی کے دوران ہوئیں۔ مبصرین نے تب اور بعد ازاں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کی تصاویر کا موازنہ کیا ہے۔ یہ تصاویر وحشیانہ مظالم کی عکاس ہیں حالانکہ ہندو اور مسلمان صدیوں سے پُر امن طور پر ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے رہ رہے تھے۔ موجودہ دور میں یہ اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اس قسم کے ''ہنگامے'' پرانی منافرت کے باعث کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں تھے بلکہ یہ باقاعدہ سیاسی طور پر منظم انداز میں کیے جانے والے واقعات تھے۔

قیام پاکستان کے محض بیس سال بعد ہی مشرقی بنگال کے لوگوں نے اپنے مسلمان ہم وطنوں پر نو آبادیاتی تسلط کا الزام دھرنا شروع کر دیا اور ان کی ۱۹۷۱ء کی بغاوت خود ان کی نسلی و لسانی قوم پرستی اور غیر بنگالیوں کے خلاف نسلی منافرت کا اظہار تھی جیسا کہ MICHAEL IGNATIEFF نے بلقان کے لوگوں کے متعلق لکھا ہے کہ...... ''ہمیں اس بات پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مقامی نسلی منافرت کی جڑیں تاریخ میں اِس قدر گہری ہیں کہ اس کا نتیجہ قوم پرستانہ تشدد کی صورت میں ہی نمودار ہونا تھا۔ یہ لوگ اچھے ہمسایوں کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔''[۳۲]

مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء میں ایسی ہی صورتحال پیدا کرنے کے ذمہ دار ''سیاسی کیمیا گروں'' کے متعلق ان کے اپنے کردار اور کارروائیوں کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی ایسے شخص کو گاندھی کے ساتھ نسبت نہیں دی جاسکتی جو لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی قوت رکھتا ہو اور حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو سبھاش چندر بوس کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی ہے جو ہر کسی کو کہے کہ ہتھیار اُٹھاؤ۔

باب دوم:

فوجی اقدام سے گریز

ذمہ داری کے بغیر طاقت

صدر نکسن: ''......درحقیقت سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی شخص کسی ایسے مقام کا نظام چلا سکتا ہے جہاں خدا کی لعنت برستی ہو''۔

ہنری کسنجر: ''بالکل ٹھیک بلاشک وشبہ بنگالیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ ان پر حکومت کرنا کبھی آسان نہیں رہا''۔

صدر نکسن: ''بھارت بھی ان پر تسلط قائم نہیں کرسکے گا''۔

—صدر نکسن کی ہنری کسنجر سے ٹیلی فون پر گفتگو، 29 مارچ 1971ء۔[1]

یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو جب پاکستان کی فوجی حکومت نے قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا اعلان کیا، تو شیخ مجیب الرحمٰن نے ہڑتال کی اپیل کردی اور یہیں سے قوم پرست بنگالیوں کی بغاوت اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس وقت تک ہر لحاظ سے پاکستانی حکومت مشرقی پاکستان میں عملداری کھو چکی تھی۔ بہت سے پاکستانیوں اور بنگالیوں کے مطابق ۲۵ مارچ تک عملاً شیخ مجیب الرحمٰن کی ''متوازی حکومت'' قائم رہی تھی گو کہ زیادہ تر توجہ ۲۵ مارچ سے حکومت کی جانب سے شروع ہونے والے ملٹری آپریشن پر مرکوز رہی، حکومت سے بظاہر علیحدگی کے بعد یہ تاریخ پیش آنے والے واقعات کے لیے نہایت نازک، اہم اور سازشی عنصر ثابت ہوئی۔

۲۵ مارچ تک کے واقعات کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے امریکی کونسل جنرل آرچر بلڈ (Archer Blood) لکھتے ہیں کہ شیخ مجیب ایک ''چکنے راستے پر چلنے کی کوشش کر رہے تھے'' ایک

جانب تو وہ اشتعال انگیز تقاریر کرتے ہیں، تو دوسری جانب وہ لوگوں سے کہتے نظر آتے ہیں کہ ہندوؤں، عیسائیوں اور بہاریوں (غیر بنگالی مسلمانوں) سے بھائیوں جیسا برتاؤ کیا جائے اور لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ جیسے اقدامات نہ کیے جائیں۔ اس کی پارٹی کے سرگرم کارکنان عوام میں رائفلیں اور شارٹ گنیں لے کر نکلے اور اس کی تقاریر سننے کے لیے آنے والے لوگ مجمع میں بھی مختلف قسم کا اسلحہ تھامے ہوئے ہوتے تھے۔ ایک جانب تو مجیب نے حکومت وقت کو چیلنج کر رکھا تھا تو دوسری جانب اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس کا مقصد سیاسی احتجاج کرنا ہے نہ کہ متوازی حکومت قائم کرنا۔ مجیب کی جانب سے دیئے جانے والے احکامات کو بناء کسی ذمہ داری کے جذبۂ وفاداری کے تحت یا بصورت تحفظات مانا جاتا تھا۔[۲]

راجا تری دیورائے، چکما کے سردار اور ہل ٹریکٹس سے منتخب شدہ ایم این اے، قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کی وجہ سے اپنی فیملی کے ہمراہ ڈھاکہ سے چٹاگانگ جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں یہ معلوم ہوا کہ ٹرینیں سرکاری شیڈول کے بجائے مجیب الرحمٰن کے احکامات کے مطابق چلائی جارہی تھیں۔ موصوف کے خیال میں ـــ جو مجھ تک ذاتی طور پر بذریعہ غیر سیاسی یا غیر عوامی لیگی بنگالیوں کے پہنچے تھے ـــ مجیب کے احکامات کی منظوری کے پیچھے صرف یہی جذبہ کارفرما نہیں تھا کہ اسے غیر متنازع طور پر لیڈر مان لیا گیا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کارکنان اس کے احکامات کی بجا آوری میں تشدد سے بھی گریزاں نہ تھے۔ اسی اثناء میں پرتشدد کارروائیاں بشمول غیر بنگالیوں بالخصوص بہاریوں کا قتل عام روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی اور فوج اپنی بیرکوں تک محدود تھی۔[۳]

مجیب بھی اب اپنے اختیار کردہ چکنے راستے پر پھسلنے لگا تھا، 7 مارچ کو ایک پرجوش ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے مجیب نے ان میں بجلی بھر دی، لیکن یکدم آزادی کے اعلان سے گریز کیا۔ مجمع میں موجود بہت سے بنگلہ دیشیوں کے مطابق انھیں اس وقت بڑی ''مایوسی'' ہوئی۔ عوام اپنے لیڈر کے ایک ایک حرف پر من وعن عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ رومی جیسے نوجوان مایوس تھے جبکہ ان کے عمر رسیدہ سرپرست اسے مجیب کی دوراندیشی قرار دے رہے تھے۔[۴]

اس دوران ڈھاکہ میں غیر ملکیوں کے خلاف تشدد میں بہت تیزی آگئی۔ 12 مارچ کو امریکی سفارتخانے کے قریب دو بم دھماکے کیے گئے اور ایک حملہ آور نے ریوالور سے گولیاں چلائیں۔ ۱۵ مارچ کو سفارتخانے پر کئی گولیاں برسائیں گئیں۔ ۱۹ مارچ کو امریکی سفارتخانے اور انٹرکانٹینینٹل پر مولوٹو کاکٹیل کی بارش کی گئی۔ اس کے علاوہ ڈھاکہ کلب، برٹش کونسل، امریکن لائف انشورنس

کمپنی اور امریکن ایکسپریس پر بھی بموں سے حملے کیے گئے۔ تاہم حملہ آوروں کے ناتجربہ کار ہونے کی وجہ سے نقصانات بہت کم ہوئے تھے۔[۵]

تاہم، صوبے کے دیگر علاقوں سے ملنے والی اطلاعات کے مقابلے میں ڈھاکہ میں ہونے والی پرتشدد کارروائیوں کی تعداد کم تھی۔ ان واقعات میں بنگالیوں کے ہجوم بنگالیوں پر حملہ آور ہوتے، لوٹ مار کرتے اور جلاؤ گھیراؤ کرتے تھے۔ کچھ علاقوں سے تو بھاری جانی نقصانات کی اطلاعات بھی موصول ہوئی تھیں۔ اگست ۱۹۷۱ء میں پاکستانی حکومت کی جانب سے شائع کیے جانے والے قرطاس ابیض میں ایسے کئی واقعات کا ذکر ملتا ہے۔ ان واقعات کے نتیجے میں سب سے زیادہ جانی نقصان مارچ کے پہلے ہفتے میں کھلنہ اور چٹاگانگ میں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ۴ مارچ کو کھلنہ میں ٹیلی فون ایکسچینج کے کئی ملازمین کو قتل کیا گیا، اور ۵ مارچ کو خالص پور اور دولت پور میں ۵۷ افراد کو (جو کہ غالباً غیر بنگالی تھے) برچھیوں اور درانتیوں سے قتل کیے جانے کی رپورٹ موصول ہوئی۔ چٹاگانگ میں سینکڑوں غیر بنگالی مرد، عورتوں اور بچوں کو ۳ اور ۴ مارچ کو وائرلیس کالونی اور فیروز شاہ کالونی میں قتل کرنے کے بعد ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی۔[۶] میجر (کیپٹن) اکرام سہگل نے جو اس وقت پاکستان آرمی کے شعبۂ ہوابازی سے تعلق رکھتے تھے، بتایا کہ انھوں نے ۴ مارچ کو فیروز شاہ اور وائرلیس کالونیوں پر پرواز کرتے ہوئے دیکھا کہ دونوں کالونیاں سیاہ اور مکمل طور پر جلی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔[۷]

حتیٰ کہ آرمی پر سخت ترین تنقید کرنے والے Mascarenhas نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں بسنے والے غیر بنگالی دہشت کا شکار دکھائی دیتے تھے: ''ان میں پائی جانے والی دہشت بے بنیاد نہ تھی۔ شیخ مجیب کے واضح احکامات اور عوامی لیگ کے رضاکاروں کی جانب سے حفاظتی اقدامات کے باوجود چٹاگانگ، کھلنہ، ڈھاکہ اور دیگر چھوٹے شہروں سے غیر بنگالیوں پر ہونے والے پرتشدد واقعات کی لاتعداد رپورٹیں مل رہی تھیں''۔[۸] تاہم سب لوگ عوامی لیگ کے رضاکاروں کو اس روشنی ہی میں نہیں دیکھ رہے تھے۔ سرکاری قرطاس ابیض، مغربی پاکستانی اور حکومت کے حامی بنگالی افراد کے مطابق رضاکار امن وامان قائم کرنے والے نہ تھے بلکہ مشتعل ہجوم کی سربراہی کر رہے تھے۔

''مجیب کی حکومت'' اور فوج

۲۲ فرنٹیئر فورس کے میجر (کرنل) شین جان بابر مارچ ۱۹۷۱ء میں جیسور، کھلنہ میں تعینات تھے۔ وہ

۱۹۷۰ء کے وسط ہی سے مشرقی پاکستان میں تھے۔ فضا میں گڑبڑ کے آثار موجود تھے۔ لیکن یکم مارچ کے بعد صوبے میں عملاً ''مجیب الرحمٰن کی حکومت'' قائم ہو چکی تھی۔ کرنل بابر نے محسوس کیا کہ مجیب کو اس دوران اس قدر کھلی چھٹی دے دی گئی تھی کہ فٹ پاتھ پر بیٹھے بنگالی بھی یہ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ مجیب کا ساتھ دیں تو ان کے حالات بدل سکتے ہیں۔ فوج کو کینٹ کے علاقوں تک محدود رہنے اور ردِعمل نہ ظاہر کرنے کے احکامات تھے۔[9]

لیفٹیننٹ (لیفٹیننٹ جنرل) غلام مصطفیٰ جو کہ ۵۵ فیلڈ رجمنٹ سے متعلق رکھتے تھے ۱۹۷۰ء سے جیسور میں تعینات تھے۔[10] انھوں نے اپنی آمد کے ساتھ ہی فضا میں دشمنی اور جنگ کے آثار بھانپ لیے تھے اور انھیں اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب انھیں ایئرپورٹ سے باہر جانے کے لیے اپنے ساتھ محافظ لے جانے کو کہا گیا۔ ان کی یونٹ نے اسی برس سیلاب متاثرین کے لیے امدادی کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ انھیں حیرت تھی کہ ان کی سخت محنت کے باوجود بھی وہاں کے بنگالی یہی شکایت کرتے تھے کہ کچھ کیا ہی نہیں جا رہا۔ ان کی یونٹ نے الیکشن کے دوران بھی فرائض انجام دیئے۔ انھیں مختلف پارٹیوں کی طرف سے ڈرائے دھمکائے جانے کی شکایات بھی موصول ہوئیں، لیکن فوج کو انتخابی عمل میں مداخلت نہ کرنے کے احکامات تھے اس لیے فوج نے مداخلت نہ کی۔

جیسے ہی مارچ کے مہینے میں کھلم کھلا بغاوت شروع ہوئی، تو بنگالی بلوائیوں نے جیسور شہر میں ٹیلی فون ایکسچینج اور غذائی اجناس کو گوداموں جیسی تنصیبات پر حملہ آور ہونا شروع کر دیا۔ لیفٹیننٹ جنرل مصطفیٰ کے مطابق، ابتداً آرمی نے امن و امان کو بحال کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دونوں اطراف سے لوگ زخمی ہوئے۔ لیکن بعدازاں آرمی کو چھاؤنی میں بھیج دیا گیا، جو شہر سے باہر واقع تھی، اس دوران جیسور میں لاقانونیت عروج پر پہنچ گئی تھی یہاں تک کہ اپریل میں فوج نے اس پر ''دوبارہ قبضہ'' کر کے حالات کو معمول پر لانا شروع کیا۔

۲ مارچ کو کرفیو نافذ کر دیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والے چند افراد پر گولیاں بھی چلائی گئیں، لیکن ۳ مارچ کو دستوں کو واپس بلوالیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل (میجر جنرل) ایچ اے قریشی کے مطابق جو اس وقت ۲۶ فرنٹیئر فورس کی سید پور، رنگ پور، دیناجپور میں کمان کر رہے تھے، یہ ایک فاش غلطی تھی فوج سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والوں پر بھی گولی نہ چلائی جائے جب تک کوئی فوج پر حملہ آور نہ ہو۔ انتہائی حساس مقامات پر تعینات بنگالی افسران بلا روک ٹوک مجیب الرحمٰن کو اطلاعات فراہم کر رہے تھے۔ کھلم کھلا کرفیو کی خلاف ورزی کی جا رہی تھی۔[11]

جنرل یحییٰ خان نے ۶ مارچ کو انتہائی سخت لب و لہجے میں تقریر کی اور جنرل ٹکا خان کو مشرقی

پاکستان میں تعینات کر دیا — انھیں بلوچوں کی بغاوت کو بزور قوت کچلنے کے بعد سے ''قصاب بلوچستان'' کا لقب ملا تھا— ٹکا خان کو مشرقی پاکستان میں بطور گورنر اہم ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ آرچر بلڈ لکھتے ہیں کہ ''اگر ایک طرف بنگالی گورنر احسان کی معزولی سے نالاں تھے تو دوسری طرف وہ جنرل ٹکا خان کی آمد سے تقریباً خوف زدہ تھے''۔[۲] جنرل ٹکا خان کی بطور گورنر تعیناتی کو ۱۹۳۱ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے سر جان اینڈرسن کو بطور گورنر بنگال بھیجنے کے مترادف کے طور پر دیکھا جا رہا تھا: آئرلینڈ میں آئرش ''رضا کاروں'' کو ''بلیک اینڈ ٹینز'' کی مدد سے کچلنے کے لیے اینڈرسن آئرلینڈ میں ڈیوٹی انجام دے چکا تھا اور امید تھی کہ صوبہ بنگال کے باغیوں کو بھی اسی انداز سے دبا لے گا۔ بنگالیوں کی ''متوازی حکومت'' کا یہ عالم تھا کہ مشرقی پاکستان میں بنگالی چیف جسٹس نے جنرل ٹکا خان سے بطور گورنر حلف لینے سے معذرت کر لی۔

اسی اثناء میں عوامی لیگ نے مؤثر انداز میں فوج کو ''محصور'' کر دیا۔ غذا اور ایندھن کی ترسیل کو روک دیا گیا تھا اور علاقے میں تمام دکانداروں کو ہدایات تھیں کہ کسی فوجی کو کوئی چیز فروخت نہ کی جائے۔ ان کے لیے کوئی تازہ غذا— مچھلی، گوشت، سبزیاں حتیٰ کہ شیر خوار بچوں کے لیے دودھ تک میسر نہ تھا۔ فوج کی نقل و حمل میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں اور فوج کا مذاق اڑانے کے علاوہ ان سے الجھنے یا جھگڑنے کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ چند انتہائی سنگین واقعات میں فوجی جوانوں پر حملے کر کے ان سے اسلحہ بھی چھین لیا گیا تھا۔ ان میں سے چند واقعات بہت خطرناک ثابت ہوئے۔

''اکا دکا فوجیوں کا قتل اب روزانہ کا معمول بن چکا تھا''۔ میجر جنرل ایچ اے قریشی تحریر کرتے ہیں۔ ''ہمارے علاقے میں ۲۹ کیولری کے کے لیفٹیننٹ عباس شہید ہوئے۔ ایک بنگالی فوجی دستے کے ساتھ وہ فوجیوں کے لیے تازہ سبزیاں لینے نکلے تھے۔ باغیوں نے ان پر حملہ کر دیا، ان کے افسر کو شہید کر کے، ان سے اسلحہ چھین کر دستہ کے بنگالی سپاہیوں کو واپس بھیج دیا گیا''۔ لیفٹیننٹ عباس کے قتل کے ردِعمل کے طور پر کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے یا اس علاقے میں ملٹری ایکشن لینے سے گریز کرنے کے احکامات تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''ہماری جانب سے جوابی کارروائی نہ کرنے کی وجہ ایک طرف تو عسکریت پسندوں کے حوصلے بلند ہونے لگے تھے تو دوسری جانب مسلح افواج کا مورال گرنے لگا تھا''۔[۳]

جب ۱۸ پنجاب کے لیفٹیننٹ محمد علی شاہ کو اطلاع ملی کہ ان کے ساتھ کورس کرنے والے ساتھی لیفٹیننٹ عباس کو ڈھاکہ میں قتل کر دیا گیا ہے تو انھیں مشرقی پاکستان میں حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔[۴] ۱۹۷۰ء سے ڈھاکہ میں تعینات لیفٹیننٹ شاہ نے تیزی سے بدلتی ہوئی فضا کو محسوس کر لیا

تھا۔ جب ۱۹۷۰ء کے اوائل میں وہ یہاں آئے تھے تو حالات معمول کے مطابق تھے ان جیسے نوجوان افسران بنگالیوں کے ساتھ ڈھاکہ کلب جیسے مقبول عوامی مقامات پر تفریح کیا کرتے تھے۔ تاہم اکتوبر کے مہینے سے سیاسی لیڈران کی شعلہ بیانیوں نے فضا کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا — اب کلب میں بھی پہلے جیسا دوستانہ ماحول نہ رہا تھا۔ عداوت کے جذبات کو سڑکوں پر اور دکانوں پر محسوس کیا جاسکتا تھا گو کہ چند بنگالی افسران اب بھی دوستانہ ماحول میں ملا کرتے تھے۔

انتخابات کے بعد حالات بد سے بدتر ہوگئے اور فوج کو اشتعال دلانے اور ان سے اسلحہ چھیننے کے واقعات بکثرت پیش آنے لگے تھے۔ فوجی افسران سے نقل وحمل محدود کرنے کو کہہ دیا گیا تھا اور اب لیفٹیننٹ شاہ کو کینٹ سے باہر جانے کے لیے بھی محافظوں کے ایک دستے کی ضرورت پڑتی تھی۔ فروری کے اواخر تک تازہ راشن کا حصول تک ناممکن ہوگیا اور افسران اور جوان بھی صرف دال روٹی پر گزارہ کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ ایک مرتبہ تو بینک منیجر نے لیفٹیننٹ شاہ کا چیک کیش کرنے تک سے انکار کردیا اور بتایا کہ ان کی پوری تنخواہ ان کے اکاؤنٹ میں نہیں بھیجی گئی کیونکہ شیخ مجیب نے فوجی افسران کو محدود تنخواہیں دینے کے احکامات جاری کیے تھے۔ ایک رات لیفٹیننٹ شاہ کو ایک دوسرے افسر کی طرف سے مدد کے لیے SOS کال موصول ہوئی یہ کال مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کو بچانے سے متعلق تھی، جن کی فیکٹری اور گھر پر بنگالی بلوائی حملہ آور ہوئے تھے۔ اس خاندان کو پہلے بحفاظت کینٹ میں پہنچایا گیا اور بعدازاں مغربی پاکستان کے لیے روانہ کردیا گیا۔ ایسے غیر بنگالی خاندان جو پاکستان جانے کی غرض سے ایئر پورٹ پر منتظر تھے خوف کے عالم میں ہرگز ائیر پورٹ سے جانے کو تیار نہ تھے۔ ائیر پورٹ پناہ گزینوں کے ایک کیمپ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

ہر وفادار فوجی افسر جس سے میری بات ہوئی، اس وقت کے بگڑتے ہوئے حالات، لاقانونیت اور اشتعال انگیزی سے نالاں تھا لیکن احکامات کے مطابق انھیں چھاؤنی تک محدود رہنا تھا اور کسی بھی قسم کی کارروائی سے گریز کرنا تھا۔ ۱۸ پنجاب سے تعلق رکھنے والے کیپٹن سرور نے مجھے بتایا کہ کس طرح ڈھاکہ کینٹ سے باہر بنگالی قوم پرستوں نے اپنی رکاوٹیں قائم کر رکھی تھیں جہاں وہ مغربی پاکستانیوں کو روک کر ان کی تلاشی لیتے تھے، حتیٰ کہ ان سے قیمتی اشیاء تک چھین لیتے تھے۔ یہ سب مسلح افواج کی آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا لیکن وہ احکامات کے پابند ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔[۱۵] حتیٰ کہ پاکستانی صحافی Mascarenhas جو آرمی ایکشن کو تنقید کا نشانہ بنانے کے حوالے سے مشہور تھے، رقم طراز ہیں ''پاکستان آرمی کے نظم وضبط کو بیان کرنے کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں

گی۔ افسران اپنے جوانوں کو ان ۲۵ دنوں کے درمیان نظم وضبط کا پابند کرنے میں کامیاب رہے جو ان کے لیے ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھے۔"[۱۶]

۲۵ مارچ کو شروع ہونے والے ملٹری آپریشن سے راتوں رات حالات قابو میں نہیں آ گئے تھے۔ یہ تو محض یکسر نئی پالیسی کا آغاز تھا۔ مسلح افواج کو علاقے پر "دوبارہ قابض" ہونے اور بھارت کی سرحدوں تک دوبارہ حکومت کی رِٹ قائم کرنے میں چند ہفتے لگے ۔ لیکن "عدم ردعمل" بھی پالیسی کا حصہ تھا۔ حکومت وقت کا بڑے پیمانے پر کرفیو کی خلاف ورزیوں اور پرتشدد کارروائیوں کے باوجود آرمی کو بیرکوں تک محدود رکھنے کو، جس سے مجیب کے اقتدار کو کسی قدر قانونی جواز بھی ملا، سمجھوتے کی پالیسی بھی گردانا جاسکتا ہے تاکہ سیاسی حل کے لیے امید باقی رہے۔ تاہم عدم کارروائی کی اس پالیسی کو عدم حکومت سمجھا گیا، کیونکہ شہریوں کے قتل عام کے ردعمل میں بھی کوئی کارروائی نہ کی جاتی تھی ۔ عوامی رائے کے برعکس، حکومتی رِٹ کی عدم موجودگی سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا۔ مجیب الرحمٰن کی "متوازی حکومت" کے احکامات اس کو پُر کرنے میں ناکام رہے تھے ۔ مجیب اب تک حکومت کو چیلنج کر رہا تھا لیکن حکومت چلانا اس کے بس میں نہ تھا۔ جیسا کہ آرچر بلڈ اس بات کی تشریح کرتا ہے کہ مجیب ذمہ داریوں کو نبھائے بغیر محض سیاسی قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں بلقان کی ریاستوں میں لسانی قوم پرستی کی شوریدگی سے متعلق مائیکل اگناطیف (Michael Ignatieff) لکھتا ہے، "......جب لوگ حد سے زیادہ خوف زدہ ہو جائیں تو وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ایک قسم کا خوف طاری ہوتا ہے جو کہ اپنے اثرات کے اعتبار سے کسی بھی دوسرے خوف سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے، ایک باقاعدہ پروان چڑھتا ہوا خوف کہ ریاست ناکامی کی طرف جا رہی ہے۔ لسانی تعصب خوف کے نتیجے میں جنم لیتا ہے جو مجاز حکومتی مشینری کے کمزور ہونے کی صورت میں تقویت پکڑنے لگتا ہے"۔[۱۷] مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کے موسم بہار میں کئی ہفتوں تک عملی طور پر کوئی حکومت موجود ہی نہ تھی۔ عوامی لیگ کی قیادت کی ناکامیاں اس کی نااہلی یا عدم توجہ میں دیکھی جاسکتی تھیں جس بنیاد پر وہ ان لوگوں کو قانون شکنی سے روکنے میں ناکام تھی جنھیں انھوں نے اشتعال دلایا تھا۔ جبکہ دوسری جانب حکومت بھی لوگوں کو جان و مال کا تحفظ دینے میں بری طرح ناکام ہو چکی تھی۔ اگر ۲۵ مارچ کو سیاسی حل کی جگہ فوجی ایکشن کا فیصلہ اخلاقی اور سیاسی طور پر غلط تھا تو آنے والے ہفتوں میں سیاسی حکومت کا اپنی ذمہ داریوں سے دستبردار ہونا بھی کوئی کم تباہ کن فیصلہ نہ تھا۔

جوئے دیپور کا واقعہ، ۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء

۲۲ مارچ کو جہاں آراء امام اپنی جرنل نما کتاب میں تحریر کرتی ہیں کہ ''جوئے دیپور میں فوج نے عوام پر فائرنگ کر دی اور اس کا ردعمل ٹونگی اور نارائن گنج میں دیکھنے کو ملا۔ عوام جوئے دیپور کے واقع پر شدید مشتعل ہو گئے تھے۔''[18]

جوئے دیپور کے واقعے کا تفصیلی بیان ہمیں امریکی قونصل جنرل کی تحریر میں کچھ یوں ملتا ہے:

سب سے زیادہ سنگین تصادم ۱۹ مارچ کو اس وقت ہوا جب ڈھاکہ کے شمال میں ۲۰ میل دور واقع جوئے دیپور کے مقام پر ایک ریلوے کراسنگ پر اکٹھا ہونے والے ہجوم پر فوج نے فائرنگ کر دی۔ بظاہر یوں لگ رہا تھا کہ فوج کو غازی پور آرڈیننس فیکٹری سے اسلحہ حاصل کرنے سے روکنے کے لیے یہ ہجوم جمع ہو گیا اور ریلوے کراسنگ پر ایک بوگی رکاوٹ کے طور پر کھڑی کر دی۔ فوجی ذرائع کے مطابق انھوں نے اپنے دفاع میں فائرنگ کی کیونکہ ہجوم ان کی طرف اسلحہ چھیننے کے لیے بڑھ رہا تھا اس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک ہوا تھا۔ جبکہ عوامی لیگ کے حامی ایک اخبار نے مرنے والوں کی تعداد ۲۰ بتائی تھی۔

آرچر بلڈ مزید لکھتا ہے کہ: ''مجیب الرحمٰن نے 'غیر مسلح' لوگوں پر 'بلا امتیاز' فائرنگ کی سختی سے مذمت کی'' ...... ۱۹ مارچ کی شب عالمگیر [مشرقی پاکستان میں Esso کا جنرل منیجر اور آرچر بلڈ اور عوامی لیگ کے درمیان اہم رابطہ کار] کچھ دیر میرے گھر کے قریب رکا، اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ مجیب الرحمٰن کے جوئے دیپور میں ہونے والے واقعات سے متعلق شدید تحفظات تھے اور اس واقعہ کی وجہ سے اب وہ اس پوزیشن میں نہیں رہا کہ اپنے لوگوں کو کسی قسم کے سمجھوتے پر آمادہ کر سکے۔ دریں اثناء فوج اسی قسم کی ''اشتعال انگیزیوں'' میں مصروف تھی''۔[19]

اس عجیب وغریب واقعہ نے ایک طرف تو بنگالیوں کو مشتعل کر دیا تھا تو دوسری جانب شیخ مجیب نے ''غیر مسلح لوگ'' اور ''بلا امتیاز'' فائرنگ کی اصطلاحات کے ساتھ اس کی تشریح کر کے خود کو سیاسی جوڑ توڑ کی پوزیشن کے لیے مضبوط تر کر لیا تھا۔ اور یہ سب کچھ ایسے حالات میں ہو رہا تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں مجیب کے الفاظ کو قانون کا درجہ حاصل تھا اور فوج اپنے بیرکوں تک محدود رہنے پر مجبور تھی۔ جوئے دیپور مارکیٹ میں درحقیقت کیا اور کیوں ہوا تھا؟ کیا ایک شخص کی ہلاکت ہوئی تھی یا بیس افراد مارے گئے تھے؟ اس سلسلے میں چار عینی شاہدین کے بیان کو ذیل میں قلم بند کیا جا رہا ہے:

ان چار میں سے دو ایسے بنگالی فوجی افسر ہیں جو بنگلہ دیش تحریک کے حامی تھے اور دو ایسے جو مغربی پاکستان اور متحدہ پاکستان کے حامی تھے۔ ان بیانات سے ہمیں ایسے واقعات کے ضمن میں مختلف شہادتوں کو سمجھنے میں خاطر خواہ مدد ملے گی جو ۲۵ روزہ ''مجیب دور حکومت'' کے دوران رونما ہوئے۔

ان بیانات میں پائے جانے والے تضادات ہمیں کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے میں مدد فراہم کرسکتے ہیں کہ کون سی بات صحیح، غلط یا تشریح طلب ہے۔ واقعہ سے متعلق زمینی حقائق کی بابت مرتب کی گئی تفصیلی دستاویزات بھی اس اہم تنازعے پر روشنی ڈالنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

جوئے دیو پور کا ''شاہی محل''۔ پاک فوج کی سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ (2EBR) جو ۵۷ بریگیڈ کا حصہ تھی، بیشتر بنگالی اہلکاروں اور افسران پر مشتمل تھی، اس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ سے کچھ فاصلے پر جوئے دیو پور میں ''راجبری'' (شاہی محل) میں تھا۔ حیرت انگیز طور پر، یہ بیسویں صدی میں بنگال کی سازشوں اور پراسرار واقعات میں سے ایک واقع بھوال سے تعلق رکھنے والے کمار کی موت کی افواہ اور چند برسوں بعد اس کی مبینہ واپسی کی خبر کا مرکز تھا۔[۲] ۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء کو 2EBR جوئے دیو پور ''راجبری'' میں اپنے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈیئر جہانزیب ارباب کے ظہرانے پر استقبال کی تیاریاں کر رہی تھی۔

گواہ نمبر 1: لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسین خان ،کمانڈنگ آفیسر 2EBR(بنگالی): مسعود الحسین لکھتے ہیں:

> 19 مارچ کو میرے افسر بریگیڈیئر جہانزیب ارباب جوئے دیو پور فوجی دستوں کی 8 سے 10 گاڑیوں کے ساتھ آئے۔ ان کے مطابق وہ ہماری صورتحال اور مسائل کے بارے میں جاننے کے لیے آئے تھے۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں فوجی دستوں کے ہمراہ آنے کی وجہ سے مجھے ان کے بات میں صداقت نظر نہیں آتی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں فوجیوں کا لایا جانا کسی سازش کا پیش خیمہ تھا۔ دراصل وہ ہمیں غیر مسلح کرنے کی غرض سے وہاں آئے تھے۔ مجھے کچھ دنوں سے محسوس ہو رہا تھا کہ اس قسم کا کوئی اقدام لیا جاسکتا تھا۔[۲]

لیفٹیننٹ کرنل مسعود لکھتے ہیں کہ رجمنٹ کے کل ۹۰۰ فوجیوں میں سے صرف ۲۵۰ ان کے پاس جوئے دیو پور میں موجود تھے۔ چار کمپنیوں میں سے ایک کمپنی کو غازی پور آرڈیننس فیکٹری کی حفاظت پر مامور کردیا گیا تھا۔ ہندوستان کی جارحیت کے پیش نظر دو کمپنیاں میمن سنگھ میں تعینات تھیں اور صرف ہیڈ کوارٹر کمپنی کو راج بری میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ کرنل صاحب کے خیال میں ان تمام باتوں کا اصل مقصد ہیڈ کوارٹر کو بنگالی فوجیوں سے خالی کروانا تھا۔ ان کے مطابق عام لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ بریگیڈیئر 2EBR کو غیر مسلح کرنے کی غرض سے وہاں آرہے تھے، اسی لیے لوگوں نے ٹونگی سے جوئے دیو پور تک تمام راستے میں رکاوٹیں کھڑی کررکھی تھیں۔ رکاوٹیں ہٹانے کی وجہ سے بریگیڈیئر ارباب کو جوئے دیو پور پہنچنے میں خاصا وقت بھی لگ گیا۔

ڈھاکہ واپس جاتے ہوئے ان کا راستہ مال گاڑی کی بوگی سے بند کردیا گیا تھا، جسے مقامی لوگوں نے گھسیٹ کر کراسنگ پر کھڑا کردیا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود لکھتے ہیں کہ بریگیڈیئر ارباب نے

انھیں رکاوٹیں ہٹانے کا حکم دیا اور کہا کہ ضرورت پڑنے پر بے پرواہ ہو کر لوگوں پر فائرنگ کی جائے۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود نے لفظ ''بے پرواہ'' کو اپنی کتاب میں کوٹیشن میں اس غرض سے لکھا ہے کہ اس سے پتہ لگ سکے کہ بریگیڈیئر ارباب کے منہ سے بعینہ یہی الفاظ نکلے تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل مسعود کے مطابق، بریگیڈیئر ارباب کو کچھ دیر بعد اس بات کا احساس ہوا کہ میں (مسعود) فائر کرنے میں پس و پیش سے کام لے رہا تھا، تو بریگیڈیئر نے دوسرے بنگالی افسر، میجر معین، سے فائر کھولنے کو کہا۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود لکھتے ہیں کہ میں نے میجر معین سے کہا کہ فائر اس طرح سے کرواؤ کہ گولیاں ''سروں کے اوپر یا پاؤں کے نیچے'' سے گزریں۔ یہ دیکھتے ہوئے مبینہ طور پر بریگیڈیئر نے اپنے فوجیوں کو فائر کھولنے کا حکم دے دیا۔ فوجیوں نے اپنی ''مشین گنوں'' سے فائر کھول دیئے۔ کچھ لوگ مارے گئے جبکہ باقی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مرنے والوں میں دو کا نام منو میاں اور خلیفہ تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود مزید لکھتے ہیں کہ ''اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ علاقے کے لوگ بھی پوری تیاری کے ساتھ شاٹ گنوں، رائفلوں، برچھیوں سے مسلح ہو کر آئے تھے۔ لیکن یہ تمام چیزیں مشین گنوں کا مقابلہ کتنی دیر تک کر سکتی تھیں؟''[۲۲] لیفٹیننٹ کرنل مسعود کہتے ہیں کہ بریگیڈیئر ارباب نے انھیں دھمکایا اور کہا کہ تمھیں اپنے جوانوں کو صحیح طرح سے احکامات دینے چاہئیں۔ ۲۳ مارچ کو لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو ڈھاکہ بلوا کر ان سے کمان واپس لے لی گئی۔ اس وقت تک ان کے سیکنڈ ان کمانڈ (2IC) ایک دوسرے بنگالی افسر، میجر سیف اللہ کو کمان سونپ دی گئی جب تک ایک تیسرے بنگالی افسر لیفٹیننٹ کرنل رقیب ۳۲ پنجاب کی کمان سے 2EBR کی کمان سنبھالنے نہیں پہنچ گئے۔

گواہ نمبر ۲: میجر کے ایم صفی اللہ، 2EBR,2IC (بنگالی): میجر جنرل (اس وقت کے میجر) کے ایم صفی اللہ، 2EBR,2IC رقم طراز ہیں:

> ۱۹ مارچ کو بریگیڈیئر جہانزیب ارباب خان کی قیادت میں ایک مضبوط فوجی دستہ ''جونیئر ٹائیگرز'' کو غیر مسلح کرنے کے لیے جوئے دیو پور کی طرف جا رہا تھا...... ایسی صورتحال سے نمٹنے کے لیے سیکنڈ بنگال کی تیاری نے بریگیڈیئر کو ایسے کسی اقدام سے باز رکھا اور وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کی واپسی کے راستے پر جوئے دیو پور کے عوام نے بڑی بہادری کے ساتھ ریلوے کراسنگ پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں، جس کے نتیجے میں زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور دو سویلین ہلاک ہوئے۔[۲۳]

میجر جنرل صفی اللہ کے مطابق ۱۹ مارچ کو صبح 10:00 بجے جوئے دیو پور میں تعینات ایک یونٹ کو بتایا گیا کہ بریگیڈ کمانڈر وہاں ٹھہرانے کے لیے آ رہے ہیں اور اس کے بعد وہ قریب ہی واقع

غازی پور آرڈیننس فیکٹری کا دورہ بھی کریں گے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ۱۷ مارچ تک مقامی لوگوں نے ٹونگی اور جوئے دیو پور کے درمیان پچاس کے قریب رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں۔ ان رکاوٹوں کا اصل مقصد مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کا رستہ روکنا تھا لیکن دراصل یہ رکاوٹیں بنگالی افسروں اور جوانوں کی سپلائی میں بھی رخنہ ڈال رہی تھیں۔ اس پر انھوں نے اور لیفٹیننٹ کرنل مسعود نے لوگوں سے بات کی لیکن رکاوٹیں وہیں کھڑی رہیں۔ فوجی جو بھی رکاوٹ ہٹاتے عوام اسے دوبارہ رکھ دیتے تھے۔

میجر جنرل صفی اللہ مزید لکھتے ہیں ''غازی پور میں بھی حالات انتہائی سنگین تھے۔ راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں تھیں اور آرڈیننس فیکٹری کے ڈائریکٹر، بریگیڈیئر کریم اللہ جو ایک مغربی پاکستانی تھے، کی رہائش گاہ کو ورکروں نے گھیر رکھا تھا۔ ہمیں فیکٹری کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کو وہاں سے نکالنے کی غرض سے فوجی دستہ بھیجنا پڑا''۔[۲۴]

میجر جنرل صفی اللہ کے مطابق دوپہر ۱۲ بجے 2EBR کو بریگیڈیئر ارباب کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا کہ آتے ہوئے انھوں نے راستے سے رکاوٹیں دور کردی ہیں اور وہ بھی اپنی طرف سے رکاوٹیں صاف کرنا شروع کردیں اور مخالفت کی صورت میں قوت کا بھرپور استعمال کریں۔'' تقریباً دوپہر 1:30 بجے بریگیڈیئر اپنی پوری جمعیت بشمول لیفٹیننٹ کرنل زاہد، بریگیڈ میجر ظفر، تین کپتانوں اور ستر کے قریب دیگر عہدوں کے فوجیوں کے ساتھ پوری شان وشوکت سے جوئے دیو پور پہنچے۔[۲۵] میجر صفی اللہ بڑی خصوصیات کے ساتھ ان افسران کا پس منظر بھی بیان کر رہے تھے جو بریگیڈیئر ارباب کے ساتھ وہاں آئے تھے...... ''لیفٹیننٹ کرنل اور ایک کپتان توپ خانے سے متعلق تھے۔ میجر کا تعلق بکتر بند دستے سے تھا۔ باقی دو میں سے ایک کپتان کا تعلق انفنٹری سے تھا جبکہ دوسرا کپتان کمانڈو تھا''۔ لیکن وہ اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ دستے میں اس انداز سے شامل فوجیوں کی ترکیب میں کیا غیر معمولی بات تھی۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ۷۰ جوان بے تحاشہ مسلح تھے اور ان کے پاس چینی ساختہ ۶۲ء ۷ ایم ایم لائٹ مشین گنیں تھیں؛ تاہم اس وقت فوجیوں کے پاس ان ہتھیاروں کا ہونا معمول کی بات تھی جیسا کہ میجر صفی اللہ آگے چل کر خود بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ بنگالی فوجیوں کے پاس بھی اسی قسم کے ہتھیار موجود تھے۔

صفی اللہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مناسب موقع پر بغاوت کرنے کے لیے ان کے جوان پوری طرح چوکنا تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بریگیڈیئر ارباب نے ان سے اس انتہائی تیاری کی بابت سوال بھی کیا تھا۔ شاید وہ ان کے ارادوں کو بھانپ گئے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے دوران یہ خبر ملی کہ مقامی لوگ بڑی تعداد میں ریلوے کراسنگ پر جمع ہوگئے تھے اور انھوں نے ٹرین کی ایک بوگی سڑک پر رکاوٹ کے طور پر کھڑی کردی ہے۔ بریگیڈیئر ارباب نے لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو رکاوٹیں ہٹانے اور ضرورت پڑنے پر ''بھرپور قوت'' کے استعمال کا حکم دیا۔ میجر معین الحسن کو ان کی کمپنی کے ہمراہ رکاوٹوں کی جانب روانہ کیا گیا جبکہ میجر صفی اللہ اسی جگہ باقی ماندہ جوانوں کے ساتھ موجود رہے۔ گوکہ انھوں نے ایسا کہا نہیں لیکن میجر صفی اللہ نے جو بھی کہا وہ لازماً انھوں نے میجر معین یا دیگر افراد سے سنا ہوگا۔

ان کے مطابق میجر معین نے لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح نہیں کیا گیا تھا۔ یہ عام یوم کار تھا اور لوگ تقریباً ۵۰،۰۰۰ کی تعداد میں جمع تھے۔ لیکن لوگوں نے نہ تو ان کی سنی اور نہ ہی عوامی لیگ کے رہنما کی اور نہ ہی وہاں موجود ایک مزدور رہنما کی۔ بریگیڈیئر ارباب نے وہاں پہنچتے ہی رکاوٹ کو ہٹانے کا حکم دیا ''...... اس پر مجمع مزید بگڑ گیا۔ بریگیڈیئر نے میجر معین کو ''فائر کھولنے'' کا حکم دے دیا'' اور ان سے اپنے کمانڈنگ آفیسر سے احکامات لینے کو بھی کہا۔

معاملات اس وقت مزید پیچیدہ ہوگئے جب دو بنگالی سپاہی، ایک ڈرائیور اور دوسرا اس کا مددگار، وہاں پہنچے اور انھوں نے بریگیڈیئر کو بتایا کہ لوگوں نے ان کی بری طرح پٹائی کی ہے اور ان میں سے پانچ افراد کا اسلحہ چھین کر ان کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ بریگیڈیئر ارباب کے احکامات ملتے ہی میجر معین نے اپنے سپاہیوں کو فائر کھولنے کے احکامات دے دیئے لیکن ساتھ ہی انھوں نے بنگالی میں کہہ دیا کہ ''نیچے فائرنگ کرو'' یا ''اوپر فائرنگ کرو''۔ میجر صفی اللہ (جو جائے وقوعہ پر موجود نہ تھے) کے مطابق ''بریگیڈیئر صاحب انتہائی غصے کے عالم میں چلا کر بولے 'مجھے ایک گولی کے بدلے ایک لاش چاہیے۔ اگر تم معاملات نہیں سنبھال سکتے تو میں اپنے جوانوں کو یہاں لگا دیتا ہوں'''۔

''جیسے ہی حالات خطرناک موڑ پر آتے ہوئے محسوس ہوئے میجر معین نے اپنے جوانوں سے مؤثر انداز میں فائر کرنے کو کہا''۔ جیسے گولی لگنے سے کوئی گرا، باقی افراد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ میجر صفی اللہ کے مطابق ''...... مجمعے کی طرف سے ہونے والی اِدھر اُدھر کی فائرنگ ہمارے کچھ جوان بھی زخمی ہوگئے تھے۔ چھینی گئی چینی ساختہ سب مشین گنوں سے بریگیڈیئر صاحب پر رکاوٹوں کے پیچھے اور مسجد کے اوپر سے فائر کیے گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔''

میجر صفی اللہ کے مطابق یہ جھڑپ تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی اور اس کے بعد ہجوم منتشر ہوا تو رکاوٹیں ہٹانے کے بعد بریگیڈیئر ارباب ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوگئے، جاتے ہوئے انھوں

نے ہدایات دیں کہ علاقے میں کرفیو لگا کر چھینے گئے ہتھیاروں کو بازیاب کرایا جائے اور چلائے گئے اسلحے اور جانی نقصانات سے متعلق رپورٹ انھیں پیش کی جائے۔" بریگیڈ کمانڈر صاحب کو بہت مایوسی ہوئی جب ہم نے صرف دو افراد کے ہلاک اور چند ایک کے زخمی ہونے کی رپورٹ انھیں پیش کی۔ بریگیڈیئر صاحب خوش نہ تھے۔ انھوں نے کہا 'صرف دو لوگوں کو مارنے کے لیے تریسٹھ گولیاں کیوں چلائی گئیں؟'"[۲۶]

میجر جنرل صفی اللہ کا خیال تھا کہ رکاوٹ والی جگہ پر اگر بنگالی افسران کو لوگوں سے نمٹنے دیا جاتا اور صبر اور معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا جاتا تو اس تصادم کی نوبت ہی نہ آتی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ عوام کی طرف سے گولی اپنے دفاع میں چلائی گئی۔ کیونکہ جوانوں کو گولی چلانے کے احکامات دے دیئے گئے تھے۔ اسی رات پانچ (بنگالی) بیٹ مین [اردلی] جو کہ بٹالین افسروں کی خدمات پر مامور تھے اپنے اسلحے سمیت فرار ہو گئے۔ اسی وجہ سے بالآخر لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو ہٹا کر لیفٹیننٹ کرنل رقیب کو تعینات کر دیا گیا، گو کہ وہ بھی ایک بنگالی افسر ہی تھے، لیکن صفی اللہ لیفٹیننٹ کرنل رقیب کو کافی معصوم بنگالیوں کے "قتل عام" کا مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ قتل عام یکم مارچ کو ۳۲ پنجاب کی کمانڈ کرتے ہوئے ڈھاکہ میں عوامی لیگ کے حامیوں کا کیا گیا۔ تاہم اس مبینہ واقعے کی تفصیلات موصوف نے بیان نہیں کیں۔

لیفٹیننٹ جنرل (بریگیڈیئر) جہانزیب ارباب نے کئی مرتبہ درخواست کرنے کے باوجود مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ میرے پاس آزاد ذرائع سے ان الزامات کے بارے میں کوئی توثیق موجود نہیں جو کہ باغی بنگالی افسران نے ان پر لگائے تھے۔ تاہم مغربی پاکستان سے متعلق نقطۂ نظر مجھے ان واقعات کے عینی شاہدین بریگیڈیئر کریم اللہ اور بریگیڈیئر (میجر) جعفر خان کے بیانات سے ملا۔ دونوں افراد بریگیڈیئر ارباب کو جانتے ہیں اور ان کے ساتھ کام کیا ہے نیز دونوں افراد غازی پور اور جوئے دیو پور میں ہونے والے واقعات کے عینی شاہدین میں سے ہیں۔

گواہ نمبر ۳: میجر جعفر خان، بریگیڈ میجر، ۵۷ بریگیڈ (مغربی پاکستانی):
میجر جعفر خان مارچ کے پہلے ہفتے میں ڈھاکہ پہنچے تھے اور انھوں نے بنگالی میجر خالد مشرف کی جگہ ۵۷ بریگیڈ میں بریگیڈ میجر کی ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔[۲۷] وہ بتاتے ہیں کہ میجر خالد مشرف ہیڈ کوارٹرز سے جانے میں پس و پیش سے کام لے رہے تھے۔ جن دنوں وہ ڈھاکہ پہنچے ان دنوں ڈھاکہ میں بہت سے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ اسی دوران جنرل ٹکا خان چارج سنبھالنے کے لیے آئے، جنرل یعقوب خان وہاں سے روانہ ہوئے اور شیخ مجیب نے رمنا ریس کورس میں ۷ مارچ کو اپنی

مشہور تقریر کی۔ ،جس میں صرف آزادی کے اعلان کی کسر باقی رہ گئی تھی۔15 مارچ کو صدر یحییٰ خان مذاکرات کے لیے ڈھاکہ تشریف لائے۔

بریگیڈئیر (میجر) جعفر کے مطابق ۵۷ بریگیڈ کے بریگیڈ کمانڈر، بریگیڈئیر ارباب، وہ خود اور ایک اور افسر جوئے دیو پور میں 2EBR کے دورے پر گئے تھے۔ان کے ہمراہ تقریباً تیس (۳۰) فوجی جوانوں کی پلاٹون تھی۔ دورہ کرنے والے افسروں اور جوانوں کی اس تعداد اور میجر جنرل صفی اللہ کی جانب سے بتائی گئی مذکورہ بالا تعداد میں بہت بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔

بریگیڈئیر (میجر) جعفر کے مطابق جوئے دیو پور کے اس دورے کا مقصد بنگالی یونٹ کا جائزہ لینا اور یہ دیکھنا تھا کہ حالات کس کروٹ جا رہے ہیں۔ ان کے مطابق وہ بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنے جا ہی نہیں سکتے تھے — کیونکہ سیاسی تعطل کو ختم کرنے کی غرض سے اعلیٰ ترین سطح پر مذاکرات جاری تھے اور صدر مملکت بذات خود شہر میں موجود تھے۔اگر بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنے کا کوئی ایسا منصوبہ ہوتا تو سب سے پہلے ڈھاکہ میں موجود یونٹوں کو غیر مسلح کیا جاتا۔جوئے دیو پور ڈھاکہ سے تقریباً بیس میل دور واقع ہے اور یہاں سے کارروائی شروع کرنا بعید از قیاس تھا۔

دورہ کرنے والے گروپ نے اپنے منصوبے کے عین مطابق ''راج بری'' میں دوپہر کا کھانا کھایا۔جب وہ واپس جانے لگے تو ریلوے کراسنگ پر رکاوٹوں کا معاملہ پیش آیا۔ وہاں سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بریگیڈئیر جعفر کے مطابق، ایسٹ بنگال کمپنی نے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے دورہ کرنے والے افسران کو اپنے جوانوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا پڑا، اور ہجوم کے منتشر ہونے کے بعد انھیں خود ہی بوگیوں کو ریلوے کراسنگ سے ہٹانا پڑا۔ مجمعے کی جانب سے بھی فوجیوں پر گولیاں چلائی گئیں یہ فائرنگ بیس منٹ سے آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔ مجمعے میں سے چند افراد زخمی ہوئے اور چند فوجی بھی زخمی ہوئے۔

جب پارٹی اپنے بیس (Base) میں ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کافی اشتعال پایا گیا،کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ بریگیڈ کمانڈر پر اپنی ہی ایک یونٹ کے دورے کے دوران حملہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں بریگیڈئیر ارباب نے بنگالی کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کی جگہ 32 پنجاب کی کمان کرنے والے ایک اور بنگالی افسر لیفٹیننٹ کرنل رقیب کو تعینات کر دیا گیا۔ اس طرح مسعود کو کمان سے ہٹا دیا گیا اور رقیب کو ڈھاکہ سے باہر بھیج دیا گیا۔[۲۸]

گواہ نمبر۴: بریگیڈئیر کریم اللہ ،ریزیڈنٹ ڈائریکٹر، غازی پور آرڈننس فیکٹری (مغربی پاکستانی): روزنامچے میں درج بریگیڈئیر کریم اللہ کے پہلے ہی اندراج سے

مارچ ۱۹۷۱ء میں غازی پور آرڈیننس فیکٹری کے ماحول کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

۲ مارچ ۱۹۷۱ء

9 بج کر 15 منٹ پر ۳،۰۰۰ کے لگ بھگ افراد POF فیکٹری میں داخل ہوئے۔ یہ افراد POF فیکٹری کے ورکروں کو باہر نکالنے کی غرض سے وہاں آئے تھے۔ میں نے MODC کی مدد سے بزورِ قوت انھیں باہر دھکیل دیا۔ اس دن ڈھاکہ کے سوا کسی جگہ ہڑتال نہ تھی۔ مجھے باہر جانے سے روکنے کے لیے چورستہ تک تینوں اطراف سے سڑک کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی اور لوگ برچھیوں، کمانوں اور تیروں کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ مجھے ایک پنجابی بریگیڈ ئیر ہونے کے ناطے واجب القتل قرار دیا جا چکا تھا۔[۲۹]

روزنامچے کے مطابق غازی پور فیکٹری میں وہ سارا دن انتہائی تشویش اور پریشانی کے عالم میں گزرا۔ بنگالی فوجی اور فیکٹری کے ورکر بھی احتجاج کرنے والوں کے ساتھ مل گئے اور بریگیڈ ئیر کریم اللہ، دیگر مغربی پاکستانی اور بہاری افسروں کے سر قلم کرنے کے نعرے لگاتے رہے۔ تمام غیر بنگالی افسران اور ان کے خاندان انتہائی خوف کے عالم میں تھے، راشن موجود نہ تھا اور فیکٹری بھی بند تھی کیونکہ بنگالی 2:00 بجے کے بعد بھی کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ شیخ مجیب نے روزانہ کی بنیاد پر 2:00 بجے تک ہڑتال کرنے کے احکامات دے رکھے تھے۔ بریگیڈ ئیر کریم اللہ بنگالی اسٹاف اور ورکروں سے نہ ختم ہونے والے مذاکرات، فیکٹری اور لوگوں کی حفاظت کے لیے اضافی فوجی دستوں کی درخواست کرنے اور بحران کو کسی طرح ختم کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے۔

۸ مارچ کو فیکٹری ورکروں نے ''سنگرام پریشاد'' جدوجہد کمیٹیاں، ترتیب دیں اور عوامی لیگ کے لیے کام کرنے کی ٹھان لی۔ انھوں نے کسی بھی فرد کو فیکٹری کے احاطے سے باہر نکلنے تک کی اجازت نہ دی۔ مقامی بینک مغربی پاکستانیوں اور دیگر غیر بنگالیوں کے چیک کیش کرنے سے گریزاں تھے۔ بریگیڈ ئیر کریم کو کام سے ڈھاکہ جانے کے لیے ہیلی کاپٹر کی ضرورت تھی اور جب تک انھیں واپس لانے کا کوئی رستہ تلاش نہیں کر لیا گیا وہ وہیں پھنسے رہے۔ ۱۴ مارچ کو انھوں نے 2EBR کے بنگالی کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو انھیں وہاں سے نکالنے پر راضی کر لیا تھا لیکن مسعود کی یہ شرط تھی کہ اس بات کا کسی کو بھی پتہ نہ چلنے پائے۔ ائیر پورٹ کا منظر یہ تھا کہ پاکستانی اور غیر بنگالی خاندان مشرقی پاکستان میں موجود اپنی تمام املاک کو خیر باد کہہ کر وہاں پناہ گزین ہو چکے تھے اور کسی بھی قیمت پر وہاں سے نکلنے کے خواہاں تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ انھیں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے مناظر یاد آ گئے۔ فیکٹری کے اندر بھی مغربی پاکستانی اور بہاری خاندانوں نے بریگیڈ ئیر صاحب سے اپنی جانوں کو لاحق خطرات کا اظہار کرتے ہوئے ان سے التجا کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح انھیں مغربی

پاکستان بھیج دیا جائے۔

۱۷ مارچ تک بریگیڈیئر کریم اللہ عوامی لیگ کے تحت بنائی جانے والی نجی فوج ''سچا سیوک باہنی'' سے بھی واقف ہو چکے تھے۔ ایک عام بنگالی بھی ان دنوں برچھی اٹھائے پریڈ کرتا دکھائی دیا کرتا تھا لیکن اس نجی فوج کے کارکنوں کے پاس برچھیوں کے علاوہ شاٹ گنیں بھی تھی۔ ''سنگرام پریشاد'' نامی تنظیم کے لوگ مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالی افراد کو روکنے پر مامور تھے۔ تاہم سیاسی جلسوں میں شرکت کرنے کی خاطر بنگالی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے جایا کرتے تھے۔

۱۸ مارچ کی صبح بنگالی افسروں اور ورکروں سے لدی نو بسیں ایک جلسے میں شرکت کے لیے جوئے دیو پور روانہ ہوئیں۔ بعدازاں بریگیڈیئر کریم اللہ کو اطلاع ملی کہ جوئے دیو پور میں موجود بنگالی بٹالین کو غیر مسلح کیا جا رہا ہے، اور مذکورہ نو بسوں میں سوار افراد اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنے گئے ہیں۔ یہ لوگ بنگالی کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل مسعود سے اظہار یکجہتی کرنے اور اسے یہ کہنے گئے تھے کہ وہ کسی بھی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں۔ انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی ٹیلی فون لائنیں کاٹ دی گئی ہیں۔

اسی شام جبکہ ٹیلی فون لائنیں کٹی ہوئی تھیں بریگیڈیئر کریم اللہ نے، لیفٹیننٹ کرنل مسعود سے وائرلیس پر بات کی: ''لیفٹیننٹ کرنل مسعود نے اس بات کی توثیق کی کہ ایسے (غیر مسلح کرنے کے) کوئی احکامات جاری نہیں کیے گئے اور یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی بنیاد پر ہو رہا تھا۔ معلوم کچھ یوں ہوتا ہے کہ بٹالین کے پاس پرانی 0.303 کی رائفلیں اور ایل ایم جی تھیں۔ جب انھیں چینی ساختہ نیا اسلحہ فراہم کر دیا گیا تو ان سے پرانا اسلحہ واپس کرنے کو کہا گیا، چونکہ ہر جگہ ٹیلی فون ٹیپ کیے جا رہے تھے اس لیے عام لوگوں تک بات اس طرح پہنچائی گئی کہ بنگالی بٹالین ہونے کی وجہ سے اسے غیر مسلح کیا جا رہا ہے''۔

بٹالین کو ممکنہ طور پر ''غیر مسلح'' کیے جانے سے بچانے کے لیے بنگالیوں نے جوئے دیو پور — ڈھاکہ روڈ پر رکاوٹیں رکھ دیں تھیں اور ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والی سڑک بھی بند کر دی تھی۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود کہتے ہیں کہ ''خود مجھے بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادگی ظاہر کرنے پر ایک بنگالی غدار گردانا گیا۔ کیونکہ میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سامراجیوں کے سامنے سر جھکا رہا تھا۔'' لیفٹیننٹ کرنل مسعود کہتے ہیں کہ انھوں نے عوام کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنے کی غرض سے مقامی رہنماؤں کو بلوایا تھا اور افواہوں کی بیخ کنی کے لیے پولیس سے بھی مدد طلب کی تھی، لیکن حالات قابو میں آنے میں کافی وقت صرف ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسری جانب کسی بھی رکاوٹ سے آرمی کی

گاڑیوں کو گزرنے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی اور راشن بھی تقریباً ختم ہونے والا تھا۔ان کے سیکیورٹی سیکشن کے ایک ''صوبے دار'' نے انھیں بتایا کہ جوئے دیو پور میں، ''راج بری''، کو اس دن ہزاروں لوگوں نے حصار میں لے لیا تھا اور بنگالی کمانڈنگ آفیسر کو انھیں غیر مسلح کیے جانے کی افواہ کے بارے میں سمجھانے میں اچھا خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔

۱۹ مارچ کو دوپہر 11:55 پر بریگیڈیئر کریم اللہ کو کمانڈنگ آفیسر 2EBR لیفٹیننٹ کرنل مسعود کی جانب سے وائرلیس پر ایک کال موصول ہوئی، انھوں نے بریگیڈیئر کریم اللہ کو بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر جہانزیب ارباب کی جانب سے ظہرانے کی دعوت دی جو انھوں نے قبول کرلی۔

1310 بجے وہ اپنے تین مسلح محافظوں کے ساتھ خود گاڑی چلاتے ہوئے جوئے دیو پور کے لیے روانہ ہوئے۔ گیٹ پر انھیں ''سنگرام پریشاد'' کے لوگوں نے روک لیا اور ظہرانے میں شریک ہونے کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔انھوں نے کہا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق پنجابی یا بلوچ رجمنٹس جوئے دیو پور پہنچنے والی ہیں اور تمام لوگ انھیں روکنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ بریگیڈیئر کریم اللہ نے ارادہ ترک کردیا اور 2EBR کو وائرلیس کے ذریعے پیغام بھجوا دیا کہ ان کا شرکت کرنا ممکن نہ تھا۔

1340 بجے فیکٹری کے تمام ہوٹر اور سائرن ایک ساتھ بجنے لگے۔گیٹ سے باہر بریگیڈیئر کریم اللہ نے دیکھا کہ لوگوں کا ایک ہجوم برچھیاں اور ڈنڈے لیے فیکٹری کی جانب دوڑتا ہوا آرہا ہے، ان میں سے چند لوگ 12 بور، 0.22 اور دیگر قسم کی بندوقوں سے بھی لیس تھے۔ ان لوگوں کو بذریعہ ''سنگرام پریشاد'' اطلاع ملی تھی کہ بلوچ اور پنجابی رجمنٹس 2EBR کو غیر مسلح کرنے اور آرڈیننس فیکٹری کا انتظام سنبھالنے کے لیے آرہی تھیں اور وہ انھیں روکنا چاہتے تھے۔

جب بریگیڈیئر کریم اللہ نے لیفٹیننٹ کرنل مسعود سے دوبارہ رابطہ کیا تو پتہ چلا کہ درحقیقت بریگیڈیئر ارباب ان کی بٹالین کا دورہ کرنے کے لیے آرہے ہیں اور وہیں دوپہر کا کھانا بھی کھائیں گے۔جس میں وہ خود بھی مدعو تھے اور یہ کہ آنے والا فوجی دستہ اپنے رستے سے رکاوٹیں بھی ہٹا رہا تھا۔

۱۰ منٹ بعد بریگیڈیئر جہانزیب ارباب سے وائرلیس سیٹ پر میرا رابطہ ہوا۔انھیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ میں ان کے ساتھ کھانے پر شریک نہیں ہوسکوں گا۔ بہرحال ڈھاکہ واپسی پر انھوں نے POFs میں مجھ سے ملنا تھا۔ جوئے دیوپور روڈ پر مین چورستہ کے مقام پر جوانوں سے بھرے ۱۰ یا ۱۲ ٹرکوں کے ساتھ (جیسا کہ بتایا جاتا ہے) ان کے گزرنے کی وجہ سے ہمارے علاقے کے لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اگر وہ واقعی POFs آتے ہیں تو ان کے ساتھ کیا کریں گے؟ اس نے مذاقاً کہا! میرا مطلب آج یا ہمیشہ کے لیے؟ میں

نے ان سے کہا کہ میں آج کی بات کر رہا ہوں؛ البتہ وہ حالات ٹھیک ہونے کے بعد آئیں تو میں انھیں خوش آمدید کہوں گا۔

بریگیڈیئر کریم اللہ اپنے ورکروں کو اصل صورتحال سے آگاہ کرنے کے لیے گیٹ پر چلے گئے۔ دوسری جانب ''سنگرام پریشاد'' کے لوگوں نے بھی 2EBR فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ یہ معمول کا ایک دورہ اور ظہرانہ تھا۔ بریگیڈیئر کریم اللہ کہتے ہیں کہ انھوں نے بریگیڈ کمانڈر سے اس دن اپنے دورے کو ملتوی کرنے کو کہا تھا اور وہ 2EBR کو غیر مسلح کرنے کی غلط افواہ کو بھی زائل کرنے کی کوششیں بھی کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ورکروں سے کہا کہ وہ لوگ جوئے دیوپورنہ جائیں اور دورے پر آنے والی یونٹ کو بلا روک ٹوک واپس ڈھاکہ جانے دیں۔

1610 بجے بریگیڈیئر کریم اللہ نے 2EBR سے رابطہ کیا تو 2IC (میجر صفی اللہ) سے یہ جان کر انھیں شدید پریشانی لاحق ہوئی کہ بریگیڈیئر ارباب اور ان کے دستے کو جوئے دیوپور مارکیٹ کے قریب روک لیا گیا ہے اور وہاں فائرنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ چند منٹوں میں ہی ایک مرتبہ پھر سائرن بجنے کی آوازیں آنے لگیں اور مسلح افراد ادھر ادھر دوڑتے ہوئے نظر آنے لگے، کیونکہ ان کو اطلاع مل گئی تھی کہ جوئے دیوپور میں فائرنگ ہو رہی ہے۔ سراپا احتجاج افراد فیکٹری کے احاطے میں آ کر اسلحہ اور سائرن کا مطالبہ کرنے لگے۔ بریگیڈیئر کریم اللہ نے انھیں سائرن تو دے دیا لیکن ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر کسی بھی شخص نے فیکٹری کی جانب جانے کی کوشش کی تو اس پر گولی چلا دی جائے گی۔ 17:50 بجے میجر صفی اللہ نے اطلاع دی کہ دورے پر آنے والا فوجی دستہ ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو چکا ہے اور جوئے دیوپور میں کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس رات بریگیڈیئر کریم اللہ اپنے بستر کے نیچے M-16 رائفل اور تکیے کے نیچے 0.25 پستول رکھ کر سوئے تھے۔

اسی شام سیکیورٹی سیکشن کے صوبیدار عزیز نے بریگیڈیئر کریم اللہ کو دورے پر آنے والے فوجی دستے کے ساتھ جوئے دیوپور میں ہونے والے واقعات کی روداد سنائی۔ یہ ایک عام کاروباری دن تھا اس لیے لوگوں کا رش ہونا معمول کی بات تھی۔ عوامی لیگ کے رہنما جناب حبیب اللہ کے اکسانے پر کہ بلوچ رپنجابی رجمنٹس بنگالی بٹالین کو غیر مسلح کرنے آ رہی ہیں، ہزاروں افراد احتجاج کے لیے پہنچ گئے۔ جوئے دیوپور پہنچ کر حبیب اللہ کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہونے جا رہا تھا— بریگیڈ کمانڈر معمول کے مطابق اپنی یونٹ کا دورہ کرنے اور ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے آئے تھے۔ عوامی لیگ کے نمائندے نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی، لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ مشتعل ہجوم نے کسی کی بات نہیں سنی اور مال گاڑی کو دھکیل کر ریلوے کراسنگ کی

ناکہ بندی کر دی۔

جب بریگیڈیئر ارباب ڈھاکہ واپس جانے کے لیے اپنے دستے کے ہمراہ وہاں پہنچے تو 2EBR کے بنگالی کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل مسعود نے رکاوٹیں ہٹانے کے لیے لوگوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ جب فوجی جوان اپنی مدد آپ کے تحت ریلوے بوگی کو راستے سے ہٹانے لگے تو مجمعے کی جانب سے گولی چلا دی گئی، جوابی کارروائی کے طور پر ایسٹ بنگال رجمنٹ کی طرف سے بھی فائر کیا گیا اور دو افراد ہلاک ہو گئے۔ ایسٹ بنگال کی راشن لے جاتے والی گاڑی پر بھی لوگ حملہ آور ہوئے اور اس واقعہ میں بھی ایک شخص کی ہلاکت ہوئی۔ لوگوں نے چھ بنگالی فوجیوں کو اسلحہ سمیت اغوا کر لیا۔

اگلی صبح 2EBR کے 2IC میجر شفیع اللہ غازی پور آئے اور اطلاع دی کہ کرفیو کا دائرہ کار غازی پور تک بڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی کیا جا رہا تھا کہ چھینا گیا اسلحہ فیکٹری ورکروں کے پاس تھا اور چینی ساخت ایک رائفل بازیاب بھی کر لی گئی تھی۔ بریگیڈیئر کریم اللہ کو یہ بھی بتلایا گیا کہ 2EBR کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل مسعود آدھی رات کو آئے تھے اور فیکٹری کے دروازوں کے آگے سے رکاوٹیں ہٹانے کے بعد انھوں نے صوبیدار کو ہدایات بھی دیں۔

۲۱ مارچ کو لیفٹیننٹ کرنل مسعود دوبارہ فیکٹری آئے اور بریگیڈیئر کریم اللہ سے جوئے دیو پور فائرنگ کے واقعہ پر تبادلہ خیال کیا: "یوں لگتا ہے ایسٹ بنگال کے جوان ریلوے بوگی کو دھکیل رہے تھے تو ان پر نہ صرف شاٹ گنوں بلکہ 0.25 رائفلوں اور ایک بھاری رائفل اور خودکار ہتھیاروں (ممکنہ طور پر اسٹین گن) سے بھی فائر کیے گئے۔ صرف اسی صورت میں فوجیوں نے اپنے دفاع میں فائر کھولا۔ اس سے قبل تقریباً پون گھنٹہ انھوں نے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ فوجی دستے کو بلا روک ٹوک واپس جانے دیا جائے لیکن تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔

جوئے دیو پور واقعہ پر تبصرہ۔ جوئے دیو پور سے متعلق واقعات کے بارے میں مذکورہ بالا چاروں گواہوں کے بیانات میں سب اہم بات وہ نکات ہیں جن پر دونوں اطراف سے اتفاق پایا جاتا ہے: ۱۹ مارچ ۱۹۷۱ء کو بریگیڈیئر ارباب، کمانڈر ۵۷ بریگیڈ، اپنی بریگیڈ کے ایک حصے 2EBR کے دورے پر تشریف لائے۔ جوئے دیو پور آتے ہوئے انھیں راستے سے کئی رکاوٹیں ہٹانا پڑیں جو مقامی لوگوں نے انھیں وہاں آنے سے روکنے کی غرض سے رکھی تھیں۔ لوگوں نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ انھیں اطلاع ملی تھی کہ بنگالی دستے 2EBR کو غیر مسلح کیا جا رہا ہے؛ بریگیڈیئر ارباب اور ان کے دستے نے دوپہر کا کھانا بٹالین ہیڈ کوارٹر میں کھایا اور ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ واپسی پر جوئے

دیوپور بازار میں مسلح افراد ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور ریلوے کراسنگ کو ریلوے بوگیوں سے بند کردیا۔ بنگالی بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر اور ان کے ماتحت افسران لوگوں کو ان کے عزائم سے باز رکھنے میں ناکام رہے؛ عوامی لیگ کے مقامی رہنما بھی جو اس غلط فہمی کی بنیاد پر کہ بٹالین کو غیر مسلح کیا جارہا ہے لوگوں کو وہاں اکٹھا کرلائے تھے، لوگوں کو سمجھانے میں ناکام رہے؛ فوج اور عوام دونوں نے ایک دوسرے پر فائرنگ کی؛ دو افراد ہلاک ہوئے۔ ایک اور متعلقہ واقعے میں لوگوں نے جوئے دیوپور کی طرف آنے والے بنگالی فوجیوں کے ایک گروپ پر حملہ کیا، ان سے اسلحہ چھینا اور انھیں اغوا کرلیا؛ فائرنگ کا تبادلہ تقریباً آدھ گھنٹے تک جاری رہا؛ دو افراد کی ہلاکت کے بعد لوگوں کا ہجوم منتشر ہوگیا۔ فوجیوں نے بوگی کو راستے سے ہٹا دیا اور دورے پر آئے والا فوجی دستہ ڈھاکہ واپس روانہ ہوگیا۔ نتیجتاً 2EBR کے بنگالی کمانڈنگ آفیسر کو معزول کر کے ان کی جگہ ایک اور بنگالی افسر کو چارج دے دیا گیا۔

ان بیانات سے وہ دعوے بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں جنھیں ہم جھوٹ پر مبنی کہہ سکتے ہیں: شیخ مجیب الرحمٰن کے دعوے کے برعکس، جوئے دیوپور میں جمع ہونے والا ہجوم نہتا نہیں تھا بلکہ تمام بیانات بشمول بنگالی افسران کے بیانات سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ وہ لوگ مختلف قسم کے اسلحہ سے لیس تھے۔ اس واقعے میں صرف فوج نے ہی عوام پر فائرنگ نہیں کی تھی بلکہ ہجوم کی طرف سے بھی فوج پر فائرنگ کی گئی تھی اور جوئے دیوپور آنے والے بنگالی فوجیوں پر بھی حملہ کیا گیا تھا۔ بنگالی 2IC 2EBR، میجر صفی اللہ جن پر بغاوت کی منصوبہ بندی کا الزام بھی تھا، کے بیان کے مطابق چھینی گئی چینی ساختہ سب مشین گن سے بریگیڈیئر ارباب پر فائرنگ کی گئی تھی۔ فوج کی جانب سے کی جانے والی فائرنگ کو ہم ''بلاامتیاز فائرنگ'' نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ مسلح اور متشدد ہجوم کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کرنے پر کی گئی تھی، اس ہجوم نے نہ صرف بنگالی افسروں بلکہ خود عوامی لیگ کے رہنما کی بات سننے سے بھی انکار کردیا تھا جس نے خود اس ہجوم کو اکٹھا کیا تھا۔ اگر رکاوٹیں کھڑی نہ کی جاتیں، یا درخواست کرنے پر ہٹالی جاتیں، تو ایسا کوئی واقعہ رونما ہی نہ ہوتا۔ اگر اشتعال دلایا بھی گیا تو بنگالی قوم پرست رہنماؤں کی جانب سے دلایا گیا تھا جنھوں نے مقامی لوگوں کو یہ کہہ دیا تھا کہ ایک بنگالی بٹالین کو غیر مسلح کیا جارہا تھا۔ اس کے علاوہ عوامی لیگ کے دعووں کے برعکس، بیس ہلاکتیں نہیں ہوئی تھیں — اس واقعہ میں صرف دو افراد مارے گئے تھے اور باقی افراد غالباً کسی غیر متعلقہ گاڑی پر حملے کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔

اختلاف کے بنیادی نکات یہ تھے کہ کتنے افسران اور جوان اس دن وہاں دورے پر آئے تھے اور ان کے آنے کا اصل مقصد کیا تھا۔ مخصوص الفاظ جو بریگیڈیئر ارباب نے ادا کیے اور ان کی

تشریح بھی متنازع امور میں سے ہے۔ جہاں تک دورے پر آنے والی پارٹی میں فوجیوں کی تعداد کا معاملہ ہے تو یہاں ہمیں براہ راست تضاد دیکھنے کو ملتا ہے: میجر (میجر جنرل) صفی اللہ، 2EBR کے بنگالی 2IC کے دعوے کے مطابق بریگیڈ کمانڈر دیگر پانچ افسران اور ستر جوانوں کے ہمراہ وہاں آئے تھے، جبکہ میجر (بریگیڈئیر) جعفر، ۵۷ بریگیڈ کے مغربی پاکستانی بریگیڈ میجر، کے مطابق دو افسران اور تیس جوان وہاں آئے تھے۔

بنگالی افسران دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی آمد کا مقصد بنگالی فوجیوں کو غیر مسلح کرنا تھا، گو کہ غیر مسلح کرنے کا کوئی واقعہ رونما نہ ہوا؛ جبکہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران کا کہنا ہے کہ یہ معمول کا ایک دورہ تھا جس میں بٹالین کو چیک کیا جانا تھا (اور، درحقیقت، غازی پور آرڈیننس فیکٹری کے حالات کا جائزہ لینا بھی مقصود تھا)۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ دورہ معمول سے بڑھ کر کسی اور مقصد کے لیے تھا اور انھیں یہ جاننا مقصود تھا کہ بنگالی فوج کس حد تک قابل بھروسہ ثابت ہو سکتے ہیں تب بھی عقل کی کسوٹی پر یہ بات پوری نہیں اترتی کہ یہ لوگ بنگالی بٹالین کو غیر مسلح کرنے کی غرض سے وہاں آئے تھے۔

بنگالی افسران کے اپنے بیانات کے مطابق، بنگالی بٹالین کی صرف ایک کمپنی جوئے دیو پور میں موجود تھی۔ یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ دارالخلافہ سے بیس میل دور جوئے دیو پور بریگیڈ کمانڈر صرف ایک یونٹ کو غیر مسلح کرنے کے لیے آئیں جبکہ بذات خود ڈھاکہ میں یا کسی اور جگہ کسی بنگالی یونٹ کو غیر مسلح نہیں کیا جا رہا تھا۔ ڈھاکہ میں صدر مملکت اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان سیاسی حل کے لیے مذاکرات جاری تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود کہتے ہیں کہ ان کے پاس ''صرف'' ۲۵۰ جوان جوئے دیو پور میں موجود تھے، اور یہ کہ بریگیڈیئر صاحب ایک بہت بڑی نفری کے ساتھ وہاں آئے تھے نیز یہ کہ ان کی نفری پوری طرح مسلح بھی تھی۔ لیکن آنے والی پارٹی میجر جعفر کے مطابق تیس اور میجر صفی اللہ کے مطابق (۷۰) ستر جوانوں پر مشتمل تھی اور ان کے پاس معمول کے مطابق ہتھیار تھے۔ تو کسی بھی لحاظ دیکھا جائے تو بنگالی فوجی نہ صرف تعداد میں دورے پر آنے والے فوجیوں سے زیادہ تھے بلکہ ان کے مقابلے میں زیادہ مسلح بھی تھے۔ البتہ میجر صفی اللہ یہ بیان بھی دیتے ہیں کہ ان کی غیر معمولی تیاری کو دیکھ کر بریگیڈئیر ارباب نے جوئے دیو پور پہنچ کر انھیں غیر مسلح کرنے کا ارادہ بدل لیا تھا۔ حقائق سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ بریگیڈئیر ارباب حالات کا جائزہ لینے کے لیے وہاں آئے تھے اور جوئے دیو پور میں ہونے والے تجربے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ بٹالین میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ بنگالی کمانڈنگ آفیسر کو، جو نہ تو عوام کو سمجھانے میں اور

نہ ہی کنٹرول کرنے میں کامیاب رہے، ایک دوسرے بنگالی کمانڈنگ افسر ہی سے تبدیل کر دیا گیا۔
بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ جنرل) ارباب کے مبینہ احکامات، کہ "زیادہ سے زیادہ قوت" کا استعمال کیا جائے اور "موثر انداز سے" فائر کیا جائے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ارباب صاحب نے مجھے اپنا موقف بتانے اور اسے زیر اشاعت لانے سے معذرت کر لی تھی۔ بریگیڈیئر (میجر) جعفر خان، جنھوں نے ان کے ساتھ نہ صرف سروس کی ہے بلکہ اس دن جوئے دیو پور میں بھی ان کے ساتھ تھے، نے مجھے بتایا کہ بریگیڈیئر ارباب نے انھیں سامنے آنے کو کہا تھا۔ ایک اور مغربی پاکستانی افسر کے مطابق جنھوں نے بریگیڈیئر ارباب کے ساتھ مشرقی پاکستان میں خدمات انجام نہیں دی تھیں، وہ ایک "بے رحم" انسان ہیں۔

مختلف کمانڈر اس نوعیت کے بحرانوں سے نمٹنے کے لیے مختلف طریقہ کار اپنا سکتے ہیں جیسا کہ اس دن جوئے دیو پور میں ہوا، لیکن اس واقعہ کے بعد بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ جنرل) ارباب کا بنگالی کمانڈنگ آفیسر کو معزول کرنا غلط اقدام نہیں گردانا جا سکتا۔ جہاں تک ان کے اس مبینہ بیان کا تعلق ہے کہ وہ بنگالی افسران سے محض دو ہلاکتوں کے لیے تریسٹھ گولیاں چلانے پر ناخوش تھے اس کی تشریح میجر صفی اللہ اس طرح کرتے ہیں کہ وہ تریسٹھ گولیوں کے بدلے تریسٹھ ہلاکتوں کے خواہاں تھے جبکہ ان الفاظ کی دیگر تشریحات بھی ممکن ہیں: آخر کار دو ہلاکتوں کے لیے تریسٹھ گولیوں کا چلایا جانا ایک عجیب بات تو تھی ہی۔

غالباً، بنگالی افسران دورے پر آنے والے فوجی دستے اور بالخصوص بریگیڈیئر ارباب کے کردار کو ممکنہ طور پر منفی انداز سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ایک جانب تو وہ خود کو بنگلہ دیش کی آزادی کے سپاہی کے طور پر پیش کر سکیں اور دوسری جانب خفیہ طور پر بنگلہ دیش کی آزادی کی خاطر پاکستان آرمی میں بھی خدمات سر انجام دیتے رہیں۔ میجر صفی اللہ کا یہ دعویٰ کہ بنگالی افسران طاقت کا استعمال کیے بغیر صورتحال کو سنبھال سکتے تھے غیر معتبر ہے کیونکہ انھوں نے خود بتایا کہ کس طرح بنگالی افسران نے مجمع کو سنبھالنے کی کوشش کی اور ناکام ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک روز قبل بھی انہوں نے لوگوں کو رکاوٹیں رکھنے سے باز رہنے کو کہا تھا لیکن لوگوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ حتیٰ کہ لوگوں کا ہجوم عوامی لیگ کے رہنماؤں کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ لوگوں کا ہجوم مشتعل اور مسلح تھا اور آنے والی ہر گاڑی حتیٰ کہ بنگالی سپاہیوں پر بھی حملہ آور ہو رہا تھا تاکہ ان سے بھی اسلحہ چھینا جا سکے۔

بلاشبہ صوبے بھر میں پھیلی ہوئی لاقانونیت کی محض ایک جھلک ہمیں جوئے دیو پور کے واقعہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک جانب تو عوامی رہنماؤں نے لوگوں کو اشتعال دلا رکھا تھا اور دوسری جانب

فوجی حکمرانوں سے اقتدار کے حصول کے لیے مذاکرات میں مشغول تھے۔ پہلے سے مسلح افراد بنگالی قوم پرست رہنماؤں کی اس افواہ سے کہ جوئے دیو پور میں بنگالی بٹالین کو غیر مسلح کیا جا رہا ہے اور زیادہ مشتعل ہو گئے۔ جب تک یہ افواہ غلط ثابت ہوئی پانی سر سے گزر چکا تھا اور ہجوم خود اپنے ہی اشتعال انگیز رہنماؤں اور (مسلح) بنگالی بٹالین کے قابو سے بھی باہر ہو چکا تھا۔ تصادم میں بہت سے عام شہری ہلاک ہوئے۔ عوامی لیگ کے رہنماؤں نے اصل ہلاکتوں سے دس گنا زیادہ تعداد کے ساتھ اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ نیز قوم پرستی کے بے بنیاد دھارے میں بہتے ہوئے اسی قسم کے مزید بے بنیاد بیانات بھی داغ دیئے گئے جیسا کہ فوج پر غیر مسلح افراد کو بلا اشتعال و بلا امتیاز گولیوں کا نشانہ بنانے کا الزام لگایا گیا۔ پھر ان ہی واقعات کا سہارا لے کر شیخ مجیب الرحمن نے پورے پاکستان کا وزیر اعظم بننے کے لیے اپنی سیاسی پوزیشن کو بھی استحکام بخشنے کی کوشش کی۔

باب سوم :

فوجی اقدام

ڈھاکہ میں ''آپریشن سرچ لائٹ''

''۲۵مارچ ۱۹۷۱ء کی رات اس لیے بھی اتنی نووارد بنگلہ دیشی قوم کی تاریخ میں زندہ رہے گی کہ یہ رات ان کے لیے کسی نیک نامی کا باعث نہ تھی۔''

— آرچر بلڈ، ڈھاکہ میں امریکی قونصل جنرل (جون ۱۹۷۱ تک)[1]

''محترم جناب صدر بتانے کے لیے کوئی قابل ذکر واقعات نہیں ہیں — بظاہر یحییٰ نے مشرقی پاکستان کے حالات کو قابو میں کرلیا ہے۔''

— ہنری کسنجر بنام رچرڈ نکسن، ۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء[2]

پاکستان کی فوجی حکومت نے بالآخر ۲۵-۲۶ مارچ کی درمیانی رات ایک سیاسی مسئلے کو فوجی طریقے سے حل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کہا جاسکتا ہے کسی بھی لحاظ سے یہ مسئلے کا موزوں حل نہ تھا اور بالآخر یہی فیصلہ پاکستان کے لیے تباہی کا باعث بنا۔ اولاً ایک شدید خونی خانہ جنگی اور پھر بھارت کے ساتھ ایک باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوگیا اور بنگلہ دیش نے بطور آزاد ریاست جنم لیا۔ مشرقی پاکستان کی عوام کے لیے یہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس کا مداوا ہونا ابھی باقی ہے جبکہ نومولود ریاست میں بہت سے بنگالیوں کے نزدیک پاکستان کے خلاف نفرت کے جذبات ہی ان کے زخموں کو بھر سکتے ہیں۔

اس آپریشن کو کس شے سے مہمیز ملی، یہ بات واضح نہ ہوسکی۔ آخری وقت یعنی 25 مارچ تک

سیاسی مذاکرات جاری تھے، جب صدر یحییٰ اچانک ہی ڈھاکہ سے روانہ ہو گئے۔ بعض لوگ مذاکرات کی ناکامی کے لیے شیخ مجیب اور عوامی لیگ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ ان کے خیال میں شیخ مجیب نے بہت سخت موقف اختیار کیے رکھا اور ایک ناکام مذاکرات کار ثابت ہوا۔ جبکہ دوسری جانب مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں اطراف سے ایسے لوگ موجود ہیں جن کے خیال میں فوجی حکمران مذاکرات میں دلچسپی رکھتے ہی نہ تھے اور وہ فوجی آپریشن کی راہ ہموار کرنے میں لگے رہے۔ فوجی حکومت کا دعویٰ تھا کہ عوامی لیگ ایک مسلح تحریک کا آغاز کرنے والی تھی۔ چند بنگالیوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ چند بنگالی فوجی افسران شیخ مجیب الرحمٰن پر عسکری محاذ پر پہل کرنے کے لیے زور دیتے رہے، لیکن مجیب الرحمٰن انھیں یہ دلاسہ دیتے رہے کہ ابھی وہ مذاکرات کی میز پر ہیں۔[۴]

انگشت بدنداں (Element of surprise)

ہنری کسنجر سے لے کر ایک سخت گیر بنگالی قوم پرست تک سب لوگ اچانک فوجی آپریشن کے آغاز سے انگشت بدنداں تھے۔ آخر کار اپنی شعلہ بیاں تقاریر کے لیے مشہور شیخ مجیب الرحمٰن اب تک اس آس پر مذاکرات کی میز پر تھے کہ ایک دن وہ اکھنڈ پاکستان کے وزیر اعظم بنا دیے جائیں گے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر نور اللہ، جنھوں نے کسی نہ کسی طرح ۲۶ مارچ کی صبح یونیورسٹی کیمپس میں فوج کی جانب سے لوگوں کو قتل کیے جانے کی فلم بندی کر لی تھی، لکھتے ہیں کہ ۲۵ مارچ کی رات وہ ذرا جلدی سونے کے لیے چلے گئے تھے کیونکہ اخبار میں رپورٹس شائع ہوئی تھیں کہ شیخ مجیب اور یحییٰ کے درمیان جلد معاہدہ ہو جائے گا۔ ان امید افزا اخباری رپورٹوں نے انھیں کافی پر سکون کر دیا تھا۔" ہنری کسنجر نے وائٹ ہاؤس میں ۲۶ مارچ کو ہونے والی میٹنگ میں کہا "مجھے اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں کہ مذاکرات ناکامی کا شکار کیوں ہو گئے۔ کسی بھی دوسرے شخص کی طرح مذاکرات کی اس ناکامی پر میں بھی ششدر رہ گیا۔"[۵]

اتنی عجلت میں ملٹری آپریشن کیے جانے کا مقصد مشرقی صوبے میں حکومت کی عملداری کو دوبارہ قائم کرنا، عوامی لیگ کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے عوامی لیگ کو دیوار سے لگانا، بنگالی پولیس اور فوج کو غیر مسلح کرنا اور ذرائع ابلاغ پر ملٹری کا تسلط قائم کرنا تھا۔ "آپریشن بلٹز" کے نام سے ایک ایمرجنسی منصوبہ بھی ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ ڈھاکہ میں لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کے دور میں بنایا گیا تھا۔ جنرل یعقوب خان نے اچانک ہی استعفیٰ دے دیا اور ان کی جگہ جنرل ٹکا خان کو بطور گورنر تعینات کر دیا گیا۔ ۲۵ - ۲۶ مارچ کی درمیانی شب شروع کیے جانے والے ملٹری

آپریشن کو "سرچ لائٹ" کا نام دیا گیا۔ میں نے میجر جنرل غلام عمر سے، جو اس وقت نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سیکرٹری تھے، پوچھا کہ "آپریشن بلٹز" اور "آپریشن سرچ لائٹ" میں کیا فرق تھا؟ انھوں نے جواب دیا کہ دونوں میں کوئی بڑا فرق نہ تھا۔ البتہ اگر اوّل الذکر میں مقاصد کے حصول کے لیے کم از کم قوت کے استعمال پر اکتفا تھا تو موخرالذکر میں قوت کے زیادہ سے زیادہ استعمال سے بھی گریز نہ کرنا تھا۔" تاہم صاحبزادہ یعقوب خان کی توضیح بالکل مختلف تھی: انھوں نے مجھے بتایا کہ "آپریشن بلٹز" انتخابات کے دوران سنگین حالات پیدا ہوجانے کے نتیجے میں سخت اقدامات لینے سے متعلق ایک ایمرجنسی منصوبہ تھا۔ مثلاً اگر کوئی بہت بڑا سانحہ پیش آجاتا یا پھر بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان وغیرہ کر دیا جاتا۔ ان کے مطابق انتخابات کے کامیابی سے نمٹ جانے کے بعد آپریشن کا کوئی جواز باقی نہ رہ گیا تھا۔"

جنرل عمر کی، جنھیں مغربی اور مشرقی پاکستان میں "عقاب" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ ملٹری آپریشن میں کم از کم پر اکتفا کریں۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ وہ خفیہ ایجنسیوں کا حصہ نہیں رہے تھے بلکہ نووارد نیشنل سیکیورٹی کونسل کے محض ایک "سیکرٹری" تھے جس کا ایک اجلاس بھی ابھی تک نہیں ہوا۔ وہ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں کہ یحییٰ خان کی کوئی "کچن کیبنٹ" تھی جس کے وہ رکن تھے۔ البتہ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر وہ یحییٰ خان سے بہت قریب تھے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نہایت ہی مرتکز نتائج کے بعد انھوں نے "ساری رات کوششیں کیں" کہ مجیب الرحمٰن مذاکرات کی میز پر آجائیں لیکن شیخ مجیب اس بات سے انکاری رہے۔ جنرل عمر اس بات کو تو مانتے ہیں کہ آپریشن سے قبل وہ مشرقی پاکستان میں موجود تھے لیکن جنرل یحییٰ خان کے آپریشن شروع کرنے سے قبل ہی وہ کراچی لوٹ آئے تھے۔[8]

عمر کے برعکس میجر جنرل اے او مٹھا تے جو انھی کی طرح "عقاب" کے نام سے جانے جاتے تھے، ملٹری آپریشن کے دوران اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ چند دیگر تحریروں سے ہمیں ان کے افعال کے بارے میں اندازہ ہوتا ہے۔ میجر جنرل مٹھا جو کہ اسپیشل سروسز گروپ (ایس ایس جی) کے بانی ہونے کے ناطے مغربی پاکستان کی فوج میں ان مٹ نقوش رکھتے ہیں، کو ۱۹۷۱ء میں بالخصوص مشرقی پاکستان بلوایا گیا تھا۔ میجر جنرل ایچ اے قریشی کے مطابق تہہ در تہہ بحرانوں کا جمع ہونا ان کی آمد کا سبب بنا۔[9] وہ اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے میں صاف گوئی اور عزم کے ساتھ بات کرتے ہیں اور اپنے اطوار کی وجہ سے وہ ایک ایماندار اور پرعزم افسر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔[10]

بہت سے بنگلہ دیشی جنرل مٹھا کے بارے میں حقائق جانے بغیر ہی ان کے بارے میں منفی رائے قائم کرلیتے ہیں۔ سینئر ترین بنگالی فوجی افسر، بریگیڈیئر مجمدار، سابق کمانڈنٹ EBR سینٹر چٹاگانگ، جنرل مٹھا کی انتہائی منفی انداز میں تصویر کشی کرتے ہیں جبکہ وہ ان کا نام بھی صحیح تلفظ کے ساتھ ادا نہیں کرسکتے تھے، وہ انھیں ہمیشہ مٹھا خان کہتے تھے)۔[11] مٹھا بغاوت اور لاقانونیت سے نمٹنے کے حوالے سے ایک سخت گیر افسر ثابت ہوئے ہیں۔ البتہ وہ ہر قسم کے مذہبی اور لسانی تعصبات سے پاک تھے خواہ وہ اس وقت بنگالیوں کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ بمبئی میں پیدا ہوئے اور ان کی پرورش بھی وہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک پراسی، بنگالی، اندو چٹر جی کی محبت میں گرفتار ہوئے اور اسی سے شادی بھی کی۔[12] اندو مٹھا بھارت ناٹیم رقاصہ اور تیز مزاج رعب دار خاتون تھیں۔ اس نے شادی کے بعد نہ تو اپنا مذہب تبدیل کیا اور نہ ہی جنرل ضیاء کے "اسلامی انقلابی" دور میں کلاسیکی رقص کو خیر باد کہا۔ دونوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں تین سال مشرقی پاکستان کے کومیلا کے مقام پر بسر کیے۔

مٹھا لکھتے ہیں کہ یحییٰ کو، جو اس وقت ڈھاکہ میں ۱۴ ڈویژن کے جی او سی تھے، "ذرا برابر بھی یہ بات برداشت نہ تھی کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسران مشرقی پاکستانیوں کے خلاف کسی قسم کے امتیازی سلوک کو روا رکھیں اور انھوں نے ان سے اس بات کو یقینی بنانے کو کہا کہ اس قسم کی کوئی بات ان کے یونٹ کی ہرگز نہ ہونے پائے۔ ایک دن جب کلب میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے دو افسران کے خلاف ایسی ہی شکایت موصول ہوئی تو مٹھا نے انھیں وہاں سے باہر پھنکوا دیا اور یحییٰ خان نے انھیں اگلے ہی دن وہاں سے باہر تعینات کروا دیا۔"[13]

مٹھا، جو ۱۹۷۱ء میں کوارٹر ماسٹر جنرل تھے، وہ پہلے شخص تھے جنھیں امن وامان کی صورتحال خراب ہونے پر ۷-۸ مارچ ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بلوایا گیا۔ سامان کی ترسیل روک دی گئی تھی، لیبر کو کام کرنے سے روک دیا گیا تھا اور روڈ اور ریلوے سے سفر کرنا انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔ انھوں نے اگلے بارہ دنوں تک تمام چھاؤنیوں کا دورہ کیا اور ان کے مسائل کو معلوم کیے۔ انھیں اس وقت بڑی حیرت ہوئی جب انھیں دوبارہ ۲۳ مارچ کو بلوایا گیا، وہ ۲۴ مارچ کو وہاں پہنچے تو انھیں بتایا گیا کہ اگلا دن "ڈی ڈے" (D- Day) تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد تاج، کو جو ڈھاکہ میں تمام متحرک یونٹوں کے انچارج تھے، بھی ۲۴ مارچ کو بریفنگ دی گئی۔ ان کے مطابق ایکشن لینے کا فیصلہ ۲۳ مارچ کو ہی کرلیا گیا تھا۔[14]

مٹھا لکھتے ہیں کہ "۲۵ / ۲۴ مارچ کی رات اور ۲۵ مارچ کا سارا دن میں نے ڈھاکہ میں ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹرز میں گزارا۔ تمام آپریشن منصوبے کے مطابق چل رہے تھے......"[15] لیکن کیا

واقعتاً ایسا ہی تھا؟ جیسا کہ سیزن اور روز ذکر کرتے ہیں، ان کے مطابق یہ آپریشن اہم اہداف حاصل کرنے کے حوالے سے ناکام رہا تھا: گو کہ شیخ مجیب کو پہلی رات ہی گرفتار کیا جا چکا تھا لیکن عوامی لیگ کے بیشتر لیڈرز فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جہاں تک بنگالی پولیس اور فوجیوں کو غیر مسلح کیے جانے کا معاملہ تھا تو کئی واقعات میں خونریز جھڑپیں دیکھنے کو ملیں جن میں دونوں اطراف سے جانی نقصانات ہوئے اور بالآخر بہت سے بنگالی اہلکار اپنے اسلحے سمیت فرار ہو گئے تا کہ دوبارہ لڑائی میں حصہ لے سکیں۔ بالآخر آرمی پورے صوبے کا کنٹرول سنبھالنے میں کامیاب تو ہو گئی لیکن ایسا کرنے میں کئی ہفتے صرف ہو گئے۔[16]

آرچر بلڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہنری کسنجر نے صدر نکسن سے کہا کہ ''ڈھاکہ میں قونصل جنرل مضبوط ترین اعصاب کا مالک نہیں ہے۔'' آرچر بلڈ اپنے دیگر بیس ہمنواؤں کی جانب سے آنے والے کیبلز سے جن میں امریکہ کی ''عدم مداخلت'' کی پالیسی پر شدید اعتراضات کیے گئے تھے، اتفاق کرتا تھا۔ نکسن نے امریکی قونصل برائے بھارت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا ''کیٹنگ بھی مضبوط اعصاب کا مالک نہیں ہے۔ یہ سب لوگ واقعات کا حصہ ہیں''۔

غالباً اختلافات رائے کی بنیاد ''واقعات کا حصہ ہونے'' اور ''واقعات سے دور ہونے'' میں تھی۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ''واقعات کا حصہ ہوتے ہوئے'' بھی تمام لوگ ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل تھے؟ جیسا کہ ''راشومون'' کے عینی شاہدین جو کہ حالات واقعات کا حصہ تھے، وہاں موجود تھے، جنھوں نے کارروائیوں میں حصہ لیا تھا اور جو بچ گئے تھے ان سب کی کہانیاں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں اور جیسا کہ ۱۹۷۱ء میں ''راشومون'' کا واقعہ ہے، تو مرنے والے بھی بزبان حال سے واقعات بیان کرتے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی پر حملہ

''88 فار 99۔ ابتداء میں جگن ناتھ اور اقبال ہال سے بہت فائر آرہے تھے۔ اب ابھی تک فائر بند ہے۔''

— مغربی پاکستانی افسران کے مابین وائرلیس پر گفتگو،
ڈھاکہ ۲۵ - ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب[17]

''زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے لوگوں کو مرتے دیکھا ہے اور زخمی لوگوں کو خون میں لت پت...... اسی اثناء میں دو مزید بیچز کو لایا گیا اور مار دیا گیا۔ عوام الناس کے قتل عام سے

متعلق باقی تین فلمیں بھی ریکارڈ کرلی گئیں"۔

—پروفیسر نوراللہ، ڈھاکہ یونیورسٹی[18]

پورے ملٹری ایکشن میں اگر کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہے جو کہ عالمی سطح پر بدنامی کا باعث بنا ہو تو وہ ۲۵-۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی درمیانی رات ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہونے والے واقعات تھے۔ "باغی" یونیورسٹی کو کچلنے کے لیے یوں آرمی کا بھیجا جانا آرمی پر کڑی تنقید کا باعث بنا۔ دارالحکومت کے مرکز میں رونما ہونے والا یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کے تمام حالات کو رپورٹ کیا گیا اور لوگوں نے یہ سوچا ہوگا کہ جو کچھ بھی بتایا گیا بعینہٖ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں تصادم کی نوعیت کچھ اس طرح کی تھی کہ جو دکھائی دیتا تھا بالکل ویسا ہی نہ تھا۔

اس باب میں ہم دونوں فریقوں کے جو ۲۶-۲۵ مارچ کی رات ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود تھے بیانات سے تفصیلی جائزہ لیں گے کہ اس رات ڈھاکہ یونیورسٹی میں کیا ہوا تھا۔ اس رات ملٹری کی جانب سے جو دیگر ایکشن لیے گئے ان میں پولیس لائن کا کنٹرول سنبھالنا، اہم پولیس اسٹیشنوں اور ٹیلی ویژن سینٹر پر قبضہ کرنا، اہم سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرنا، علیحدگی پسند اخبارات کے دفاتر کو مسمار کرنا وغیرہ شامل ہیں جبکہ اگلی صبح پرانا ڈھاکہ کے علاقوں پر حملہ کیا گیا تھا۔ ان معاصر واقعات کو بعض اوقات ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہونے والے واقعات کے ساتھ گڈمڈ کر کے بھی پیش کیا جاتا رہا ہے۔

مسلح عسکریت پسند یا غیر مسلح طلبا؟ "۳۰ مارچ کو قونصلیٹ جنرل کی اطلاع کے مطابق آرمی نے مبینہ طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں نہتے طلباء کو بڑی تعداد میں قتل کیا"۔ اس ضمن میں اس وقت کی امریکی دستاویزات کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔[19] تاہم اپنی سوانح حیات میں امریکی قونصل جنرل آرچر بلڈ رقم طراز ہیں: "اقبال ہال میں موجود چند مسلح طلبا کو (کذا) یا تو ان کے کمروں میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا یا اس وقت جبکہ وہ لوگ عمارت سے گروپوں کی شکل میں باہر نکل رہے تھے"۔[20]

بھارت اور بنگلہ دیش میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے متعلق سنائی جانے والی کہانیوں میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یونیورسٹی میں اسلحہ بھی موجود تھا اور یہ کہ اسٹوڈنٹ ہالز میں فائر دونوں فریقوں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ بلکہ کہانی کا صرف ایک ہی رخ سامنے لایا جاتا ہے کہ آرمی نے "طلبا" (اور پروفیسر حضرات) کو قتل کیا۔ اس طرح سے واقعات کو بیان کرنے سے کچھ اس قسم کا مقصد سامنے آتا ہے کہ آرمی ایسے عام شہریوں کے قتل عام میں مصروف رہی جن کے سیاسی نظریات حکومت

وقت کو ناپسند تھے۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح سے اصل واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ تصویر کا یہ رخ بنگالی قوم پرستوں بالخصوص ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود طلباء کے مؤقف کی تائید کی بھی نفی ہے۔

آنے والے ہفتوں میں بنگالی قوم پرستوں نے ایک فوجی حکومت کی عملداری کو کھل کر چیلنج کیا تھا اور ڈھاکہ یونیورسٹی اس چیلنج کا مرکز تھی۔ یونیورسٹی میں معمول کی سرگرمیاں مارچ کے اوائل سے ہی معطل تھیں۔ صوبے بھر کے بیشتر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے کیونکہ تدریسی عمل بند ہوگیا تھا۔ بیشتر میڈیا رپورٹوں اور بنگالی قوم پرست تاریخ کے ریکارڈ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بڑے پیمانے پر اسلحہ جمع کیا گیا اور لوگوں کو عسکری تربیت دی گئی۔ ڈھاکہ میں حریت پسندوں کی پریڈ اور پرتشدد واقعات، ان نعروں کے ساتھ کہ "بہادر بنگالیو اسلحہ اٹھاؤ بنگلہ دیش کو آزاد کراؤ"، معمول کی بات تھے۔

اس طرح سے ایک مختلف، لیکن مساوی طور پر بنگالی قوم پرستوں کی طرف سے حب الوطنی سے سرشار، کہانی کا ہمارے سامنے آنا ممکن ہے۔ جس کے مطابق یونیورسٹی میں موجود مسلح طلباء قومی ہیرو تھے جنھوں نے اپنے سے کئی گناہ بڑی قوت سے ٹکر لی اور آزادی کے شہیدوں میں اپنا نام لکھوایا۔ لیکن قومی سطح پر بنگلہ دیش میں ان کہانیوں کو دو رخے زاویوں پر موڑ دیا گیا جس میں ایک جانب تو اپنے ہیروؤں کو پس پشت ڈال دیا اور دوسری جانب انھیں بجائے ہیرو کے "مظلوم" بنا کر پیش کیا گیا۔

جیسا کہ کچھ ہی عرصہ بعد سنڈے ٹیلی گراف میں سائمن ڈرنگ نے تحریر کیا:

> شیخ مجیب الرحمٰن کے حمایتی آرمی آپریشن سے قبل گزشتہ ماہ بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے کہ وہ کیسے لڑیں گے لیکن انھوں نے خود کو تیار کرنے کے لیے عملاً کچھ بھی نہ کیا تھا۔ وہ عموماً شور شرابے اور تشدد سے بھرپور مظاہرے کیا کرتے تھے لیکن ان میں نظم وضبط، تربیت اور اسلحہ کا فقدان تھا اور جیسا کہ آرمی آپریشن سے ظاہر ہو چکا ہے وہ لڑنے کا جگر بھی نہ رکھتے تھے"۔ دارالخلافہ میں موجود وہ طلبا بھی جنھیں عوامی لیگ کا اصل ہراول دستہ تصور کیا جارہا تھا تصوراتی دنیا کے باسی ثابت ہوئے۔ وہ مرتے دم تک لڑنے کی باتیں کرتے نہ تھکتے تھے۔ لیکن ان کے پاس ۴۵ - ۱۹۳۹ء جنگ کی چند رائفلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اتنی ہی پرانی چند پستولیں اور گھر کے بنے ہوئے بم ان کے پاس تھے، جب ۲۵ مارچ کو فوج نے حملہ کیا تو بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ ان کا استعمال بھی نہ کر سکے۔ جب ایک مرتبہ فائرنگ شروع ہوئی تو دھونس، دھمکی، چلانا اور پاکستانی حکومت کی فوجی قوت سے مقابلے کے دعوے اپنی موت آپ ہی مر گئے۔[۲۱]

ڈرنگ کے مطابق جیسا کہ بنگالی قوم پرستوں میں "لڑنے کا جگر" ہی نہ تھا بالکل اسی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ "ولن بمقابلہ مظلوم" کے انداز سے کہانی کو پیش کر کے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا

کہ ان میں خود کو ''ہیرو'' کے طور پر پیش کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ درحقیقت اسلحہ بھی تھا اور تربیت بھی گو کہ مدمقابل سے کہیں کم اور کچھ بنگالیوں کے اصل کردار کی نفی کرتی ہے اور دوسری جانب بذات خود پوری ''مظلوم'' والی کہانی مشکوک ہوتی دکھائی دیتی ہے کیونکہ خود بنگالی عینی شاہدین اس کہانی سے اتفاق نہیں کرتے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والا ہندو طالب علم کالی رنجن شیل جو کہ ایک کمیونسٹ کارکن تھا اور جگن ناتھ ہال والے حملے میں زندہ بچ گیا تھا، یکم مارچ کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کے بعد لکھتا ہے کہ ''طلبا یونین نے نقلی رائفلوں کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی جمنازیم فیلڈ میں جنگی تیاریاں شروع کر دی تھیں...... میں بھی ایک گروپ میں زیر تربیت تھا۔ چند ہی دنوں بعد ہماری تربیت مکمل ہوگئی اور طالبات کے ایک گروپ کے ساتھ ہمارے تین گروپوں نے روڈ پر مارچ پاسٹ کیا تھا۔'' بلاشبہ غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے اس عرصے کے دوران پریڈ کرتی ہوئی رائفل بردار لڑکیوں کی تصاویر شائع کیں اور لبریشن وار میوزیم ڈھاکہ میں بھی ان تصاویر کو بڑے فخریہ انداز سے آویزاں کیا گیا ہے۔

شیل لکھتا ہے ''اس کے بعد ہم میں سے تربیت یافتہ افراد نے ڈھاکہ کے دیگر علاقوں سے آنے والے طلبا کو تربیت دی اور بندوق چلانے کی تربیت کے علاوہ ہم ان کی ذہن سازی بھی کرتے تھے کہ ہم یہ جنگ آخر کیوں لڑ رہے تھے......'' ۷ مارچ کے بعد یونیورسٹی میں عام طلبا کی تعداد گھٹنا شروع ہوگئی۔ ۲۵ مارچ بروز جمعرات کی صبح بھی معمول کے مطابق جمنازیم فیلڈ میں تربیت جاری تھی۔[۲۲] گو کہ شیل کے مطابق تربیت کا آغاز ''نقلی بندوقوں'' سے ہوا تھا لیکن وہ مارچ کے مہینے میں ایک باقاعدہ مسلح بغاوت کی تیاری کا ذکر بھی کرتا ہے۔ دوسری جانب متضاد انداز ہے اسی کہانی میں وہ ''وحشی پاکستان آرمی'' کے غیر مسلح طلباء پر حملوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ ایک جانب تو وہ خود کو ایک جنگ کے لیے تیار کرتا ہے اور دوسری جانب واقعتاً جنگ کے آغاز پر تعجب کا اظہار بھی کرتا ہے!

شیل اس بات کی توثیق بھی کرتا ہے کہ بیشتر طلباء ہاسٹل سے جا چکے تھے اور ان کی جگہ دیگر افراد تربیت کے لیے آ چکے تھے۔ ان میں سے چند ایک طلباء بھی ہو سکتے تھے لیکن ان کا تعلق ہرگز ڈھاکہ یونیورسٹی سے نہ تھا۔ اسی طرح نذر الاسلام بھی لکھتے ہیں کہ ان کے آرٹ کالج کا ہاسٹل بھی خالی ہو گیا تھا اور تمام طلباء اپنے گھروں اور دیہات کو لوٹ گئے تھے۔ چونکہ طلباء موجود نہ تھے اس لیے اسٹوڈنٹ ڈائننگ ہال بھی بند کر دیا گیا تھا اور انھیں ایک ریستوران میں کھانا کھانا پڑتا تھا۔ اس بدقسمت رات ایک دوست نے ان سے ہاسٹل میں رہنے کی جگہ مانگی تھی جو کہ ڈھاکہ روزگار کی تلاش میں آیا تھا۔[۲۳] مارچ کے مہینے میں طلباء اور غیر طلباء عسکریت پسندوں کا جوق در جوق ڈھاکہ یونیورسٹی

میں آنا بعد میں اس تذبذب کی وضاحت کرے گا کہ "آپریشن سرچ لائٹ" میں کون مارا گیا اور کتنے مارے گئے۔

دو طرفہ جنگ یا یک طرفہ قتل عام؟ میجر جنرل مٹھا لکھتے ہیں "مجھے بتایا گیا تھا کہ مسلح مسلمان طلباء نے خود کو مسلح کر کے ایک جنگ کی نیت سے یونیورسٹی میں پناہ لے رکھی تھی اور اس بات میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش بھی نہ تھی۔ جب آرمی انھیں نکالنے کے لیے وہاں گئی تو انھوں نے مزاحمت کی جس میں کچھ مارے بھی گئے"۔[۲۴]

حقیقتاً اس رات ڈھاکہ یونیورسٹی میں دو طرفہ جنگ بھی ہوئی اور یک طرفہ قتل عام بھی۔ سوال یہ ہے کہ کب اور کہاں۔ دو طرفہ جنگ تو اصل اہداف یعنی جگن ناتھ ہال (ہندو ہاسٹل) اور اقبال ہال میں ہوئی۔ جبکہ غیر مسلح لوگوں کو مزاحمت کچلنے کے بعد فیکلٹی سے متصل اپارٹمنٹس میں قتل کیا گیا۔

۲۵ مارچ کی صبح جگن ناتھ ہال کے پرووسٹ (نگران) و پروفیسر جوئے تیر موئے گوھا تھا کرتا نے اخبارات میں "سمجھوتہ" کی خبر پڑی تو انھیں شدید ملامت کا احساس ہوا۔ یونیورسٹی میں شہید مینار کے پاس سے جو جلوس گزرا تھا اس میں سمجھوتے کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ان کا نعرہ تھا "بہادر بنگالیو! ہتھیار اٹھاؤ، بنگلہ دیش آزاد کراؤ"۔

جوئے تیر موئے گوھا تھا کرتا انگریزی کے معروف پروفیسر تھے۔ وہ میمن سنگ میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ انھوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور کنگز کالج لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے ہم عصروں کی طرح، ان کے قوم پرستی کے جذبات بھی اپنی جڑیں برٹش انڈیا میں رکھتے تھے۔ ابھی آٹھویں جماعت کے طالب علم ہی تھے کہ انھوں ایک قوم پرست سبھاس چندر بوس کو میمن سنگھ میں خوش آمدید کہنے کے لیے ایک نظم لکھی اور پڑھی تھی۔ چندر بوس بعدازاں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں پروفیسر جوئے تیر موئے — ایک ہندو — جگن ناتھ ہال کے پرووسٹ (نگران) تھے۔

جگن ناتھ ہال سے کچھ فاصلے پر ایک تین منزلہ فیکلٹی اپارٹمنٹ (نمبر ۳۴) کے گراؤنڈ فلور پر رہائش پذیر تھے۔ ان کی بیوی بسنتی کہتی ہیں، ملکی سیاست میں ہلچل مچلنے پر پروفیسر صاحب کو گرفتاری کا خدشہ بھی تھا لیکن لوگوں کے سمجھانے کے باوجود بھی وہ کہیں روپوش نہ ہوئے بلکہ بطور پرووسٹ جگن ناتھ ہال میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔ میڈیکل کالج اور ۱۹۵۰ء کی لسانی بغاوت کی یادگار شہید مینار ان کے اپارٹمنٹ کی عمارت کے قریب ہی واقع تھے۔ چائے کے وقت پہلی منزل پر واقع پروفیسر انیس الرحمٰن کے کمرے سے میوزیکل ریہرسل کی آواز آ رہی تھی: وہ ایک نئے نغمے "ہم

بہادر بنگالی" کی مشق میں مصروف تھے۔ طلباء کے ہال میں طلباء چوتھے درجے کے اسٹاف کو پریڈ سکھانے میں مصروف تھے۔ گوھاتھا کرتا اپنے ایک اسٹاف ممبر رام بہاری داس سے مذاقاً کہنے لگے کم ازکم ان کے پیٹ کا شدید درد تو اس سے ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ پھر وہ شہید مینار کے پاس کھڑے ہو کر طلباء سے باتیں کرنے لگے، وہ انھیں نصیحت کر رہے تھے کہ اپنے رشتہ داروں کے گھروں کو چلے جائیں اور ۲۳ مارچ کو واپس آنے والے طلباء سے وہ سخت نالاں تھے۔[۲۵]

تقریباً رات 10:30 بجے فیکلٹی اپارٹمنٹ بلڈنگ جگن ناتھ ہال، انجینئرنگ کالج اور شہید مینار کے اردگرد سڑکوں پر سے شور سنائی دینے لگا۔ نوجوان سڑکوں پر پانی کی ٹنکیوں اور بڑے درختوں کی شاخوں سے رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔ گوھاتھا کرتا کے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ انھیں احکامات موصول ہوئے ہیں کہ ہر آنے جانے والی گاڑی کی تلاشی لی جائے۔ ان لوگوں سے کچھ تاخیر ہوگئی تھی۔ ۱۸ پنجاب کے کیپٹن سرور پہلے ہی ڈھاکہ یونیورسٹی جاسوسی کی غرض سے سویلین کپڑوں میں پہنچ چکے تھے۔ وہ ایک کار میں سوار تھے اور ان کے ساتھ اسپیشل سروسز کے کمانڈو افسر بلال (جو ۲۵ مارچ کی رات کو شیخ مجیب کو گرفتار کرنے گئے تھے) اور بٹالین حوالدار میجر، نائب صوبیدار یعقوب بھی تھے۔[۲۶]

جس فورس کو ۲۵ مارچ کو رات گئے ڈھاکہ میں ہونے والے آپریشن کی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں وہ بریگیڈیئر جہانزیب ارباب (بعدازاں لیفٹیننٹ جنرل) کی کمان میں ۵۷ بریگیڈ تھی۔ ان کی بریگیڈ ۱۸ پنجاب اور ۳۲ پنجاب رجمنٹس، ۳۱ فیلڈ آرٹلری رجمنٹ اور بنگال یونٹ سیکنڈ ایسٹ بنگال رجمنٹ پر (جو جوئے دیو پور میں تعینات تھی) مشتمل تھی۔ آرمی ایکشن سے کچھ پہلے بنگالی کمانڈنگ آفیسر 2EBR لیفٹیننٹ کرنل مسعود کو ایک دوسرے بنگالی افسر رقیب سے تبدیل کر دیا۔ اس سے قبل رقیب ۳۲ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ ملٹری ایکشن کی رات لیفٹیننٹ کرنل (بعدازاں بریگیڈیئر) محمد تاج تینوں یونٹوں کے انچارج کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ وہ اصلاً ۱۸ پنجاب سے تھے لیکن مکمل انچارج ہونے کے علاوہ ۳۲ پنجاب کی کمان بھی کر رہے تھے۔ ۳۲ پنجاب کے اہداف میں راجر باغ پولیس لائنز، چند اہم پولیس اسٹیشنوں اور ایوان صدر کا کنٹرول حاصل کرنا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل بشارت کی زیر قیادت ۱۸ پنجاب کے ذمہ ڈھاکہ یونیورسٹی، ٹیلی ویژن اسٹیشن اور پرانے ڈھاکہ میں ایک ہندو علاقے شنکھر یپارہ کا کنٹرول سنبھالنا تھا۔ نیز انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی حفاظت اور ٹینک پروٹیکشن دینا بھی ان کے ذمے تھا۔[۲۷]

بریگیڈ ہیڈکوارٹر ڈھاکہ ہی میں ایک مقام پر قائم کیا گیا تھا جسے "دارالخلافہ ثانی" گردانا جارہا

تھا۔ بریگیڈ میجر جعفر خان مارچ کے اوائل ہی میں میجر خالد مشرف کی جگہ لینے کے لیے پہنچ چکے تھے۔[۲۸] جنرل ٹکا خان کرمیٹولا میں ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈکوارٹر میں موجود تھے۔ تمام کمانڈرز ضرورت کے مطابق متحرک تھے۔ ۱۸ پنجاب کا آپریشنل ہیڈکوارٹر ریس کورس کے مقام پر بنایا گیا تھا جہاں کیپٹن سرور اور رفیع منیر، بٹالین کوارٹر ماسٹر ابتداً تعینات تھے۔ بٹالین کی ''اے کمپنی'' میجر مدد حسین شاہ کی کمان میں بٹالین ہیڈکوارٹر میں ریزرو کے طور پر موجود تھی۔[۲۹] ''بی کمپنی'' صدر گھاٹ کے مقام پر کیپٹن مظفر اولادِ حسین نقوی کے ساتھ ''سی کمپنی'' میجر جمیل مسعود کی قیادت میں انٹرکانٹی نینٹل کی حفاظت پر مامور تھی، ''ڈی کمپنی'' کیپٹن صالح حسین مرزا کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی اور شنکھاری پٹی روانہ ہوئی تھی۔[۳۰]

جیسے ہی ''آپریشن سرچ لائٹ'' شروع کیا گیا، ۱۸ پنجاب کے لیفٹیننٹ محمد علی شاہ کو جوانوں کی ایک پلاٹون کے ساتھ ٹینکوں کو پروٹیکشن دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔[۳۱] ۲۵ مارچ کی صبح انھیں اطلاع ملی کہ آپریشن اسی رات ہونا تھا، وہ کینٹ سے نکلنے والے سب سے آخری افسر تھے، وہ اپنے تین شیفی (Chaffee) ٹینکوں اور مارٹر پلاٹون کے ساتھ روانہ ہوئے۔ شاہ اس رات ڈھاکہ میں آہستہ آہستہ پریڈ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، پو پھٹنے تک وہ انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل تک پہنچ چکے تھے۔

راستے میں جاتے ہوئے انھیں درختوں سے بنائی گئی رکاوٹوں کو ہٹانا پڑا اور انھیں یونیورسٹی اور دھان منڈی (شیخ مجیب کا رہائشی علاقہ) سے فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ انھیں اِدھر اُدھر چند لاشیں بھی بکھری نظر آئیں جن کی تعداد شاہ کے مطابق بیس یا پچیس کے درمیان تھی۔[۳۲] شاہ کہتے ہیں کہ انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس رات آپریشن کے نتائج اس قدر بھیانک بھی ہو سکتے تھے۔ شاہ کے مطابق اس رات پورے ڈھاکہ میں صرف وہی تین ٹینک تھے اور ان کا اصل مقصد طاقت کا ''مظاہرہ'' کرنا تھا۔ ان کے مطابق ٹینکوں کی اصل گنیں اس رات استعمال ہی نہیں کی گئی تھیں جبکہ اطراف میں لگی چھوٹی گنوں سے فائر کیے جاتے رہے لیکن اس کا مقصد ''شور مچا کر'' خوف ہراس پھیلانا تھا۔ ٹینکوں کا دستہ مین روڈ پر ہی چلتا رہا۔ وہ مکانوں والے علاقوں سے گزرے ہی نہیں، نہ ہی ٹینک نیو مارکیٹ یا یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔

اسٹوڈنٹ ہالز میں ''سرچ لائٹ''۔ اسٹاف کوارٹر بالمقابل جگن ناتھ ہال میں مقیم آٹھویں جماعت کا طالب علم رابندر موہن داس واقعات کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک تیز روشنی کے ساتھ ہی چھت سے گولیوں کی کڑکڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں اور وہ سب لوگ اپنے پلنگ کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔[۳۳] یہ مذکورہ بالا رام بہاری داس کا بیٹا تھا جو کہ پروفیسر گوہا کا تھا کرتا کے

دفتر میں کام کرتا تھا۔

بسنتی گوہا ٹھاکرتا تحریر کرتی ہیں کہ ''تقریباً ساڑھے بارہ یا ایک بجے کے قریب میں فائرنگ کی آواز سے جاگ گئی۔ میں نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ بالآخر جنگ شروع ہوگئی؟'' انھوں نے جواب دیا ''نہیں! لڑکے مشقیں کر رہے ہیں''۔[۳۴] روشنی کے ساتھ کانوں کو پھاڑ دینے والی فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ گھر یوں ہل رہا تھا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ گوہا ٹھاکرتا اور ان کے گھر والے بھی پلنگ کے نیچے جا چھپے۔

جگن ناتھ ہال کے پار انجینئرنگ فیکلٹی کوارٹرز میں مقیم پروفیسر نوراللہ لکھتے ہیں کہ ''آدھی رات کو زوردار دھماکوں نے مجھے نیند سے جگا دیا۔'' تھوڑی ہی دیر بعد ''مارٹر اور گولیاں'' چلنے کا نہ تھمنے والا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ بعدازاں جگن ناتھ ہال کے چند کمروں میں آگ بھڑک اٹھی۔ پروفیسر نوراللہ نے بعض افراد کو ٹارچ لائٹوں کے ساتھ جگن ناتھ ہال کے کمروں کی تلاشی لیتے دیکھا۔[۳۵]

کالی رنجن شیل نے ''جنگی تربیت'' حاصل کی تھی، اس کے مطابق اعصاب شکن فائرنگ نے اسے اٹھا دیا اور ایسی شدید فائرنگ اس نے ساری زندگی میں کبھی نہ سنی تھی۔ یقیناً اس نے لڑائی میں حصہ نہ لیا تھا۔ اس رات وہ باتھ روم کی کھڑکی سے نکل کر دوسری منزل پر دیوار پر بنے ایک چھجے پر ساری رات چت لیٹا رہا۔ بے شک شیل کی تحریروں میں اس بات کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے کہ ہال میں سے کسی نے لڑائی میں حصہ لیا ہو۔ وہ اپنی تحریر میں کمروں میں آگ بھڑکنے اور ایک ایک کمرے کی ٹارچ لائٹ کے ذریعے تلاشی لینے کے واقعات کا ذکر کرتا ہے۔ ایک موقع پر فوجی پریا ناتھ، چوکیدار کو لائے اور ہال کا مرکزی دروازہ کھلوا دیا، اور جس بنّی پر شل لیٹا ہوا تھا، اسی دیوار کی دوسری جانب کسی کو مارا گیا تھا۔[۳۶]

دوطرفہ جنگ کی شہادت ہمیں ایک غیر متوقع ذریعے سے ملتی ہے۔ جب ایکشن اپنے عروج پر تھا، اس دوران فوج کے وائرلیس کمیونیکشن نیٹ ورک پر بریگیڈ کمانڈر نے یونیورسٹی کی صورتحال کے بارے میں دریافت کیا:[۳۷]

''99 فار 88 (کیپٹن شفیق اے کے نیازی کی آواز جو بریگیڈئیر ارباب، کمانڈر 57 بریگیڈ کے ساتھ تھے) ہائی کمان جاننا چاہتی ہے کہ جگن ناتھ، اقبال اور لیاقت میں کس قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اوور''

''88 فار 99 (لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان، کمانڈنگ آفیسر 18 پنجاب) ابتداً جگن ناتھ ہال اور اقبال ہال سے کافی زیادہ فائرنگ کی گئی راجر۔ اب تک بند ہے۔''

اس کے بعد ایک وضاحتی سوال پوچھا جاتا ہے:

''99 فار 88 (کیپٹن شفیق لے کے نیازی) براہِ مہربانی ہمیں بتائیں کہ مخالف سمت سے کوئی خود کار ہتھیار استعمال کیے گئے یا نہیں اور کوئی دستی بم وغیرہ بھی پھینکے گئے یا نہیں۔ اوور۔''

''...... فار 99 (لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان) 0.303 کے کئی فائر۔ ہم نے خودکار ہتھیار کا کوئی فائر نہیں سنا اور نہ ہی کوئی دستی بم پھینکا گیا ہے۔ اوور''

بعد میں میدان میں موجود کمانڈر نے لڑائی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا:

''88، جب ہم رومیو کے ساتھ کھل کر سامنے آئے تو ہم نے کوئی فائر نہ سنا، لیکن ہم چند ایک کو ٹھکانے لگا چکے ہیں۔''

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) محمد تاج، کمانڈنگ آفیسر ۳۲ پنجاب، جو کہ اس رات مکمل طور پر انچارج تھے، کے مطابق اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال میں دو بدو جنگ ہوئی تھی اور جگن ناتھ ہال میں یہ جنگ شدید نوعیت کی تھی۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر سے کمیونیکشن روابط قائم رکھنے پر مامور بریگیڈ میجر جعفر خان نے مجھے بتایا کہ جگن ناتھ میں مقیم افراد کو میگا فون پر ہتھیار ڈالنے کی وارننگ دی گئی — جبکہ بنگالی تحریروں میں اس قسم کی وارننگ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔[۳۸] بریگیڈیئر (میجر) جعفر کے خیال میں یونیورسٹی پر کنٹرول حاصل کرنے میں دو یا تین گھنٹے لگے ہوں گے، اس میں بھی سب سے زیادہ وقت جگن ناتھ ہال میں صرف ہوا۔

جہاں تک معاملہ لڑکیوں کے رُقیہ ہال، ڈھاکہ یونیورسٹی کے لڑکیوں کے ہاسٹل، کا ہے تو کسی بھی ریکارڈ سے خواہ وہ بنگالی ریکارڈ ہو، مغربی پاکستانی یا ریکارڈڈ وائرلیس کمیونیکشن، یہ پتہ نہیں چلتا کہ اسے بھی ہدف بنایا گیا ہو۔ جبکہ ۱۹۷۱ء میں بنگال میں یہ کہانی گردش کر رہی تھی جو بنگالی دانشوروں کے ذریعے مجھ تک پہنچی کہ لڑکیوں کے ہوسٹل پر بھی حملہ کیا گیا تھا اور لڑکیوں نے کھڑکیوں سے چھلانگیں لگائیں۔ درحقیقت دیگر ہاسٹلز کی مانند ۲۵ مارچ سے قبل رُقیہ ہال بھی اپنے عام مکینوں سے خالی ہو چکا تھا اور یہ ہال آرمی کا ہدف نہ تھا۔ اسی طرح آرمی محسن ہال کی طرف بھی نہ گئی تھی۔[۳۹] اس بات کی تصدیق جہاں آراء امام کی کتاب سے بھی ہوتی ہے جو خوف کے عالم میں محسن ہال میں موجود تھیں۔

تاہم رقیہ ہال کی پرووسٹ بیگم اختر امام بیان کرتی ہیں کہ آرمی ان کے بنگلے میں گولہ بارود، آدمیوں اور ان لڑکیوں کی تلاش میں گھس گئی تھی جو مسلح پریڈ میں حصہ لیا کرتی تھیں۔[۴۰] پرووسٹ

جہاں آراء امام کے مطابق رقیہ ہال کی کل گنجائش تقریباً آٹھ سو طالبات کی تھی۔ جب سیاسی کشیدگی میں اضافہ ہونے لگا تو ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء تک یہ تعداد محض سات طالبات تک رہ گئی تھی۔ جب آرمی ایکشن سے اس رات ان کی آنکھ کھلی تو یہ تمام لڑکیاں ایک ہاؤس ٹیوٹر ساحرہ خاتون کے گھر میں تھیں۔ تمام کی تمام لڑکیاں بخیر و عافیت محفوظ رہیں اور جب ۲۷ مارچ کو کرفیو اٹھالیا گیا تو تمام لڑکیاں اپنے سرپرستوں کے ساتھ روانہ ہوگئیں۔

پرووسٹ جہاں آراء امام لکھتی ہیں کہ اس رات فوج نے دو مرتبہ ان کے گھر کی تلاشی لی۔ پہلی بار فوجی کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر گھر میں داخل ہوئے اور سنگین کی نوک پر ان سے پوچھتے رہے کہ آدمی کہاں چھپے ہیں۔ ہال سپرنٹنڈنٹ جہاں آراء، ہاؤس ٹیوٹر ساحرہ خاتون اور کئی دیگر مرد و خواتین اسٹاف ممبران اس وقت پرووسٹ کے گھر میں موجود تھے۔ وہ چوکیدار اور دیگر مردوں کے سامنے ڈھال بن گئیں اور انھیں بتایا یہ غریب لوگ ہیں اور اسٹاف ممبر ہیں لیکن انھیں دھکیل کر ایک جانب کر دیا گیا۔ جس لمحے ایسا لگا کہ اب سب کچھ ختم ہونے والا ہے اسی لمحے ایک افسر نمودار ہوا اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ خواتین کی بے عزتی نہ کی جائے اور سب باہر آجائیں۔ فوجیوں نے ان افراد کو رائفلوں کے بٹ مارے اور چلے گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد فوجیوں کا ایک اور گروپ وہاں آیا۔ انھوں نے سب کو گھر کے باہر ایک قطار میں کھڑا کر کے اسلحے کی تلاش میں پورا گھر الٹ پلٹ کر دیا۔ مسز امام نے لکھا ہے کہ وہ دوبار بھاگ کر لائن سے باہر آگئیں تاکہ اپنے نوکر کو بچاسکیں جس کو فوجی لے جا رہے تھے۔ اس گروپ کے افسر کو اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ پرووسٹ تھیں۔ وہ یہ بات جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسلحہ کہاں چھپایا گیا ہے اور گزشتہ ہفتوں کے دوران مسلح پریڈ میں شریک ہونے والی لڑکیاں کہاں ہیں اور یہ کہ قطار میں کھڑے افراد میں سے کون لوگ مسلمان تھے۔ مسز امام نے اس افسر کو بتایا کہ تمام لڑکیاں گھروں کو روانہ ہوچکی تھیں، وہاں کوئی اسلحہ موجود نہیں تھا اور یہ کہ وہ تمام لوگ مسلمان تھے۔ ان کے مطابق افسر کا لہجہ دھمکی آمیز اور توہین آمیز تھا اور دونوں مرتبہ فوجی گھر سے سامان لوٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔[۴۱]

۱۸ پنجاب کے کیپٹن سرور کو اس وقت بہت عجیب لگا جب انھوں نے دیکھا کہ ریس کورس کے قریب ایک مکان میں چند افراد کو عسکریت پسند ہونے کے شبہے میں فوجیوں نے مارنا شروع کیا جب کہ وہ لوگ محض چوکیدار بھی ہوسکتے تھے۔ وہ گھومتے گھومتے شہید مینار پہنچے، جسے مسمار کیا جارہا تھا۔ کیپٹن نے وہاں باغیوں کی چند لاشیں بھی پڑی دیکھیں۔ ایک شخص نے ان لوگوں میں سے پستول

کے ساتھ اٹھ کر چھلانگ لگادی۔ کیپٹن سرور نے اس کا تعاقب کیا۔ یہ تعاقب بیت الخلاء میں جا کر ختم ہوا اور اسے وہیں مار دیا گیا۔[۴۲] شہید مینار کو گرانے میں کچھ وقت لگ گیا۔ یہ ایک ایسی غارت گری تھی جس سے بنگالیوں کے غم و غصے کو اور بھی جلا ملی اور نہ جانے کیوں ایسے بے مقصد کام میں وقت اور وسائل کو بے جا استعمال کیا گیا۔ فوجی نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے ۱۹۵۰ء کی لسانی تحریک کی اس یادگار کو مسمار کیا جانا بے سود بات تھی۔

اسٹوڈنٹ ہالز سے بنگالی طلباء کی جانب سے کی جانے والی مزاحمت کا اندازہ کسی کو بھی نہ ہو سکا۔ لیفٹیننٹ (کرنل) محمد علی شاہ کے مطابق فوجی ایکشن شروع ہونے کے بعد ابتدائی دو یا تین دنوں کے دوران بنگالیوں کی جانب سے مزاحمت کی کچھ داستانیں ہوا میں گردش کر رہی تھیں۔ فوجی ''جذبۂ حب الوطنی'' سے سرشار تھے۔ رپورٹ کے مطابق استعمال شدہ اسلحہ کی تعداد ہوشربا طور پر بہت زیادہ تھی۔ پہلے دو تین دنوں میں بٹالین کی ''ڈی کمپنی'' کے تقریباً پانچ افراد زخمی ہوئے اور دو افراد مارے گئے تھے۔ تاہم، شاہ کی یادداشت کے مطابق ہر قسم کا اسلحہ بڑی تعداد میں بازیاب کیا گیا تھا۔ ان کے تخمینہ کے مطابق تین سو کے لگ بھگ اشیاء میں بندوقیں، تلواریں اور خصوصی طور پر تیار کی گئی برچھیاں شامل تھیں۔ یہ تمام چیزیں یونیورسٹی سے ملی تھیں۔ دو گاڑیاں اسلحے سے بھر کر وہاں سے لے جائی گئیں، اس میں سے کچھ اسلحہ خون آلود بھی تھا۔ بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج نے مجھے بتایا کہ طلباء ہاسٹل سے بھارتی اسلحہ بھی بازیاب کیا گیا تھا۔

لگتا یوں ہے کہ کچھ بنگالیوں نے لڑائی کی لیکن زیادہ تر نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پاکستان آرمی ہی کے مطابق بنگالی عسکریت پسندوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور 0.303 رائفلوں کی مدد سے ایک پیشہ ور فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے ہلاک ہوگئے۔ ایک طرف تو بنگلہ دیشی تحریروں کے مطابق طلباء سو رہے تھے جب کہ دوسری طرف ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ طلباء تھے جو خود کو ''بہادر بنگالی'' کہا کرتے تھے، جنھوں نے تربیت حاصل کی تھی اور لڑنے کی باتیں کیا کرتے تھے لیکن وقت آنے پر ان میں ''لڑنے کا جگر'' موجود ہی نہ تھا۔

کوئی قیدی نہ لے جائے گئے: جگن ناتھ ہال

میدان کے مغربی حصے کی جانب سے، جہاں جگن ناتھ ہال کا مین کمرہ تھا، اچانک ہی ۲۰ پاکستانی فوجی نمودار ہوئے، ان کے ساتھ دو زخمی لڑکے بھی تھے۔ وہ ان لڑکوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ ان کے کندھوں سے سہارا دیتے ہوئے لا رہے تھے اور پھر انھیں دو چادروں پر بٹھا دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ انھیں ہسپتال لے جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد انھوں نے چادریں ہٹائیں۔ میں نے دیکھا کہ چادروں سے کچھ لاشوں کو ڈھکا گیا تھا۔ دونوں زخمی لڑکوں کا رخ مشرق کی جانب تھا اور لاشیں ان کے عقب میں تھیں۔ پھر فوجیوں نے مشرق کی طرف کچھ دور جا کر ان لڑکوں کی طرف رخ کر کے بندوقیں تان لیں چند لمحوں بعد میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے ہاتھ جوڑ کر منتیں کرتے رہے لیکن اس کا جواب گولیوں سے دیا گیا۔"[۴۳]

پروفیسر نور اللہ نے یہ منظر اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے دیکھا، وہ انجینئرنگ فیکلٹی کوارٹرز کی تیسری منزل پر مقیم تھے۔ گو کہ اب کیمپس میں چند نئی عمارتیں بنادی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس وقت پروفیسر صاحب واقعتاً میدان کا منظر صاف صاف دیکھ سکتے تھے۔

بعدازاں اسی طرح چند فوجی مغرب کی طرف سے کچھ اور زخمیوں کو لے کر آئے ان لوگوں کو بھی اسی طرح قتل کر دیا گیا، گولیوں کے زمین سے ٹکرانے سے گرد اڑ رہی تھی۔ اس وقت پروفیسر نور اللہ کے ایک کزن نے ان واقعات کو فلم بند کرنے کا مشورہ دیا۔ نور اللہ صاحب کو یاد ہے کہ ان کے پاس جاپانی ساختہ وی سی آر اور کیمرہ موجود تھا اور جہاں تک ان کی معلومات ہیں اس وقت تک ملک میں یہی واحد کیمرہ تھا۔ انھوں نے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ کیمرہ نصب کر دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ مائیکروفون کھڑکی سے باہر لٹکا دیا۔ جس دوران وہ یہ بندوبست کر رہے تھے لوگوں کے مزید دو گروپوں کو اسی طرح ٹھکانے لگا دیا گیا۔ پروفیسر نور اللہ کے مطابق ویڈیو کیمرے نے کل سات میں سے نہتے افراد کے تین گروپوں کے قتل کیے جانے کا منظر ریکارڈ کر لیا۔

باقی ماندہ گروپوں کو اسی انداز میں مشرق کی جانب سے لایا جاتا اور لاشوں کے ڈھیر پر قتل کر دیا جاتا۔ ایک موقع پر پروفیسر نور اللہ کی نظر چالیس فوجیوں پر پڑی یہ لوگ "لمبے اور گورے" تھے جو میدان کے شمال کی جانب قطار بندی کیے ہوئے تھے۔ یہ لوگ قتل عام میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ قتل کرنے والے افراد "قدرے، چھوٹے قد اور گہری رنگت" کے تھے۔ ان میں سے دس افراد مشرق کی جانب سے ۲۵ یا ۲۶ افراد کے ساتھ نمودار ہوئے۔ نور اللہ نے سوچا کہ یہ لوگ لاشوں کو ہٹانے کے لیے آئے ہوں گے۔ لیکن انھیں بھی قتل کر دیا گیا۔ ایک باریش شخص فائرنگ کے بعد بھی ہاتھ باندھ کر ان کی منتیں کرتا رہا۔ ایک فوجی نے اسے ٹھوکر مار کر اسے زمین پر گرانے کی کوشش کی لیکن وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا رہا۔ اس پر اس نے اسے دوبارہ گولی ماردی۔ اب شمال کی جانب قطار بند فوجیوں نے بڑے نظم وضبط کے ساتھ پریڈ کرنا شروع کر دی، جبکہ مارنے والے فوجیوں نے آخری مرتبہ ان لاشوں کا معائنہ کیا اور چند ایک پر دوبارہ گولیاں چلائیں۔ پھر یہ تمام لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ نور اللہ میدان میں پڑی لاشوں کی تعداد نہیں بتاتے۔

فیکلٹی کوارٹرز بلڈنگ نمبر ۳۴ میں قتل عام۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء کو ویسٹرن وائٹ ہاؤس سان کلیمنٹ، کیلیفورنیا میں سینئر ریویو گروپ کی میٹنگ میں درج ذیل بات چیت ہوئی:

ہنری کسنجر: ''کیا انھوں نے پروفیسر رزاق کو ماردیا؟ وہ میرے طالب علموں میں سے تھا۔''

ڈیوڈ بلی (سی آئی اے): ''میرا خیال ہے ــــ انھوں نے یونیورسٹی میں بہت سے لوگوں کو قتل کیا ہے''۔

ہنری کسنجر: ''یہ لوگ اس عرصے کے دوران شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۴۰۰ ملین ہندوستانیوں کو زیر تسلط نہیں رکھ سکے۔''[۴۴]

عجیب بات ہے کہ، پروفیسر عبدالرزاق کی موت پر افسوس کرنے کے بجائے ہنری کسنجر ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کے بارے میں بات کرنے لگے۔

پروفیسر رزاق اسی عمارت نمبر ۳۴ میں رہتے تھے جہاں گوھا ٹھاکرتا مقیم تھے اس تین منزلہ عمارت کے درمیان میں زینہ تھا اور اس کے دونوں جانب ایک ایک فلیٹ تھا۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے فلیٹ میں مقیم ایک جرمن اسکالر ۱۶ مارچ کو بینکاک روانہ ہو چکے تھے۔ دوسری عمارت میں شعبہ شماریات کے پروفیسر منیر الزمان رہائش پذیر تھے۔ شعبۂ معاشیات کے پروفیسر انیس الرحمٰن اور شعبۂ بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر رزاق پہلی منزل پر رہائش پذیر تھے۔ جبکہ زمینی منزل پر گوھا ٹھاکرتا اپنی فیملی کے ساتھ اور ایک مرحوم بنگالی پروفیسر عبدالحیٰ کی فیملی رہائش پذیر تھی۔[۴۵]

جب میں نے پروفیسر صاحبان کے قتل کی بابت سوال کیا تو بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج نے کہا ''فیکلٹی کوارٹرز کی جانب کوئی نہیں گیا تھا۔'' لیکن کوئی نہ کوئی گیا تھا بالخصوص بلڈنگ ۳۴ کی جانب۔ پانچ خاندانوں کے افراد شہادت دیتے ہیں کہ وہاں کیا واقعات رونما ہوئے تھے۔ سی آئی اے بھی غلط تھی؛ پروفیسر رزاق اس رات بلڈنگ ۳۴ میں موجود تھے اور زندہ سلامت بچ گئے تھے۔

جب طلباء کے ہالوں پر حملہ شروع ہوا تو گوھا ٹھاکرتا کے خاندان والے، جوئے تیرموئے بسنتی اور ان کی نوجوان بیٹی میگھنا پلنگ کے نیچے جا چھپے۔ جب فائرنگ کا سلسلہ تھما تو (گوھا ٹھاکرتا) بسنتی نے کھڑکی سے دیکھا کہ سڑک پر رکاوٹوں کے قریب فوجی گاڑیوں کا ایک قافلہ آکر رکا جس میں ایک جیپ بھی شامل تھی۔ اس کے بعد ایک افسر نے دروازے کی زنجیر کھینچ کر علیحدہ کی، بعدازاں وہ عمارت میں گھس گئے اور ہر فلیٹ کے دروازے لات مار کر کھولنے لگے۔

ایک افسر نے میگھنا کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اپنے خنجر سے جالی کاٹ کر پردہ ہٹا

دیا۔ مسز گوھاتھا کرتا نے سوچا کہ وہ پلنگ کے نیچے سے ان کے نظر آنے والے پیر دیکھ چکے تھے۔ مسز گوھاتھا کرتا نے اپنے شوہر کو "پنجابی" (جیکٹ) دیتے ہوئے آگاہ کیا "تیار ہو جاؤ۔ وہ تمھیں گرفتار کرنے کے لیے آگئے ہیں"۔ اسی اثناء میں افسر باورچی خانے کے دروازے سے ہوتا ہوا پیچھے کی جانب آگیا۔ نوکرانی کو ایک طرف کیا اور برآمدے میں آگیا، یہاں اس کا سامنا مسز گوھاتھا کرتا سے ہوا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں درج ذیل بتاتی ہیں:؟"

افسر نے پوچھا "پروفیسر صاحب ہے؟" مسز گوھاتھا کرتا نے جواب دیا، "ہے"۔ افسر نے کہا "ان کو لے جائے گا"۔

مسز گوھاتھا کرتا نے پوچھا "کہاں لے جائے گا بھائی" جب وہ گھر میں انھیں ڈھونڈ رہا تھا مسز گوھاتھا کرتا اس کا بازو پکڑے ادھر ادھر جا رہی تھیں اور وہ کہہ رہا تھا "لے جائے گا" (کذا)۔ اس کے پیچھے جا کر مسز گوھاتھا نے افسر سے کہا کہ "تم تو اندر داخل ہو چکے ہو پھر وہ سامنے والا دروازہ کیوں توڑ رہے ہیں"۔

اس پر افسر نے چلا کر کہا "ہم ادھر پر ہے یعقوب! دروازہ مت بھانکو" اور لاتیں مارنے کی آواز یک دم رک گئی۔"

بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے افسر نے پوچھا کہ "اور کوئی جوان آدمی ہے؟" تو مسز گوھاتھا کرتا نے جواب دیا "ہمارا ایک ہی لڑکی ہے۔" اس پر افسر نے کہا "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ لڑکی کو کوئی ڈر نہیں ہے"۔ پروفیسر صاحب اب تک اپنے بیڈروم میں "پنجابی" تھامے کھڑے تھے۔ افسر نے انھیں بائیں ہاتھ سے پکڑ لیا۔ مسز گوھاتھا کرتا نے انھیں "پنجابی" پہناتے ہوئے ان سے کہا "یہ آپ کو گرفتار کرنے آیا ہے"۔ افسر نے پوچھا "آپ پروفیسر صاحب ہے؟" پروفیسر صاحب نے جواب دیا، "ہاں"۔ تو افسر نے کہا "آپ کو لے جائے گا۔" پروفیسر صاحب نے پوچھا "مگر کیوں"؟ لیکن وہ انھیں کھینچتا ہوا گارڈن سے لے گیا۔

مسز گوھاتھا کرتا اپنی سینڈلز کے ساتھ ان کے پیچھے دوڑی لیکن پھر وہ نظر نہ آئے۔ نیچے سیڑھیوں پر زور زور کی آوازیں آنے لگیں، مسز گوھاتھا کرتا نے دیکھا کہ پروفیسر منیر الزماں، ان کے بیٹے، بھتیجے اور ایک اور بھلے انسان کو نیچے گھسیٹا جا رہا ہے اور مسز منیر الزماں دوہائیاں دے رہی ہیں۔ وہ ۵ مارچ کو ہی یہاں آئے تھے۔ مسز گوھاتھا کرتا نے کہا کہ آپ لوگ ان کے ساتھ زبردستی نہ کریں اور چلے جائیں ورنہ یہ گولی ماردیں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ ان کے شوہر کو بھی کینٹ لے گئے ہیں۔ باہر دو گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور میگھنا نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

افسر واپس لوٹ آیا اور ڈائننگ روم کا دروازہ توڑنے لگا۔ مسز گوھا تھا کرتا نے دروازے کا لاک کھول دیا۔ اس نے تمام باتھ روم دیکھے۔ اس نے میگھنا کا باتھ روم دیکھتے ہوئے پوچھا ''مجیب الرحمٰن کہاں رہتا ہے؟'' پریشانی کے عالم میں میگھنا نے کہا ''ہم اسے نہیں جانتے''۔ (اس کی مراد سیاسی رہنما سے تھی) اس پر افسر اس پر چلایا اور گارڈن سے ہوتا ہوا چلا گیا۔

سیڑھیوں کی جانب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور جب دیکھا گیا تو پروفیسر منیر الزمان اور دیگر تین افراد خون کے تالاب میں پڑے تڑپ رہے تھے اور فوجی دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ کسی نے پانی مانگا۔ رکاوٹیں ہٹادی گئیں اور گیارہ گاڑیاں وہاں سے روانہ ہوگئیں۔ مسز گوھا تھا کرتا کا خیال تھا کہ ان کے شوہر بھی انہی گاڑیوں میں تھے۔ لیکن جب مسز منیر الزمان نے چلا کر کہا کہ پروفیسر گوھا تھا کرتا باہر پڑے ہوئے ہیں تو مسز گوھا تھا کرتا کو اصل واقعے کا اندازہ ہوا۔

پروفیسر گوھا تھا کرتا گیٹ کے پاس گھاس والے ایک حصے پر اوندھے پڑے تھے۔ وہ ہلنے سے قاصر تھے لیکن ہوش میں تھے اور باتیں کر سکتے تھے۔ انھیں اندر لے جایا گیا اور ۲۷ مارچ کی صبح انہیں میڈیکل کالج ہسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہ چار دن تک زندہ رہے، لیکن ۳۰ مارچ کو ہسپتال ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی بیوی اور بیٹی کو ان کی لاش وہیں چھوڑ کر کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں نکلنا پڑا اور انھیں پھر کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ پروفیسر گوھا تھا کرتا کی کہانی ان کی بیوی اور بیٹی کی زبانی کچھ یوں تھی کہ فوجیوں نے ان کا منہ ہال کی جانب کیا اور ان سے ان کا نام اور مذہب پوچھا اور جواب ملتے ہی ان کی گردن پر بندوق رکھ کر گولی چلادی۔

جہاں تک بلڈنگ نمبر ۳۴ میں ہونے والے واقعات کا تعلق ہے اس سلسلے میں تمام بنگالی شہادتوں — پروفیسر انیس الرحمٰن، جہاں آراء امام، کالی رنجان شل، میں باہمی ربط پایا جاتا ہے — پروفیسر انیس الرحمٰن نے مرکزی دروازے پر ایک بڑا تالا لگا دیا اور خود کو یہ تاثر دیتے ہوئے اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ فلیٹ کے اندر بند کر لیا گویا کہ اندر کوئی موجود ہی نہیں اور جہاں آراء امام کے مطابق حیؔ کے خاندان نے بھی یہی کچھ کیا۔[۴۸] پروفیسر رحمٰن نے بھی پروفیسر منیر الزمان کے فلیٹ سے لوگوں کو گھسیٹے جانے اور گولیاں چلائے جانے کی آوازیں سنیں۔ ان کے دروازے پر جوتوں کی آوازیں سنائی دیں اور کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا اور گھنٹی بھی بجائی لیکن پھر واپس چلا گیا۔ انھوں نے پڑوس والے گھر میں فوجیوں کو جاتے دیکھا جہاں پروفیسر گوونڈا دیو رہتے تھے۔ اگلی صبح ۲۶ مارچ کو انھوں نے آوازیں سنیں کہ فوجی دوبارہ وہاں آئے اور بلڈنگ سے لاشیں جمع کرنے لگے۔ ۲۷ مارچ کو انھوں نے ''اسٹریچر پر ایک لاش کو میڈیکل کالج کی جانب لے جاتے دیکھا تھا''۔ یہ

دراصل زخمی حالت میں پروفیسر گوہا تھا کرتا تھے۔ اگلے دن کرفیو اٹھا لیا گیا اور تمام لوگ کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش میں وہاں سے فرار ہونے لگے۔ ان میں پروفیسر رزاق بھی شامل تھے جو لوگوں کو میڈیکل کالج جانے کا مشورہ دیتے رہے۔

جب میں نے بریگیڈیئر تاج سے پوچھا کہ ۲۵ مارچ کی رات ان کے پاس فیکلٹی ممبران کی کوئی فہرست بطور ہدف موجود تھی تو ان کا جواب نفی میں تھا۔ نیشنل سیکیورٹی کونسل کے سیکرٹری میجر جنرل عمر بھی کسی فہرست کے وجود سے انکاری ہیں۔ تاہم سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کرنے کے لیے فہرستیں یقیناً موجود تھیں جن کا آغاز شیخ مجیب الرحمٰن سے ہوا اور اس مقصد کے لیے کمانڈوز کو ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ بریگیڈیئر تاج کے مطابق وہ واحد شخص جس کا نام لے کر انھوں نے گرفتاری کے لیے ایک گروپ کو بھیجا تھا وہ کمال حسین تھا جو کہ ملا ہی نہیں۔[۴۹]

حسین نامی ایک اور شخص سیاسی گرفتاریوں کی فہرست میں شامل تھا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین ان ملزمان میں شامل تھا جو کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اگرتلہ سازش میں شامل تھے۔ علیحدہ سے ہمیں ان کی بیوی اور پڑوسی عبداللہ خالد سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ مارچ کی صبح ایک ''کیپٹن'' کی سربراہی میں فوجی انھیں ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے۔ معظم عموماً رات کو کہیں اور قیام کرتے تھے لیکن اس رات وہ گھر پر ہی موجود تھے۔ بلڈنگ کے چاروں آدمیوں، ایک دوسرے پڑوسی، خالد، ایک نوکر اور معظم حسین کو قطار میں کھڑا کر کے ان سے ان کے نام پوچھے گئے۔ باقی تینوں کو واپس اندر جانے کو کہا گیا۔ پڑوسی خالد کے مطابق جب معظم نے واپس اندر بھاگنے کی کوشش کی تو افسر نے کہا ''اسے ختم کر دو''، پھر فائرنگ کی آواز آئی جب انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لیفٹیننٹ کمانڈر معظم خون میں لت پت پڑا تھا۔ مسز معظم کہتی ہیں کہ اوپر والی کھڑکی سے انھوں نے فوجیوں کو ان کے شوہر کی لاش لے جاتے دیکھا۔[۵۰]

ریکارڈ شدہ وائرلیس کمیونیکیشن سے صاف اور تیز آواز سنائی دیتی ہے:

''۲۶ مار خور کو بتائیں کہ لیفٹیننٹ کمانڈر معظم کو پکڑنے گئے تھے، تو اس نے ریزسٹنس کیا جس میں وہ لیفٹیننٹ کمانڈر معظم مارا گیا۔ اس کی باڈی ہمارے پاس ہے۔ اوور۔''

''۲۶'' ''۳۲ پنجاب کے لیے کوڈ ہو سکتا ہے جس کا اندازہ اس بات سے ہوتا کہ راجر باغ پولیس لائنز کے لیے بھیجے جانے والے فوجیوں نے بھی یہی کوڈ استعمال کیا تھا۔ تاہم بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج، کمانڈنگ آفیسر ۳۲ پنجاب، کو کسی معظم کی گرفتاری اور قتل کے بارے میں کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ حسین

نامی شخص جو انھیں یاد تھا وہ اور جنھیں انھوں نے گرفتار کی کوشش بھی کی تھی وہ بیرسٹر کمال حسین تھا جو کہ سیاست دانوں کی فہرست میں شامل تھا۔ صرف وہ افسر جس نے معظم کو قتل کیا اس بات کی وضاحت کر سکتا ہے کہ اس نے کس انداز سے مزاحمت کی تھی کہ اسے زندہ پکڑا جانا ممکن نہ تھا۔

یونیورسٹی کی فیکلٹی بلڈنگ ۳۴ میں فوجیوں نے تمام فلیٹوں کی تلاشی لی تھی اور پکڑے جانے والے تمام بالغ مردوں کو مار ڈالا تھا— ان کے پاس کوئی خاص فہرست موجود نہ تھی۔ جبکہ گوھا تھا کرتا کے فلیٹ میں داخل ہونے والے افسر نے پوچھا تھا ''پروفیسر صاحب'' ہیں اور میگھنا سے بھی ''مجیب الرحمٰن'' کی رہائش کے بارے میں پوچھا تھا! میگھنا سمجھی کہ افسر پروفیسر انیس الرحمٰن کی رہائش کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو کہ بالائی منزل پر رہائش پذیر تھے۔ پروفیسر منیر الزمان کے کیس میں یہ کنفیوژن بھی پائی جاتی ہے کہ ان کا نام کسی فہرست میں شامل تھا یا نہیں کیونکہ وہ سیاسی طور پر کافی متحرک تھے۔ ان پروفیسر صاحب کا تعلق شعبۂ بنگالی سے تھا۔ جبکہ جن پروفیسر منیر الزمان کو نیچے گھسیٹا اور تین دیگر افراد کے ساتھ قتل کیا گیا ان کا تعلق شعبۂ شماریات سے اور وہ حال میں ہی یونیورسٹی کیمپس میں منتقل ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ رات کے آرمی آپریشن سے متعلق وائرلیس کمیونیکشن پر یہ باتیں کی جا رہی تھیں کہ لاشوں کو کیسے ٹھکانے لگایا جائے۔ ایک پیغام موصول ہوا جو کہ تمام یونٹوں کے لیے تھا:

''۲۶—۷۷ کی جانب سے پیغام۔ مارخور کو مطلع کریں کہ امام نے کہا ہے کہ فرسٹ لائٹ سے پہلے پہلے جتنی یہ ڈیڈ باڈیز ہیں اتنی (تعطل) اور باقی تمام متعلقین کو بھی بتادیں۔ اوور۔''

مذکورہ کمیونیکشن میں ۱۶، ۴۱ اور ۸۸ کے کوڈ کی یونٹوں کو بھی مخاطب کیا گیا گویا کہ انھوں نے پیغام وصول کیا ہو۔ بہت زیادہ گڑبڑ کے بعد ہیڈکوارٹرز کی آواز سنائی دیتی ہے جو ''۸۸'' سے بات کرتے ہیں، یہ وہ یونٹ ہے جو یونیورسٹی پر تعینات تھی: ''۸۸، جی ہاں، انھیں ٹھکانے لگانے کا بندوبست کریں۔ آپ علاقے کے مزدوروں کو بھی استعمال کر سکتے ہیں اور انھیں آبادی سے دور ٹھکانے لگائیں۔ اوور''—

اسی دوران اسٹاف کوارٹرز کو نذرِ آتش کر کے رابندر موہن داس اور اس کے خاندان کو کھلے آسمان تلے آنے پر مجبور کر دیا گیا۔ فوجیوں نے اس کے بڑے بھائی کی پٹائی بھی کی لیکن جب اس نے ہندی بولنا شروع کی تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ ہر کوئی وہاں سے جانا چاہتا تھا بشمول اس کے بھائی کے۔ فوجیوں نے جب پندرہ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے کا حکم دیا تو ابھی بھی پیچھے اکتیس افراد باقی

رہ گئے تھے۔ان لوگوں کو لاشیں اکٹھی کرنے اور جگن ناتھ ہال کے سامنے ایک مٹی کے گڑھے کے سامنے ڈھیر لگانے کو کہا گیا۔پھر انھیں مار دیا گیا۔فوجی پھر واپس آئے اور بقیہ افراد کو لے گئے اور ان کا بھی یہی انجام ہوا۔تمام لوگ ماسوائے رابندر داس اور ایک اور لڑکے کے مار دیئے گئے ۔انھیں بہت چھوٹا سمجھ کر تھپڑ مار کر فارغ کر دیا گیا۔

داس یہ تمام واقعات نہایت پرسکون ہو کر صحیح صحیح سناتا ہے۔اب وہ اپنے والد صاحب کی طرح پرووسٹ کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ہم جگن ناتھ ہال کے میدان میں بات کر رہے تھے۔اس نے پہلے اسٹاف کوارٹرز اور پھر اس گڑھے کی جانب اشارہ کیا۔جب داس ۲۶ مارچ کو دوپہر 1 بجے وہاں سے روانہ ہوا تو اس وقت تک لاشیں اس گڑھے میں ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔لاشوں کی تعداد کے بارے اس کا اندازہ کہ وہ پچیس کے لگ بھگ تھیں اس بات سے لگایا کہ جتنی لاشیں تھیں اتنے ہی اسٹاف ممبران کو وہ لاشیں اٹھوانے کے لیے لے گئے اور باری باری انھیں بھی مار دیا گیا۔

کالی رنجان شیل اگلی صبح یہ سوچ کر کہ فوجی چلے گئے ہوں گے، کمرے میں واپس آ گیا لیکن اسے وہاں دھر لیا گیا۔بجائے اس کے اس نے دیکھا کہ بچ جانے والے لوگ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔اسے بھی ایک چوکیدار پریاناتھ کی لاش دے کر کام پر لگا دیا گیا۔طلباء، اسٹاف ممبران اور خاکروبوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کو ایک درخت کے نیچے لاشیں اکٹھی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔سپاہی سگریٹ پیتے رہے اور ''بنگلہ دیش'' کا مطالبہ کرنے پر انھیں کوستے رہے۔خاکروبوں نے ان کی منت سماجت کی کہ وہ بنگالی نہیں ہیں اس لیے انھیں جانے دیا جائے؛ ان کے ایک گروہ کو وہاں سے لے جایا گیا۔شیل اور چند دیگر افراد کو اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں لے جایا گیا جہاں پروفیسر گوھا ٹھاکرتا مقیم تھے۔۔سیڑھیوں پر انھوں نے کئی لاشیں بکھری دیکھیں جنھیں انھیں نیچے لانا تھا۔شیل کے مطابق سپاہی بنگلہ دیشی جھنڈے اکٹھے کرنے اور قیمتی اشیاء لوٹنے میں مصروف تھے۔

شیل لکھتا ہے کہ اس نے گنتی نہیں کی کہ کتنی لاشیں اس نے اٹھائیں ۔اخیر میں وہ ایک اور چوکیدار، سنیل، کی لاش لاشوں کے ڈھیر کی جانب لے گیا۔وہاں اس نے یہ منظر بھی دیکھا کہ جن خاکروبوں کو پہلے علیحدہ کیا گیا تھا اب انھیں بھی قتل کیا جا رہا تھا۔جن لڑکوں نے لاشیں اکٹھی کی تھیں انھیں بھی قطار میں کھڑا کر کے قتل کر دیا گیا۔خاکروبوں کی بستی میں خواتین چلا رہی تھیں اور سپاہی ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔سنیل کی لاش کو لاشوں کے ڈھیر میں رکھتے ہوئے شیل کی نظر پروفیسر گوند ادیو کی لاش پر پڑی اور وہیں ان کی ایک جانب لیٹ گیا۔ بعدازاں نہ جانے کب تک وہ

خاکروبوں، چوکیداروں اور ان کے خاندانوں کی آہ وبکا سنتا رہا۔ فوجی اب کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ شیل فوراً ہی بستی کی جانب فرار ہو گیا![۵۱]

میں نے پہلی مرتبہ امریکہ میں ایک بنگلہ دیشی دوست سے سنا تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں آرمی کے ہاتھوں مارے جانے والے لوگوں کی کسی خفیہ طور پر فلم بندی کی تھی۔ یہ فلم بہت قیمتی ثابت ہو سکتی تھی اور ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو علی الصبح جگن ناتھ ہال کے سامنے ہونے والے واقعات سے متعلق ایک ناقابل تردید ثبوت بن سکتی تھی۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ مذکورہ فلم کو قومی خزانے کا حصہ ہونا چاہیے، اسے ہر شخص کو ٹیلی ویژن پر دکھایا جائے اور تمام تحقیقی مراکز میں اس تک رسائی کو ممکن بنایا جائے۔ مجھے امید تھی کہ بنگلہ دیش پہنچ کر میں وہ فلم دیکھ سکوں گی۔

تاہم، ڈھاکہ میں لوگوں نے بتایا کہ انھوں نے کئی سال پہلے وہ فلم ٹیلی ویژن پر دیکھ لی تھی اور وہ لوگ بھی اندازہ نہیں کر پا رہے تھے کہ یہ فلم کہاں بنائی گئی جنھوں نے عملاً اس جنگ میں حصہ لیا تھا۔ لبریشن وار میوزیم آف ڈھاکہ میں بھی یہ فلم موجود نہیں تھی۔ میں نے پروفیسر نور اللہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جنھوں نے یہ فلم بنائی تھی لیکن معلوم ہوا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر چکے ہیں اور بعد ازاں ان کا انتقال ہو گیا۔ بالآخر مجھے اس فلم کے چند سیکنڈ کے شاٹ برٹش چینل ۴ کے پروگرام میں دیکھنے کو ملے۔ یہ پروگرام ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ان مبینہ بنگلہ دیشی جنگی مجرموں کے بارے میں تھا جو برطانیہ میں مقیم تھے۔ اس فلم میں ایک اور آواز اوپر بھر دی گئی تھی اور صرف ایک گروپ کو قتل ہوتے ہوئے دکھایا گیا جبکہ پروفیسر نور اللہ کے مطابق انھوں نے ایسے تین گروپوں کی فلم بندی کی تھی۔[۵۲] مذکورہ فلم انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ فلم اس لائق ہے کہ اسے اصل اور مکمل حالت میں حاصل کیا جائے، اس کا تجزیہ کیا جائے اور اسے محفوظ کر کے تاریخی ریکارڈ کا حصہ بنایا جائے۔

کتنی ہلاکتیں ہوئیں؟

"۳۰۰ مارے گئے؟ کوئی زخمی یا گرفتار بھی ہوا؟ اوور۔"

"۸۸ مجھے صرف ایک بات کا پتہ ہے: ۳۰۰ مارے جا چکے ہیں۔ اوور۔"

"۸۸، جی، مجھے آپ سے اتفاق ہے، بات واضح ہے...... آپ کو کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔"

— افسران کے مابین یونیورسٹی میں ہونے والی ہلاکتوں پر تبادلہ خیال جس دوران مبینہ طور پر طلباء کے ہاسٹل میں لڑائی جاری تھی اسی وقت ریلے پیغام کے ذریعے

میدان سے بریگیڈ کمانڈر کو رپورٹ دی گئی: ''۸۸،۷۷ کی جانب سے تازہ ترین خبریں: کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے، لیکن بڑی تعداد میں عمارتیں موجود ہیں جنھیں عبور کیا جانا باقی ہے۔اب تک اس کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا ہے۔لیکن اسے فائرنگ کی مزاحمت کا سامنا ہے۔وہ اپنے پاس موجود ہر چیز کا استعمال کر رہا ہے۔اوور۔''

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج، کمانڈنگ آفیسر ۳۲ پنجاب اور خود ان کے اپنے بیان کے مطابق اس رات پورے آپریشن کے انچارج، بڑے وثوق کے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد کے بارے میں بتاتے ہیں۔انھوں نے مجھے بتایا کہ اقبال ہال میں ۱۲ افراد ہلاک ہوئے جن میں مشکوک کردار کی دو خواتین بھی شامل تھیں۔جبکہ جگن ناتھ ہال میں ۳۲ افراد ہلاک ہوئے اور سب کے سب آدمی تھے۔

بریگیڈیئر تاج کے مطابق ہدف بننے والے دو ہاسٹلوں میں ہلاکتوں کی تعداد ۴۴ تھی یہ تعداد اس تعداد سے زیادہ ہے جس کا اندازہ رابندر موہن داس نے لگایا تھا لیکن اس قسم کے حالات میں اس فرق کو بہت زیادہ حیران کن بھی نہیں کہا جاسکتا۔لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد موہن داس کے مطابق مزید ۲۹ اسٹاف ممبران کو بھی قتل کیا گیا اور اس طرح سے ہلاکتوں کی کل تعداد ۷۳ ہوجاتی ہے۔رقیہ ہال کی پرووسٹ، اختر امام سات ان اسٹاف ممبران (چوکیدار مالی اور لفٹ مین وغیرہ) کے نام بھی بتاتی ہیں جنھیں ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی رات پاک فوج نے قتل کیا۔دیگر ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کے بعد اختر امام لکھتی ہیں کہ قتل کیے جانے والے اسٹاف ممبران کی بیویوں، بچوں اور دوست احباب کو بھی ان کے کوارٹروں میں قتل کر دیا گیا۔اس طرح رقیہ ہال کے ریکارڈ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ۴۵ کے قریب تھی۔[۵۳]

بریگیڈیئر تاج کی جانب سے بیان کی گئی ہلاکتوں کی تعداد کو اصل چیلنج ۱۸ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل بشارت کے بیان سے ملتا ہے۔ان کی رجمنٹ یونیورسٹی پر تعینات تھی۔ ریکارڈ ہونے والی گفتگو میں ایک موقع پر آپریشن کے دوران غالباً صبح کے وقت بریگیڈ کمانڈر نے یونیورسٹی میں ہونے والی ہلاکتوں کی بابت دریافت کیا:

(افسر اے): ''......آپ کے خیال میں یونیورسٹی میں ہلاکتوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ آپ مجھے اپنے اندازے کے مطابق تعداد بتائیں۔مارے جانے والوں، گرفتار کیے جانے والوں اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کیا ہوگی؟ مجھے اندازاً بتایئے۔اوور۔''

(افسر بی): ''۸۸......تقریباً ۳۰۰۔اوور۔''

(افسر اے): ''بہت خوب...... ۳۰۰ مارے گئے؟ کوئی زخمی یا گرفتار بھی ہوا؟ اوور''۔

(افسر بی): ''۸۸...... مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ۳۰۰ مارے جا چکے ہیں۔ اوور۔''

(افسر اے): ''۸۸...... مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ بات واضح ہے۔ کچھ پوچھنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ایک مرتبہ پھر شاباش......''۔[۵۴]

اس گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بریگیڈ کمانڈر کو امید تھی کہ یونیورسٹی میں کچھ باغی زخمی یا گرفتار بھی ہوئے ہوں گے بالالفاظ دیگر انھوں نے اپنے ماتحتوں کو ہر شخص کو قتل کر دینے کے احکامات صادر نہیں کیے تھے۔ اس قسم کے فیصلے میدان عمل میں موجود کمانڈنگ آفیسر کی جانب سے لیے گئے تھے۔ تاہم بریگیڈ کمانڈر نے نہ صرف کمانڈنگ آفیسر کے فیصلے سے اتفاق کیا بلکہ ان سے یہ بھی کہا کہ انھیں کوئی وضاحت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ پروفیسر جوئے تیر موئے گوھا تھا کرتا، جو اس رات قتل ہوئے تھے، کی بیٹی پروفیسر میگھنا گوھا تھا کرتا بھی ہلاکتوں کی تعداد ۳۰۰ ہی بتاتی ہیں۔ یہ تو ایک جھلک تھی اس کمانڈنگ آفیسر کی جو گرفتاریوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔[۵۵]

ڈھاکہ یونیورسٹی میں شری شتولا کے مقام پر ۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی کیمپس میں قتل کیے جانے والوں کی یاد میں ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ فیکلٹی ممبران، طلباء اور اسٹاف کو ملا کر پورے سال کے دوران مرنے والوں کی تعداد ۱۴۹ تھی۔ بعض فیکلٹی ممبران اور طلباء جن کا نام وہاں درج ہے کسی اور وقت اور کسی اور مقام پر قتل کیے گئے تھے، اس طرح خود یونیورسٹی کی تحریر کے مطابق ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی درمیانی رات یونیورسٹی میں مارے جانے والے افراد کی تعداد ۱۴۹ سے کم تھی۔ حیرت انگیز طور پر مارے جانے والے اسٹاف کی تعداد ۲۹، بالکل وہی ہے جو کہ رابندر موہن داس نے بتائی ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ دو بٹالین کمانڈروں کی جانب سے بتائی جانے والی ۳۰ اور ۴۴ کی تعداد میں مطابقت کیسے پیدا کی جا سکتی ہے؟ دراصل طلباء کے علاوہ وہاں بہت سے دوسرے افراد بھی عسکری تربیت اور لڑائی کے لیے آئے تھے۔ کیا یہ وہی لوگ نہیں تھے جو مرنے والوں کی باقی ماندہ گنتی کو پورا کرتے ہیں؟ یا پھر یوں سمجھا جائے کہ مارنے اور مرنے والوں دونوں کی جانب سے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا؟

لاشوں کے ساتھ کیا کیا گیا؟ بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج نے میرے سوال کو پہلے ہی سے محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا کہ ''میدان میں کوئی لاش دفن نہیں کی گئی بلکہ تمام لاشیں ڈھاکہ میڈیکل کالج ہسپتال بھجوا دی گئی تھیں۔

جب صبح ہوئی تو تاج یونیورسٹی میں موجود نہ تھے۔اس رات خود ان کے مطابق انھیں راجر باغ پولیس لائنز جانا پڑ گیا تھا کیونکہ ان لوگوں کو "زیر" کرنے میں کافی وقت لگ رہا تھا۔انھوں نے وہاں پہنچتے ہی چند راکٹ فائر کیے اور بم برسائے جس سے ایک جانب تو دشمن کو خوفزدہ کرنے کا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا اور دوسری جانب عمارت کو بھی منہدم کردیا گیا۔گولہ بارود کے ایک ذخیرہ نے آگ پکڑ لی اور صبح 6:00 بجے تک راجر باغ کلیئر نہ ہوسکا۔[٥٦] تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بٹالین کو بعدازاں یونیورسٹی میں طلب کرلیا گیا تھا۔

جب کوڈ نمبر ۸۸ کی یونٹ سے یونیورسٹی میں آپریشن کی طوالت کے بارے میں وائرلیس کمیونیکشن کے ذریعے پوچھا گیا تو اس پیغام میں ایک خاص وقت کا ذکر ملتا ہے:

"۸۸فار۷۷-اب پونے سات بج رہے ہیں۔میں اس جگہ سے آٹھ بجے روانہ ہوجاؤں گا۔مجھے لاشوں کو اکٹھا کرنے اور انھیں ٹھکانے لگانے میں ایک گھنٹہ لگ سکتا ہے۔اوور"

بریگیڈ ہیڈکوارٹر: "۸۸-راجر-آپ انھیں ایک جگہ جمع کرسکتے ہیں۔اور کال سائن ۲٦ کو ان کے بارے میں اطلاع دے سکتے ہیں۔امام کہتے ہیں کہ انھیں بعد میں مکمل طور پر ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے۔فی الحال انھیں جمع کرکے دیکھ لیں کہ پولیس والے اور سویلین کتنے ہیں اور کال سائن ۲٦ کو اطلاع کریں وہ ان پر عمومی نظر رکھیں گے جس دوران آپ وہاں سے اپنے علاقے کی طرف کوچ کریں گے۔اوور"

"......۸۸راجر، فی الحال ہم انھیں جمع کررہے ہیں۔ہم انھیں ایک جگہ جمع کرکے ۲٦ کو کال کریں گے۔بہت بہت شکریہ۔اور کوئی بات؟ اوور"۔

[۲٦ کا کوڈ ۳۲ پنجاب رجمنٹ کے لیے تھا جو لیفٹیننٹ کرنل (بریگیڈیئر) تاج کی کمان میں تھی]۔

۲٦ مارچ کو اپنے اپارٹمنٹ سے فرار ہونے سے قبل پروفیسر نوراللہ نے دیکھا کہ دوپہر ایک بجے کے قریب بہت بڑے بلڈوزر کے ذریعے میدان میں کھدائی کی جارہی تھی۔شہید مینار کو مسمار کرتے ہوئے کیپٹن سرور کو بھی بلڈوزروں کا آنا یاد ہے۔۔۔ لیکن ان کے ذہن میں ان سے متعلق کوئی بدگمانی نہ تھی۔کیپٹن نے سوچا کہ لاشوں کے کھلا پڑے رہنے سے عوام میں وباء پھوٹ سکتی تھی اس لیے وہاں موجود لاشوں کو دفنایا جانا مقصود ہوگا۔جب ۲۷ مارچ کو کرفیو اٹھایا گیا تو بہت سے دیگر افراد کی طرح کولابا گن کے ڈاکٹر ابوالکلام بھی باہر آئے۔انھوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے جگن ناتھ ہال کے میدان میں انسانی اعضاء کو زمین سے باہر جھانکتے دیکھا تھا۔[٥٧]

جب میں نے پہلی مرتبہ جگن ناتھ ہال کے میدان "اجتماعی قبر" کے بارے میں سنا تو مجھے

یوں لگا کہ بنگلہ دیش کے آزاد ہوتے ہی قبر کھود کر لاشوں کو گنا گیا ہوگا، ان کی شناخت کی گئی ہوگی اور ان کے رشتہ دار انھیں باقاعدہ تدفین کے لیے لے گئے ہوں گے اور اس جگہ پر متعلقہ معلومات کے ساتھ یادگار تعمیر کی گئی ہوگی۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میدان کی ایک جانب صرف ایک یادگار تعمیر کی گئی ہے۔ میگھنا گوھا تھا کرتا کے خیال میں کچھ باقیات کی کھدائی کر کے انھیں وہاں منتقل کیا گیا ہے لیکن دیگر لوگوں کے خیال میں لاشیں ابھی بھی وہیں میدان میں مدفون ہیں۔ جنگی جنون سے سرشار جیالے بھی یہ بتانے سے قاصر رہے کہ آخر کیوں ان تمام لاشوں کے سائنسی تجزیات نہیں کروائے گئے یا مبینہ طور پر وہاں مدفون لوگوں کے رشتہ داروں نے اپنے پیاروں کی لاشیں کیوں واپس نہیں مانگیں۔ کچھ بنگلہ دیشی اس سلسلے میں سیاسی کشمکش اور بعدازاں فوجی حکومت کو بہانہ بناتے ہیں۔ لیکن شیخ مجیب تو ۱۹۷۵ء تک برسرِاقتدار رہے تھے اور ابتدائی سالوں میں عالمی رائے عامہ بھی بنگلہ دیش کے حق میں تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۵ء میں فوجی حکومت قائم کرنے والے ضیاء الرحمٰن نے بذاتِ خود آزاد بنگلہ دیش کے لیے جنگ میں بنفسِ نفیس حصہ لیا تھا۔

دارالخلافہ میں اتنی اہم جگہ پر اتنے مشہور واقعہ کے ضمن میں قبر نہ کھدوا کر بلاشبہ عالمی سطح پر بنگلہ دیش نے یونیورسٹی میں ہونے والے قتلِ عام اور اجتماعی قبر کے اپنے دعوؤں کو کمزور کر دیا۔ ممکن ہے کہ کھدائی کے نتیجے میں اتنی بڑی تعداد میں لاشیں نہ نکلتیں جتنی بنگالیوں نے بتائی تھیں۔ یہ امکان بھی موجود تھا کہ چند ایسے افراد کی شناخت ہو جاتی جو یونیورسٹی کے طلباء تھے ہی نہیں۔ ان باتوں سے قومیت پرستی کو تو دھچکا لگ سکتا ہے لیکن تاریخ صحیح رخ پر ہمارے سامنے آجاتی۔ بین الاقوامی مدد کے ساتھ سائنسی بنیادوں پر اب بھی معاملے کی تفتیش ممکن ہے۔ اگر بنگلہ دیشی ایسا چاہیں تو۔

جب رات کا آپریشن تقریباً مکمل ہو چکا تو لیفٹیننٹ کرنل (بریگیڈیئر) تاج انٹرکانٹینینٹل ہوٹل پہنچے جہاں بڑے بڑے سیاستدان اور غیر ملکی میڈیا کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ صحافیوں نے کہا کہ انھوں نے ''بہت زیادہ فائرنگ'' سنی ہے اور وہ لوگ صورتحال دیکھنے کے لیے وہاں جانا چاہتے تھے۔ اس پر لیفٹیننٹ کرنل تاج نے جواب دیا کہ عوام کو ایسا لگ رہا ہے کہ بہت زیادہ فائرنگ کی گئی ہے، لیکن فوجی نقطۂ نظر سے یہ کچھ خاص نہیں۔ انھوں نے کہا کہ وہ میڈیا کے لوگوں کو لے جائیں گے لیکن اس کے لیے انھیں پہلے اعلیٰ قیادت سے اجازت لینا ہوگی۔ لیفٹیننٹ کرنل تاج کے مطابق انھوں نے اجازت مانگی تھی لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ بعد میں چیف پبلک ریلیشنز آفیسر، بریگیڈیئر اے آر صدیقی وہاں آئے اور غیر ملکی میڈیا کے نمائندوں کو ملک بدر کر دیا گیا۔[۵۸]

ملٹری ایکشن کے بعد امریکی سفارتی پالیسی کو پاکستان میں مقبولیت حاصل نہ رہی۔ یہ بات

مشہور ہے کہ ڈھاکہ میں موجود امریکی قونصل جنرل ''آرچر بلڈ'' نے ڈھاکہ میں خدمات سرانجام دینے والے دیگر بیس امریکی افسران کی تائید میں پالیسی مخالف کیبل ۶ اپریل کو واشنگٹن بھجوایا۔ اس کیبل میں مشرقی پاکستان کے بحران میں امریکی عدم مداخلت کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ایک غصیلے سیکرٹری آف اسٹیٹ، ولیم راجرز نے ہنری کسنجر کی توجہ ''ڈھاکہ میں ہمارے لوگوں کی جانب سے افسوس ناک پیغام'' کہہ کر اس کیبل کی طرف دلوائی۔[۵۹] کسنجر کو اس بات سے اتفاق تھا۔ صدر نکسن اس معاملے میں امریکی پالیسی سے متعلق کوئی ابہام نہ رکھتے تھے: ''اہم بات یہ ہے کہ دماغ کو ٹھنڈا رکھا جائے اور کچھ بھی کرنے سے گریز کیا جائے۔ ہمارا کسی بھی لحاظ سے کوئی کردار نہیں بنتا''۔[۶۰] اس تنقیدی کیبل کے بعد آرچر بلڈ کو ڈھاکہ سے ٹرانسفر کر دیا گیا۔

مادی نقطۂ نظر سے عدم مداخلت کی اس پالیسی کے خلاف صدر نکسن سے حجت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ ایک نقطۂ نظر تھا جس میں اس کے اہم مشیروں کی رائے شامل تھی اور یہی نقطۂ نظر پورے مارچ کے مہینے بگڑے ہوئے حالات میں غیر متبدل رہا، اس نقطۂ نظر کے حامی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے الیکسز جانسن (Alexis Johnson) کہتے ہیں ''معاملے کو اس انداز سے دیکھا جائے کہ بڑے پیمانے میں عدم مداخلت کیسے ممکن ہے''۔ سی آئی اے ڈائریکٹر رچرڈ ہیلمز (Richard Helms) کہتے ہیں کہ ہمیں ایک ''خاندانی جھگڑے'' میں نہیں کودنا چاہیے اور ان کا ردِعمل یہ تھا کہ اس معاملے سے حتیٰ الامکان طور پر دور رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔[۶۱] اس کے علاوہ نہ صرف وائٹ ہاؤس بلکہ اسلام آباد میں موجود امریکی سفارتخانے کو بھی ڈھاکہ میں موجود قونصل جنرل آرچر بلڈ کی جانب سے بھیجی جانے والی رپورٹوں کے ''صحیح اور درست'' ہونے پر شکوک وشبہات تھے۔[۶۲] بعدازاں خود بلڈ کی سوانح حیات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ واقعتاً اس کی بہت سی رپورٹیں غلط تھیں کیونکہ نہ صرف وہ غیر مصدقہ ذرائع بلکہ بالواسطہ ذرائع سے حاصل کی گئی تھیں۔ پھر بھی ہم ملٹری ایکشن پر اس کی جانب سے امریکی عدم مداخلت کی پالیسی پر تنقید کو اس کی اخلاقی جرأت کہہ سکتے ہیں حتیٰ کہ کسنجر نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ اس کی بات میں وزن ضرور ہے۔[۶۳]

پاکستان میں اعلیٰ سطح پر فوج بھی اختلاف رائے کا شکار تھی۔ ۴ اپریل ۱۹۷۱ء کو لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی مشرقی پاکستان آئے اور ۱۰ اپریل کو انھوں نے جنرل ٹکا کی جگہ ایسٹرن کمانڈ کی آپریشنل کمان سنبھالی اور جنرل ٹکا خان نے گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اپنی کتاب میں اور مجھے انٹرویو دیتے وقت بھی جنرل نیازی ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی رات کو کیے جانے والے فوجی آپریشن کو 1919 میں برٹش آرمی کی جانب سے جلیانوالہ باغ میں سویلین کے

قتل عام کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ انھیں اختلاف اس بات سے نہیں تھا کہ ملٹری آپریشن ہو یا نہ ہو بلکہ جس انداز سے یہ آپریشن ہوا اس سے وہ نالاں تھے۔ ان کے مطابق جنرل ٹکا خان نے اصل ہدف سے انحراف کیا۔ انھیں بنگالی اہلکاروں کو غیر مسلح اور علیحدگی پسند رہنماؤں کو گرفتار کرنا تھا نہ کہ بے جا خون بہانا تھا۔ مثال کے طور پر ''باغیوں'' کے نام نہاد اڈوں پر پُر زور حملہ کرنے کی بجائے ان کا محاصرہ کر کے اور پانی، بجلی وغیرہ کے کنکشن منقطع کر کے انھیں منتشر کیا جاسکتا تھا۔ جنرل نیازی کا اندازہ تھا کہ چند ہی دنوں میں وہ لوگ ہتھیار ڈال دیتے۔[۶۴]

یہی اختلاف رائے نچلی سطح تک عام سپاہیوں میں بھی سرایت کرتا نظر آتا ہے۔ نذرالاسلام اور ملنے کے لیے آنے والے ایک اور دوست نے ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی رات ڈرتے ہوئے اپنے آرٹ کالج کے ہاسٹل کے کمرے میں گزاری جبکہ ساتھ ہی ایسٹ پاکستان رائفلز (EPR) کے کیمپ میں محاذ گرم تھا۔ اگلی صبح ان کی ملاقات ایک اور طالب علم شاہنواز سے ہوئی جو اپنی حس مزاح کے لیے مشہور تھا۔ یہ پوچھنے پر کہ باہر کیا ہو رہا تھا شاہنوار نے جواباً کہا ''جوئے بنگلہ، اب بھگتو'' ان کے فرار ہونے سے قبل ہی فوجی وہاں آئے اور ان کی عمارت کی چھت پر چلے گئے۔ انھوں نے پاوڈر نما کوئی چیز نیچے بستی پر پھینکی اور پھر فائرنگ کی تو بستی میں آگ بھڑک اٹھی۔ جب جلتی ہوئی جھونپڑیوں سے لوگ راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تو فوجیوں نے انھیں گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ نیچے آتے ہوئے انھوں نے دروازوں پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔ اندر موجود تین لڑکوں کو قطار میں کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا اور پھر قیمتی سامان لوٹنے لگے۔ اسلام کے جسم سے خون بہہ رہا تھا اور وہ موت کے انتظار میں وہیں لیٹا تھا۔

بعد ازاں دوسرے فوجیوں کا ایک گروپ آیا تو اسلام نے اپنی آنکھیں بند کیے رکھیں۔ اسلام کو یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ ان میں سے ایک سپاہی نے کہا ''اوہ خدا! ان جوانوں کو کس نے مار دیا اور کیوں مار دیا؟ آخر خدا تو ہے۔ ایک دِن حساب بھی تو دینا ہے''۔ جب انھوں نے تینوں کو دیکھا تو اسلام زندہ تھا، اس پر ایک نے دوسرے سے کہا ''پانی دو ــ یہ بچ جائے گا''۔ انھوں نے اسے پانی پلایا اور تھپکی دیتے ہوئے کہہ رہے تھے ''بیٹا زندہ رہو، بیٹا زندہ رہو''۔[۶۵]

باب چہارم:

وحشیانہ جنگ

گھیراؤ، بغاوتیں اور پاگل پن

"ہماری حکومت تشدد کی مخالفت کرنے میں ناکام ہوچکی تھی......ہم نے عدم مداخلت کا فیصلہ کرلیاہے،یہاں تک که اخلاقی سطح پر بھی، زمین پر عوامی تصادم جس کے لیے کم ازکم نسل کشی کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے ،ہمارے نزدیک محض ایک خود مختار ریاست کا اندرونی معاملہ ہے .غیر حکومتی امریکی افراد اس بات سے کراہیت کا اظہار کرتے ہیں .جبکہ ہم بطور حکومتی اہلکار موجودہ پالیسی سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں "۔

—اختلافی کیبل ڈھاکہ میں تعینات بیس امریکی فارن سروس افسران کی طرف سے توثیق شدہ از قونصل جنرل آرچر بلڈ بتاریخ ۶ اپریل ۱۹۷۱۔

ولیم راجرز: "یہ لوگ تشدد کی مذمت کرنے کی باتیں کرتے ہیں .جبکہ مشرقی پاکستانیوں کے ہاتھوں لوگوں کو قتل کیے جانے کی تصاویر موجود ہیں ۔"

ہنری کسنجر: "جی ہاں. ایک تصویر میں ایک مشرقی پاکستانی نے کسی کا سرپکڑا ہوا تھا. آپ کو یاد ہے جب انھوں نے کہا تھا که ۱۰۰۰ لاشیں وہاں موجود تھیں اور ان کی قبریں بھی موجود تھیں لیکن ہمیں ۲۰ بھی نہ مل سکیں ؟"

—سیکرٹری آف اسٹیٹ ولیم راجرز اور صدر کے اسسٹنٹ برائے نیشنل سیکیورٹی افیئرز ہنری کسنجر کے مابین ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو، بتاریخ ۱۶ اپریل ۱۹۷۱۔

کلکتہ کی جیل میں اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے پاکستان آرمی کے لیفٹیننٹ سید عطاء اللہ شاہ سوال در سوال کے جوابات دینے اور زخموں کی مرہم پٹی کے بعد بھارتی آرمی کی جانب سے دیئے گئے ایک میگزین کا جائزہ لیتے ہیں۔ان کے خیال میں ٹائم یا نیوز ویک تھا جس میں انھوں نے ایک تصویر دیکھی ۔ایک بنگالی نے مغربی پاکستانی شخص کا تن سے جدا سر اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ لیفٹیننٹ عطاء اللہ کو یہ تصویر دیکھ کر بجا طور پر ایک گہرا صدمہ محسوس ہوا کیونکہ جس شخص کا یہ سر تھا وہ اسے جانتے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس واقعہ کے رونما ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ہی وہ اس سے جدا ہوئے تھے۔

عطاء اللہ ان ۱۱ لوگوں میں سے ایک تھے جو ۲۷ بلوچ رجمنٹ کے ۱۵۵ افسروں اور جوانوں میں سے اس وقت زندہ بچ نکلے تھے جب لاتعداد باغی بنگالیوں نے کشٹیا میں ان پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ نیوز ویک کے ۱۲ اپریل ۱۹۷۱ کے شمارے میں ایک تصویر شائع ہوئی جس میں لوگوں کا ایک گروپ ایک سر کو پکڑے مسکرا رہا تھا۔ تصویر کے نیچے درج تھا: ''بنگالی باغی وفاق سے تعلق رکھنے والے ایک سپاہی کا سر دکھاتے ہوئے: 'ان کو تو مرنا ہی ہوگا'''۔ لیکن لیفٹیننٹ عطاء اللہ نے مجھے بتایا کہ وہ سر کسی فوجی کا نہیں تھا بلکہ ایک سول سرونٹ وقار نسیم بٹ کا تھا جس کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اور وہ کشٹیا کے مقام پر تعینات تھا۔ اس نے ان کے فوجی قافلے کے ساتھ جانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے درمیان ایک زمانے سے کام کر رہا ہے اور وہ اس کے اپنے لوگ ہیں۔ لہٰذا اسے ان سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔[۲]

اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے ۶ اپریل کو ڈھاکہ سے جاری ہونے والی اختلافی کیبل کا جواب ۷ اپریل کو دیا۔ یہ پیغام اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ برائے مشرق قریب اور جنوبی ایشائی ممالک سے متعلق معاملات جوزف سسکو (Joseph Sisco) نے تیار کیا تھا جبکہ اس کی توثیق سیکرٹری آف اسٹیٹ راجرز نے کی تھی۔ ''اس شکایت پر غور کرتے ہوئے کہ مغربی پاکستانی فوج کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم کے ضمن میں امریکہ نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے، سسکو کے علم میں بہت سی متضاد رپورٹیں آئی ہیں''۔[۳] جبکہ اپنی سوانح میں کسنجر نے بعدازاں پاکستان کی مدد سے چین کے ساتھ خفیہ سفارتکاری کو بھی امریکہ کی جانب سے ردِّعمل نہ ظاہر کرنے کی ایک وجہ بتایا ہے۔ جبکہ دوسری جانب سیکرٹری راجرز کہتے ہیں کہ آرمی ایکشن اور بنگالی قوم پرستوں کے ہاتھوں ظلم وتشدد کی متضاد رپورٹوں کے پیش نظر عدم مداخلت کی پالیسی ایک ''اچھا انتخاب'' تھی۔

ملٹری ایکشن کے شروع ہوتے ہی، باغی بنگالیوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے ظلم وستم اور جانی ومالی نقصانات کے بارے میں جو مختلف النوع خبریں موصول ہو رہی تھیں ان پر نکسن

انتظامیہ نے فوری طور پر کوئی ردِّعمل ظاہر کرنے اور کسی ایک فریق کے حق میں جھکاؤ ظاہر کرنے سے گریز کیا۔[۴] ان واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محض دو دہائیاں قبل جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے تحفظات کی بنیاد پر بننے والی یہ قوم نہ صرف مشرق و مغرب کی بنیاد پر منقسم ہوگئی بلکہ خود مشرق میں یہ تقسیم مذہب، رنگ و نسل اور لسانیت کی بنیاد پر تقسیم در تقسیم ہوتی نظر آئی۔ اس کی جڑیں گھروں کے اندر تک تھیں اور کبھی کبھی تو واقعتاً دو بھائی ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔

اس باب میں ملٹری ایکشن کے بعد سے ایسے دس واقعات کو بنیاد بنایا گیا ہے جو مختلف سطحوں پر ان تنازعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جن علاقوں میں یہ پرتشدد واقعات رونما ہوئے ان میں شنکھر یپارہ (قدیم ڈھاکہ میں ایک ہندو علاقہ)، جنجیرہ، جوئے دیوپور، کھلنہ، میمن سنگھ، سانتاہار، شنگیل، چٹاگانگ، کشٹیا اور کومیلا شامل ہیں۔ ان واقعات کو عینی شاہدین کی یادداشتوں حملہ آوروں اور بچ جانے والوں کی شہادتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا اور پھر دونوں فریقوں کے بیانات کا ایک تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جمع کیے جانے والے شواہد موجود ''قومی'' قصوں کے برعکس نظر آتے ہیں۔

شنکھر یپارہ: ڈھاکہ کے ایک ہندو علاقے پر آرمی کا حملہ

شنکھر یپارہ قدیم ڈھاکہ میں تنگ گلیوں پر مشتمل ایک ہندو علاقہ ہے۔ یہاں کے مکین سمندری سیپیوں کے کاروبار سے منسلک تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف دکانیں ہیں اور مکین ایک ہی وضع پر تعمیر شدہ گھروں میں رہتے ہیں۔ اب یہ کاروبار ماند پڑنے لگا تھا اور بہت سی دکانوں میں دیگر اشیاء بھی فروخت کی جارہی تھیں۔ سیپیوں کو کاٹنے والا اوزار ''شنکھیر کورات'' دونوں اطراف سے کاٹتا ہے اور بنگالی زبان میں اسے محاورتاً استعمال کیا جاتا ہے۔

i) آمیہ کمار سُور کی شہادت:

آمیہ کمار اب بھی سیپیوں کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ وہ دکان پر لکڑی کی بنی ہوئی ایک چوکی ''تخت پوش'' پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتا ہے۔ اس کی دکان میں ہندو دیوتاؤں کی تصاویر جابجا لٹک رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی سیپیوں کے کڑے بھی لٹکے ہوئے تھے جنھیں شادی شدہ ہندو عورتیں رواجاً پہنتی ہیں۔ پیچھے والے چھوٹے کمرے میں ماتا دیوی کا ایک قد آدم مجسمہ بھی نظر آرہا ہے۔ آمیہ بابو بتاتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں چندر بوس نے ایک جلوس کی شکل میں اس بازار کا دورہ کیا تھا اور روایتی انداز

میں سمندری سیپ (بطور بگل) بجائے جا رہے تھے۔ آمیہ بابو کے دو بیٹے اب کسی اور کاروبار سے وابستہ ہیں۔ لیکن ان کی خواہش ہے کہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو "شنکھ" کے کاروبار سے وابستہ رکھیں ــــ وہ کہتے ہیں کہ " یہ کام ان کی رگوں میں شامل ہے"۔[۵]

۱۹۷۱ء میں آمیہ کمار سُور کی عمر تقریباً ۳۰ برس تھی۔ اپنے دھیمے لہجے اور عجیب مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس سال کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ دکھوں اور خوشیوں سے بھرپور سال کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ ۲۶ مارچ کو دن کے وقت آرمی شنکھر یپارہ آئی۔[۶] فوجی چھتوں پر تھے۔ ۴۰ نمبر کا ایک شخص نلکا نتادتا اپنے گھر میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں دوڑ رہا تھا اسے ایک کھلی جگہ عبور کرنی پڑی: چھت پر کھڑے ایک فوجی نے اسے گولی مار دی۔ آمیہ سُور اپنے خاندان کے ساتھ گھر کے اندر ہی رہے اور زندہ بچ گئے۔

سنڈے ٹائمز میں اپنی رپورٹ کے بعد مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن کی مذمت کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں " شنکر پٹی میں بل کھاتے روڈ کی ناکہ بندی کر کے گھر گھر تلاشی کے دوران آرمی نے عورتوں، بچوں اور آدمیوں سمیت ۸۰۰۰ افراد کو قتل کیا"۔[۷] میسکر یناس نہ تو ان واقعات کے عینی شاہد ہیں اور نہ ہی وہ اپنی کتاب میں ان واقعات کی بابت ذرائع کا ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان واقعات کی صداقت کو کافی دھچکا لگتا ہے۔

میسکر یناس کی رپورٹیں ۱۹۷۱ء کی دیگر غیر ملکی پریس رپورٹوں کی مانند سچ اور جھوٹ کا ملغوبہ تھیں۔ اس کا انحصار اس پر تھا کہ آیا رپورٹر نے ایمانداری سے رپورٹنگ کی ہے یا وہ من و عن وہی تحریر کر رہا ہے جو کسی نے اسے بتایا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۳ جون کو سنڈے ٹائمز میں میسکر یناس کی جانب سے شائع ہونے والی رپورٹ میں اپریل میں کومیلا میں کیے جانے والے آرمی آپریشن سے متعلق عینی شاہدین کا ذکر ملتا ہے۔ یہ نہایت ہی مصالحے دار رپورٹ ہے جس میں وہ "مارو اور جلاؤ" مشن پر مامور افسروں کے نام تک بتاتا ہے۔ جب کہ اسی رپورٹ میں اور اپنی کتاب میں بھی اس نے بہت سے سنے سنائے قصے بیان کر دیئے ہیں۔ ۲۶ مارچ کو شنکھر یپارہ میں جو کچھ ہوا دل دہلا دینے والا تھا، لیکن وہاں کے رہائشیوں اور زندہ بچ جانے والے افراد کے مطابق کہانی وہ نہیں جو مشہور تھی۔

مکینوں کے مطابق آرمی نے گھر گھر تلاشی نہیں لی تھی۔ وہ صرف ایک گھر میں داخل ہوئے تھے جس کا نمبر ۵۲ تھا۔ مجھے کوئی وثوق سے نہیں بتا سکتا اس گھر کو نشانہ کیوں بنایا گیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ گھر دیگر گھروں کے مقابلے میں بڑا اور خوشحال دکھائی دیتا تھا۔ بعدازاں آمیہ سُور نے بذات خود

مکان کے آنگن میں چودہ سے سولہ کے درمیان لاشیں پڑی دیکھیں جن میں ایک شیر خوار بھی شامل تھا جو اپنے باپ کی گود میں تھا۔ باقی تمام مکین جو اپنے گھروں تک محدود رہے زندہ بچ گئے۔ لیکن انھوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالنے کی بجائے شنکھر یپارہ سے کوچ کرنے میں ہی عافیت جانی۔ آمیہ سُور کچھ ہی دن بعد بروز اتوار وہاں سے نکل گیا۔ غالباً یہ ۲۸ مارچ کا دن تھا۔ اس وقت تک باقی تمام لوگ جا چکے تھے اور شنکھر یپارہ تقریباً ویران ہو چکا تھا۔ درجن کے لگ بھگ لاشوں کو وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔

سُور خاندان بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد گھر واپس آیا۔ واپس آنے پر انھیں عمارتیں خالی اور ٹوٹی ہوئی ملیں۔ غالباً ان کی عدم موجودگی میں ''بہاری'' ان پر قابض ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس بارے میں آزاد بنگلہ دیش کی حکومت سے مدد حاصل کی لیکن کچھ زیادہ نہیں۔ ان معاملات میں آمیہ سُور نے قناعت سے کام لیا۔

ii) امر سُور کی شہادت:

آمیہ سُور نے مکان نمبر ۵۲ میں جو لاشیں دیکھی تھیں ان میں ایک لاش چندھن سُور اور دوسری اس کے شیر خوار بیٹے بدھادیو کی تھی۔ میں نے اس قصے کی بابت چندھن سُور کے سب سے بڑے بیٹے سے معلومات حاصل کیں جس کا نام امر سُور ہے۔ امر سُور کی دکان کا نمبر ۴۷ اور مکان کا نمبر ۵۱ تھا۔ امر سُور ایک متاثر کن شخصیت کا حامل تھا ـــ وہ خوبصورت، خوش گفتار اور ڈرامائی ذوق رکھنے والا انسان ہے۔ امر سُور نہ صرف پاکستان آرمی بلکہ آزاد بنگلہ دیش میں بھی اپنے خاندان پر بیتنے والے حالات سے نالاں دکھائی دیتا ہے۔[۸]

۱۹۷۱ء میں امر سُور جوان عمر تھا، وہ اپنے والدین، چار بھائیوں اور تین بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ۲۵ مارچ کی رات باہر گلی میں کچھ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ آمیہ سُور نے کہا، لگتا ہے کہ باہر گلی میں پولیس چوکی پر حملہ ہو گیا ہے۔ تاہم آرمی ۲۶ مارچ کو دوپہر کے وقت شنکھر یپارہ آئی تھی۔ چھتوں پر فوجی نظر آرہے تھے۔ امر کے والد نے اس سے کہا کہ دیوار پھلانگ کر گھر کے پیچھے سے بھاگ جائے۔ امر اپنی ایک مفلوج بہن کو لے کر دوڑا۔ اس کے والد نے سب سے چھوٹے بھائی کو اٹھا لیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا اور افراتفری کا عالم تھا۔ امر کے مطابق پاکستان آرمی نے عورتوں کو کچھ نہیں کہا اور ان میں سے بیشتر گھروں کے اندر ہی رہیں: وہ لوگ صرف جوانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

آرمی کے جانے کے بعد جب امر واپس لوٹا تو اس نے اپنے والد اور چھوٹے بھائی کی لاشیں دیکھیں۔ مکان نمبر ۵۲ میں چودہ پندرہ افراد مارے گئے تھے۔ امر کے مطابق اس کے والد کی لاش ''النا'' (کپڑوں کی الماری) کے ساتھ جھکی ہوئی تھی۔ شیر خوار بچہ زمین پر پڑا تھا۔ لوگوں نے لاشیں آنگن میں جمع کر دیں۔

اسی وقت کسی نے چندھن سُور اور شیر خوار بچے کی لاشوں کی تصاویر بھی اتاریں۔ امر کو معلوم نہیں تھا کہ تصاویر کس نے لیں۔ کسی نے اسے بتایا کہ جب وہ بھارت میں پناہ گزین تھے تو کلکتہ میں ان تصاویر کو نمائش کے لیے پیش کیا گیا تھا اور اسٹوڈیو کے مالک نے انھیں پرنٹ بھی دیا تھا۔[9] بعد ازاں یہ تصویر اخبارات اور کتابوں میں شائع کی گئی۔[10]

امر سُور کے مطابق مکان نمبر ۵۲ اسی روڈ پر واقع کالی مندر کی ملکیت تھا۔ یہ مکان دیگر مکانات کی نسبت بڑا تھا۔ اس گھر میں مارے جانے والے افراد میں سے امر کے والد چندھن سُور اور ''چٹادا''[11] عملی سیاست میں سرگرم تھے لیکن باقی تمام افراد غیر سیاسی تھے۔

مردوں کی تجہیز و تکفین کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہر شخص بھاگ رہا تھا۔ امر اور اس کے خاندان نے دریا پار کچھ دور ایک مقام پر پناہ حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد آرمی وہاں بھی پہنچ گئی۔[12] لوگ پھر اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگے۔ امر نے پھر اسی بہن کو سہارا دیا جو چل نہ سکتی تھی۔ اس کے دوسرے سب سے چھوٹے بھائی کو اس کی ماں نے لے لیا۔ اسی افراتفری میں یہ لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ایک بہن کو گولی لگی اور وہ گر پڑی۔ وہ سب مرنے والوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے ہی آگے دوڑتے رہے۔ جس بہن کو اٹھائے وہ دوڑ رہا تھا ایک گولی اس کے سر میں لگی اور وہ مر گئی۔ کئی دنوں بعد اس کی ملاقات اپنی ماں سے ہوئی تو اس نے ماں کو بہن کی موت کی خبر سنائی۔ اس کی ماں نے اس سے کہا کہ فرار ہوتے ہوئے اس نے چھوٹے بیٹے کو کسی اجنبی شخص کو تھما دیا تھا اور اب وہ کھو چکا ہے۔

اس کی ماں کو یقین تھا کہ دوڑتے ہوئے اس کی جو بہن گولی کا شکار ہوئی تھی وہ یقیناً زندہ ہوگی، اس لیے امر اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ اسے معلوم ہوا کہ کسی نے اسے ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ گولی اب بھی اس کے جسم میں تھی اور ڈاکٹر آپریشن کے لیے پیسوں کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ اپنے بینک گیا اور پیسے نکلوا کر ڈاکٹر کو دیئے اور پھر باقی خاندان والوں کے پاس چلا گیا۔ اس کی جان پہچان والے مسلمان شخص نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لگے ''الف'' کو ''ع'' سے تبدیل کرے یعنی ''امر'' سے ''عمر'' بن جائے۔

اس کے بعد ایک کشتی کے ذریعے ان کا خاندان بھارت چلا گیا۔ دلال نے ۱۰۰ روپیہ فی کس مانگا جسے ادا کر کے وہ کشتی میں سوار ہو گئے۔ لیکن اس وقت ملٹری اپنی جنگی کشتیوں میں وہاں پہنچ گئی اور لوگوں کو وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ بالآخر امر بھارت پہنچ ہی گیا۔ کلکتہ میں بارک پور اور بو بازار میں شنکھاری برادری کے بہت سے افراد ہیں۔ امر نے پھیری لگا کر کلکتہ کی گلیوں میں ربن بیچنا شروع کیے؛ لیکن اسے یہ کام بہت ہی گھٹیا محسوس ہو رہا تھا۔

بنگلہ دیش آزاد ہونے کے بعد انھیں پتہ چلا کہ ان کی زخمی بہن صحت یاب ہو چکی تھی اور آپریشن کے بعد ڈاکٹر اسے اپنے رشتہ دار کے ہاں لے گیا تھا۔ جبکہ گمشدہ بھائی کی کہانی اخبارات میں شائع کروائی گئی۔ ایک بھلے مانس مسلمان نے ان سے رابطہ کیا اور کہا کہ آ کر دیکھ لیں کہ جنگ میں اس کے پاس آنے والا بچہ کہیں ان کا بھائی تو نہیں ـــ اس طرح سے بچہ بھی مل گیا۔ معلوم ہوا کہ امر کی ماں نے دوڑتے ہوئے جس آدمی کو بچہ تھمایا تھا اس غریب کے اور بھی چھوٹے بچے تھے۔ اس نے ایک بے اولاد امیر شخص کو وہ بچہ دے دیا تھا۔ وہ شخص اپنی اولاد کی طرح اس بچے کی پرورش کر رہا تھا۔ اس نے بچہ اصل وارثوں کو دے تو دیا تھا لیکن اب بھی اس کی پرورش کی ذمہ داری اٹھانا چاہتا تھا۔ انھوں نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ بچہ وقتاً فوقتاً دونوں خاندانوں کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ یہ بھائی بعد میں بھارت چلا گیا۔ امر کے مطابق، اس کا کہنا تھا کہ اب اسے بنگلہ دیش میں رہنا برداشت نہ تھا۔

امر سُور بہت نالاں ہے۔ اس نے کہا کہ ''شہید دستان'' (شہیدوں کی اولاد) ہونے کے باوجود بھی آزاد بنگلہ دیش نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ اسے بالخصوص اس بات پر غصہ ہے کہ ان کے گھر کو قانونی تحویل میں دے دیا گیا ہے اور بہت سی اپیلوں کے باوجود اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ عوامی لیگ بھی کوئی امداد نہیں کرتی جس کی وجہ سے ۱۹۷۱ میں ان کا علاقہ آرمی کا نشانہ بنا۔

جنجیرہ: آرمی آپریشن اور سویلین ہلاکتیں

جب ۲۶ مارچ کی صبح ڈھاکہ یونیورسٹی اور دیگر جگہوں پر آرمی آپریشن مکمل ہو رہا تھا اسی وقت وائرلیس پر شریک یونٹوں کے مابین ہونے والی گفتگو میں دیگر اہم علاقوں کو بھی زیرِ بحث لایا جا رہا تھا:[۱۳]

(بریگیڈ میجر جعفر خان، ہیڈکوارٹرز): ''ہیلو ۸۸، دریا کی جنوبی سمت میں ایک علاقہ جنجیرہ ہے — میں اس کی ہجے کرتا ہوں 'جولیٹ'، 'انڈیا'، 'جولیٹ'، 'انڈیا'، 'رومیو'، 'الفا' — جنجیرہ۔ یہ علاقہ آپ کے محلِ وقوع کے لحاظ سے دریا پار جنوب میں ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ وہاں گولہ بارود ذخیرہ کیا جا رہا تھا۔ رومیوں اور سائیر

یونٹ کے پاس گشت کے بعد کچھ معلومات دستیاب ہوسکتی ہیں۔ آپ ان پر نظر رکھیں۔ اوور"

(لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان، کمانڈنگ آفیسر ۱۸ پنجاب): "میں وہیں ان سے نمٹنے جا رہا ہوں۔ اوور"

ڈھاکہ میں آرمی ایکشن کرنے کے بعد، ۱۸ پنجاب کی یونٹوں کو جنجیرہ "کلیئر" کرنے کے لیے روانہ کر دیا گیا، دریا پار اس جگہ آرمی کو نہ صرف گولیوں بلکہ مارٹر گولوں سے بھی مزاحمت کا سامنا تھا۔ اس لیے ایک رات، لیفٹیننٹ علی شاہ نے کسی بھی طرح اپنی دو پلاٹونوں کے ساتھ "نوکاؤں" (دیسی کشتیوں) کی مدد سے دریا پار کیا تاکہ جزیرے کی مشرقی سمت سے ناکہ بندی کی جا سکے، اور یہ کام صبح دیگر کمپنیوں کے حملے آور ہونے سے قبل ہی مکمل کرنا تھا۔[۴] امید کی جا رہی تھی کہ فرار ہونے کی صورت میں باغی مشرقی کی جانب ہی بھاگیں گے۔

لیکن ایک بات جس کی امید انھیں نہ تھی وہ یہ کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی سویلین افراد نے بھی اسی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد لیفٹیننٹ شاہ کی جانب دوڑتی ہوئی آ رہی تھی اور تقریباً سبھی غیر مسلح تھے۔ کوئی معقول بات نہ سوجھی تو اس نوجوان افسر نے اس بڑھتے ہوئے ہجوم کے سروں کے اوپر سے فائر کھول دیا۔ اس پر وہ لوگ مخالف سمت میں دوڑنے لگے جہاں سے حملہ آور یونٹیں آگے بڑھ رہی تھیں۔

اس طرح کے خوفناک واقعات باغیوں کو کچلتے وقت دیگر سویلین آبادیوں میں بھی پیش آئے جہاں فوجیوں کو اپنی جان بچانے، سویلین کو محفوظ رکھنے اور عسکریت پسندوں کو نشانہ بنانے کے لیے لمحوں میں فیصلے کرنا ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ "Sweap and Search" تلاشی کے دوران لیفٹیننٹ شاہ کا وائرلیس آپریٹر اسنائپر کی گولی کا نشانہ اس وقت بنا جب وہ شاہ کے عین عقب میں موجود تھا۔ کوئی بھی چیز جو کسی ایسی جگہ حرکت کرتی دکھائی دیتی جہاں اسنائپر بندوق لے کر بیٹھا ہوسکتا تھا یا تو وہ کوئی مسلح باغی ہوسکتا تھا یا پھر کوئی عام شہری۔ اگر فوجی ایسی صورت میں گولی چلاتے تو کسی سویلین کے مارے جانے کا خدشہ بھی موجود تھا اور ذرہ بھر توقف خود فوجی کو لقمۂ اجل بنا سکتا تھا؛ بہت سے موقعوں پر ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں فیصلے لینے پڑتے تھے۔

اس دن ان کے مطابق جنجیرہ سے بہت سا اسلحہ بازیاب کیا گیا لیکن کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

جوئے دیوپوراورغازی پور:مسلح باغی بنگالیوں کے ہاتھوں غیر بنگالی افراد اور ان کے خاندانوں کا قتل عام

۲۵-۲۶ مارچ کو آرڈیننس فیکٹری، غازی پور کے بریگیڈیئر کریم اللہ ڈھاکہ میں بری طرح پھنس گئے تھے، اور جنرل ٹکا خان سے مدد کی اپیل کررہے تھے کہ مغربی پاکستانی سپاہیوں پر مشتمل کم ازکم ایک کمپنی بھیجی جائے تاکہ فیکٹری کی حفاظت کو یقینی بنایا جاسکے اور مغربی پاکستانی اور دیگر غیر بنگالی خاندانوں کو بحفاظت ڈھاکہ لے جایا جاسکے۔[۱۵] ۲۶ مارچ کو جب ڈھاکہ میں ملٹری ایکشن جاری تھا، انھوں نے غازی پور رابطہ کیا اور انھیں معلوم ہوا کہ فیکٹری میں سب ٹھیک تھا اور ایک مغربی پاکستانی افسر میجر اسجد لطیف، جنھیں وہ اچھی طرح جانتے تھے، کی قیادت میں پہلے ہی 2EBR کی ایک پلاٹون وہاں پہنچ چکی تھی۔

۲۷-۲۸ مارچ کو بریگیڈیئر کریم اللہ کو نئے بنگالی کمانڈنگ آفیسر 2EBR لیفٹیننٹ کرنل رقیب کی جانب سے پیغام ملا کہ وہ فیکٹری واپس آجائیں۔ لیکن انھیں مشورہ دیا گیا کہ مغربی پاکستانی فوجیوں کے ہمراہ ہی وہاں جائیں۔ لیکن اس وقت کوئی بھی مغربی پاکستانی دستے موجود نہ تھے۔ ۲۹ مارچ کو علی الصبح پی اوایف غازی پور کے وائرلیس نے کام کرنا چھوڑ دیا اور جوئے دیوپور میں موجود 2EBR سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ گزشتہ دنوں کے تلخ تجربات کے پیش نظر بریگیڈیئر کریم اللہ کو خدشات لاحق تھے کہ فیکٹری میں موجود مغربی پاکستانی اور غیر بنگالی افراد سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد بریگیڈیئر جہانزیب ارباب نے اس بات کی توثیق کردی کہ 2EBR نے جوئے دیوپور میں بغاوت کردی ہے۔

بریگیڈیئر کریم اللہ اب بریگیڈیئر ارباب اور ۸ بلوچ کے دیگر افسروں اور جوانوں کے ساتھ جوئے دیوپور کی جانب بڑھے، انھوں نے اپنے ساتھ بنگالی بریگیڈیئر مجومدار، کمانڈر EPRC چٹاگانگ کو بھی لے لیا تاکہ وہ بنگالی زبان میں باغی اہلکاروں کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرسکیں۔ بنگالی 2EBR، 2IC، میجر صفی اللہ کے مطابق بریگیڈیئر مجومدار اس سے قبل ۲۵ مارچ کو جوئے دیوپور کے دورے پر گئے تھے اور انھوں نے فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ فوج کا حصہ ہوتے ہوئے حکومت وقت کے احکامات کی پابندی کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔[۱۶] بریگیڈیئر کریم اللہ کی لاگ بک سے ہمیں ۲۹ مارچ کو جوئے دیوپور اور غازی پور میں ان مناظر کی واضح تصویر ملتی ہے جوانھوں نے اس دن وہاں پہنچ کر دیکھے تھے۔

جوئے دیو پور میں راجبری کے مقام پر، جہاں 2EBR تعینات تھی، بٹالین کا ایک بھی فرد موجود نہ تھا اور جاتے ہوئے وہ لوگ اسلحہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ بنگالی کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل رقیب ایک کیپٹن کے ہمراہ سویلین کپڑوں میں وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اس معاملے سے مکمل طور پر عدم واقفیت کا اظہار کیا کہ پوری کی پوری بٹالین کب اور کیسے غائب ہوگئی؟ بریگیڈیئر کریم اللہ لکھتے ہیں کہ: ''سینئر جے سی او، جے سی او لائینز کی جانب اپنے خاندان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھاگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کوارٹرز سے دِل دہلا دینے والی چیخ وپکار سنائی دینے لگی۔ جے سی او کے خاندان کے آٹھ افراد کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ جب راجبری کی تلاشی لی گئی تو معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے تمام افسران اور جوانوں کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ مزید دس لاشیں برآمد کی گئیں جبکہ بہت سی لاشیں غائب تھیں۔ البتہ ان کے خون آلود کپڑے وہاں سے ملے تھے''۔

بریگیڈیئر مجومدار جو اس وقت پاکستان آرمی میں سینئر ترین بنگالی افسر تھے، بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے سیاسی مذاکرات کے جاری رہنے کے دوران شیخ مجیب الرحمٰن کو قائل کرنے کی پوری کوشش کی کہ فوجی محاذ پر بنگالیوں کی جانب سے پہل کرنے پر رضا مند ہوجائیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعدازاں مغربی پاکستان کی ایک جیل میں انھیں بطور قیدی تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اپنی تحریر میں مجومدار نے ۲۵ یا ۲۹ مارچ کو جوئے دیو پور میں اپنے دورے سے متعلق کچھ نہیں لکھا۔[۱۷]

2EBR کے بنگالی کمانڈنگ آفیسر، لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسین خان بھی، جنھیں ۲۳ مارچ کو ڈھاکہ میں معزول کیا گیا تھا، تفصیل کے ساتھ بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کے لیے اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہیں، وہ بھی اس سلسلے میں پاکستانی جیلوں میں دی گئی صعوبتوں کو قلم بند کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود بیان کرتے ہیں کہ ۲۵-۲۶ مارچ کی رات انھوں نے 2EBR کے 2IC میجر کے ایم صفی اللہ کو ڈھاکہ سے فون کر کے جوئے دیو پور چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کا فون موصول کرنے کے بعد میجر صفی اللہ پوری بٹالین اور اسلحے سمیت وہاں سے فرار ہوگئے۔[۱۸]

میجر (بعدازاں میجر جنرل) صفی اللہ بھی اپنی تحریروں میں اس فون کال کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے مطابق وہ مارچ کے اوائل سے ہی بغاوت کا سوچ رہے تھے اور انھوں نے اپنے سپاہیوں کو ہردم تیار رہنے کا کہہ دیا تھا۔ بعدازاں ''۲۷ مارچ کو بطور کمانڈنگ آفیسر میں جوئے دیو پور، غازی پور اور راجندر پور گیا اور 2EBR کے جوانوں کو مختلف مقامات پر اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

ان سب کو اپنی جگہ چھوڑ کر دوبارہ میمن سنگھ میں جمع ہونے کو کہا گیا۔ منصوبے کے مطابق ۲۸ مارچ کو سب نے اپنی اپنی پوسٹیں چھوڑ دیں اور ۲۹ مارچ کو میمن سنگھ پہنچ گئے''[19]

اپنی بنگالی تحریر میں صفی اللہ نے اس بات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ جب وہ اپنے ''منصوبے کے مطابق'' جوئے دیوپور سے نکلے تو مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے اہلکاروں اور ان کے خاندانوں پر کیا بیتی۔ اپنی انگریزی کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ وہ جلد ہی وہاں سے نکل گئے تھے، اور اس رات باقی کی بٹالین کو وہاں نکالنے کی غرض سے اپنے پیچھے میجر معین الحسین کو چھوڑ گئے تھے۔ جب باقی لوگ مکتا گچھا میں ان سے ملے تو ان کو یہ جان کر بہت ''دکھ'' ہوا کہ مغربی پاکستانی افسر کیپٹن ریاض ''شورش'' کے دوران ''دوطرفہ فائرنگ'' میں ہلاک ہو گئے تھے۔ وہ مغربی پاکستان کے باقی افسران اور ان کے خاندانوں کی ہلاکت پر خاموش ہیں۔[20]

اسی دوران بریگیڈیئر کریم اللہ غازی پور کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ کیپٹن نیازی کی کمان میں ایک کمپنی تھی۔ انھیں غازی پور میں فیکٹری پر قابض باغیوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔ فیکٹری کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ تمام بنگالی اہلکار ماسوائے چار کے فرار ہو چکے تھے۔ (کچھ جھڑپ کے دوران مارے گئے تھے)۔ باقی رہ جانے والے بنگالی اور فرار ہونے والے بنگالیوں کے خاندان مارے جانے کے خوف سے آہ و بکا کرنے لگے لیکن انھیں اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کی جانیں محفوظ ہیں۔ جبکہ وہاں موجود بچ جانے والے مغربی پاکستانی اور غیر بنگالی لوگوں کے مطابق جو کچھ باغی بنگالیوں نے ان کے ساتھ کیا وہ یکسر مختلف رویہ تھا۔

ان کے مطابق جب بنگالی افسران اور مزدوروں نے بغاوت کا آغاز کیا تو وہ میجر اسجد لطیف کو میگزین ایریا کی جانب لے گئے اور انھیں قتل کر دیا۔ انھوں نے وائرلیس آپریٹر نائیک محمد شریف کو بھی مار ڈالا۔ انھوں نے اسلحہ، گولہ بارود اور گاڑیوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے دفاع کے لیے خندقیں کھود لیں۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ایک بلاک میں جا کر مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالی اہلکاروں اور ان کے خاندانوں کو قتل کرنے کی بھی کوشش کی۔ ایک مغربی پاکستانی شخص کے پاس رائفل تھی اس نے کچھ دیر انھیں سنبھالے رکھا، اور ایک مرتبہ جب ان کے سروں پر جہاز منڈلانے لگے تو تمام باغی بھاگ کھڑے ہوئے، بعد ازاں وہ پھر قتل و غارت گری کے لیے لوٹ آئے۔ بریگیڈیئر کریم اللہ کے ۸ بلوچ کی کمپنی کے ساتھ وہاں پہنچنے سے قبل وہ لوگ پانچ افراد کو قتل کر چکے تھے جن میں ایک عورت اور ایک بچہ بھی شامل تھا۔

میجر اسجد کی لاش میگزین ایریا سے مل گئی۔ ان کی گردن، پیٹ اور بائیں بازو پر گولیاں ماری

گئی تھیں ۔ ''ان کا جسم ماسوائے چہرے کے مسخ کر دیا گیا تھا''۔ بریگیڈیئر کریم اللہ نے میجر اسجد کا جسد خاکی تدفین کے لیے ڈھاکہ روانہ کر دیا۔ باقی تمام لوگوں کو فیکٹری کے گراؤنڈ میں ہی دفنا دیا گیا۔[۲۱]

غازی پور کے بارے میں باغی بنگالی 2IC میجر صفی اللہ لکھتے ہیں کہ جب کمپنی نے فرار ہونے کی کوشش کی تو میجر اسجد لطیف نے ''انھیں روکنے کی کوشش کی۔ اس لیے ہمارے جوانوں کو انھیں ختم کرنا پڑا''۔ یہ بات وضاحت طلب ہے کہ میجر لطیف تن تنہا کس طرح سے پوری کمپنی کو روکنے کی کوشش کرنے لگے، یا یہ کہ انھیں لاک اپ میں کیوں بند نہ کیا جاسکا؟ صفی اللہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغربی پاکستانی کمپنی کمانڈر کو جو ٹنگیل میں اپنی بٹالین کی کمپنی کے ساتھ تعینات تھے غیر مسلح کر کے بنگالیوں نے قتل کر دیا گیا تھا۔[۲۲]

صفی اللہ کی تحریروں میں جوئے دیو پور میں مارے جانے والے مغربی پاکستانی اور غیر بنگالی اہلکاروں اور ان کے خاندانوں کے لیے ایک بنگالی افسر کو ذمے دار ٹھہرایا گیا ہے۔ تاہم 2EBR پر لگے غداری کے داغ کا سرکردہ لیڈر ہونے کے ناطے، میجر جنرل صفی اللہ کا نقطۂ نظر کہ بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑنے والی آرمی کے لیے کیونکر ضروری تھا کہ وہ غیر مسلح پاکستانی افسران، اہلکاروں اور ان کے خاندانوں کو جوئے دیو پور غازی پور اور ٹنگیل میں قتل کرے، دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میجر خالد مشرف نے بھی بغاوت کی تھی لیکن اس نے مغربی پاکستانی افسروں کو مارنے کے بجائے ہندوستانی حکومت کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔

کھلنہ: جوٹ ملز میں بنگالیوں کے ہاتھوں بہاریوں کا قتل عام

چپڑاسیوں کا سپروائزر رستم علی سکندر کریسینٹ جوٹ مل میں ''اسپورٹس کوٹے'' پر بھرتی ہوا تھا اور ۱۹۵۳ سے عوامی لیگ کا سرگرم رکن تھا۔[۲۳] اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے عسکری تربیت حاصل کی اور دوسروں کو تربیت دے کر ۱۹۶۹ میں تقریباً ۱۴۰۰ افراد پر مشتمل باہمی تنظیم بنائی۔ انھوں نے مارچ کے پہلے ہفتے سے ہی پریڈوں کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے مل کے دروازے پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں تھیں تاکہ نہ تو کوئی فوجی اندر جا سکے اور نہ ہی کوئی بہاری یا بنگالی ورکر مل سے باہر جا سکیں۔ یہ لوگ علاقے کی پولیس اور EPR (ایسٹ پاکستان رائفلز) کے اہل کاروں سے رابطے

میں تھے، لیکن ان کے پاس مل کے محافظوں سے چھینی ہوئی صرف پانچ بندوقیں تھیں۔

ابتداً انھوں نے بہاریوں سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ بنگالی اور بہاری پُرامن طریقے سے رہیں گے لیکن ایک رات چند بہاری پان لینے کے بہانے مل سے باہر چلے گئے۔ سکندر اور دیگر بنگالیوں نے سوچا کہ ان کے جانے کے پیچھے ضرور کوئی راز کی بات ہے۔ (گو کہ وہ اس شک و شبے کی کوئی بنیاد فراہم نہ کر سکے)۔

عبدالرب سردار اسپننگ ڈپارٹمنٹ کا سربراہ تھا اور اسے ماضی کے تجربات کی بنیاد پر عوامی لیگ (بنگالیوں) اور مسلم لیگ (بہاریوں) کے مابین ہونے والے تنازعات کا اچھا خاصا اندازہ تھا۔[۲۴] ۱۹۷۱ میں دولت پور تھانے کے بنگالی اہلکار اپنے اسلحے سمیت فرار ہو گئے۔ ایسی ہی کہانیاں دیگر تھانوں سے بھی سننے کو مل رہی تھیں۔ مل کے اندر ایک ''امن کمیٹی'' بنا دی گئی تھی، جس میں پانچ ممبران بہاریوں اور پانچ ممبران بنگالیوں سے لیے گئے تھے، کمیٹی کے ممبران لاٹھیاں لے کر مل کے اندر گشت کیا کرتے تھے۔ سردار کے مطابق مینیجر رحمت اللہ اور بہت سے دیگر افسران اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ تمام طبقات کے ساتھ برابر سلوک روا رکھا جائے۔[۲۵] مل کے باہر ۲۴ مارچ کی رات سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور اگلے ہی دن سے آرمی نے علاقے میں گشت شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ مل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہے تھے کیونکہ لوہے کے گارڈروں سے دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔

دو بنگالی پولیس افسران جو اپنی بندوقوں سمیت فرار ہو چکے تھے دریا کے راستے مل کی پچھلی دیوار سے اندر آ گئے اور پانی کی ٹنکی کے اوپر پوزیشن سنبھال لی۔ کچھ ایسا ہی پیپلز جوٹ مل میں بھی ہو رہا تھا۔ ۲۷ مارچ کو بہاریوں نے اپنے کوارٹر میں طبل بجانا شروع کر دیے۔ ان کے پاس دستی بم تھے اور بنگالی بھی ایسے ہی مسلح تھے۔ سردار کے مطابق بنگالیوں کی تعداد ۲۰۰ کے لگ بھگ تھی۔ حالانکہ بہاری تعداد میں کہیں زیادہ تھے لیکن جب دو بنگالی پولیس افسران نے اپنی بندوقوں سے بہاریوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کیا تو کچھ بہاری مارے گئے باقی بہاریوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس پر بنگالیوں کے ہاتھ جو کچھ لگا مثلاً ''ڈاس'' (درانتیاں) وغیرہ انھوں نے اٹھا لیا اور بہاریوں پر ٹوٹ پڑے۔ بچوں، عورتوں اور مردوں سب کو قتل کر دیا گیا ان کی لاشوں کو دریا برد کر دیا گیا۔ سردار کا خیال تھا کہ دیگر جوٹ ملوں میں بھی ایسا ہی کچھ ہوا تھا۔ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد وہ اسی رات کشتی کے ذریعے پہلے باریسال اور پھر بھارت چلا گیا اور وہاں اس نے باقاعدہ عسکری تربیت حاصل کی۔

میں نے سردار سے پوچھا کہ اس دن کتنے بہاری قتل ہوئے ہوں گے — درجنوں؟

سینکڑوں؟ ایک ہزار؟ اس پر سردار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں ہاں ہزار کے لگ بھگ'' پھر اپنی آواز ذرا دھیمی کرتے ہوئے بولا شاید مرنے والوں کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ چند حملہ آور بنگالی بھی مارے گئے تھے۔

کھلنہ سے باہر خالص پور کی نئی کالونی میں وہاں کے بہاری مکین اور ان واقعات میں زندہ بچ جانے والے افراد ایک چھوٹے سے کلب روم میں مجھے ۱۹۷۱ میں مل کے اندر ہونے والی اس نسل کشی کے بارے میں بتانے کے لیے جمع ہوئے۔ ان میں سے دو یا تین افراد ہی اصل داستان سنا رہے تھے جبکہ باقی افراد وقتاً فوقتاً ہاں یا نہ میں سر ہلاتے تھے یا بات کو مکمل کرنے میں مدد کرتے تھے۔[۲۶] تمام لوگ اس بات پر متفق تھے کہ سب سے زیادہ قتل عام کریسینٹ جوٹ مل میں کیا گیا اور اس کے بعد پیپلز جوٹ ملز میں۔ مارچ کے مہینے میں فسادات شروع ہونے کے بعد یوں ہوتا تھا کہ گلیوں میں پکڑے جانے والے چند بہاریوں کو مار دیا جاتا تھا لیکن ۲۸ مارچ کو ملوں کے اندر تو قتل عام ہوا تھا۔ سابک نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ کمپاؤنڈ سے باہر چائے پینے کے لیے گیا۔ جیسے ہی گڑبڑ شروع ہوئی تو یہ صورت ہوگئی تھی کہ نہ تو وہ واپس اندر جاسکتے تھے اور نہ ہی کسی کو باہر لاسکتے تھے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کو چھریوں سے، گولیاں مار کر۔۔۔ ہر ممکن طریقے سے قتل کیا جارہا تھا۔ لاشوں کو دریا برد کر دیا گیا۔ بہاریوں کے مطابق بنگالیوں نے ''پھانسی کھاٹ'' مقتل قائم کر رکھے تھے جہاں وہ بہاریوں کو ہلاک کرتے تھے۔۔۔ یہ ایسی حقیقت تھی کہ کمرے میں موجود تمام افراد نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔[۲۷] جب آرمی وہاں پہنچی تو بچ جانے والے افراد نے پاکستانی حکومت کو تمام حقائق سے آگاہ کیا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کتنے افراد مارے گئے تھے تو انھوں نے ''لاکھوں'' جواب دیا۔ جیسا کہ بنگالی خود اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے ہزاروں افراد کو قتل کیا، ایک محتاط تخمینے کے مطابق کئی ہزار بہاری۔۔۔ مرد خواتین اور بچے۔۔۔ اس واقعے میں بنگالیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔

۷ مارچ کو جب شیخ مجیب نے اپنی تاریخی تقریر کی جس میں آزادی کا صرف اعلان کرنا ہی باقی رہ گیا تھا، اس وقت ۲۲ فرنٹیئر فورس کے میجر ثمین جان بابر کھلنہ سرکٹ ہاؤس میں تھے، جو کہ وفاقی وزیر صبور خان کی رہائش گاہ کے بالمقابل تھا۔[۲۸] وہ ۱۹۷۰ کے وسط سے جیسور کینٹ میں تعینات تھے۔ ابلتا ہوا محسوس ہونے والا لاوا یکم مارچ کو پھٹ پڑا اور اس کے بعد سے مشرقی پاکستان میں عملاً ''مجیب کی حکومت'' قائم ہو چکی تھی۔ آرمی کو احکامات دیئے گئے تھے کہ وہ کینٹ ایریا تک محدود رہیں اور کسی واقعہ کے خلاف ردِّعمل کا اظہار نہ کریں۔ ۲۴ مارچ کی رات باغیوں کی جانب سے کھلنہ میں

کہیں کہیں فائرنگ کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ ۲۵ مارچ کو میجر بابر کو احکامات ملے کہ وہ شہر میں امن وامان قائم کرنے کے لیے کوشش کریں۔ ریڈیو اسٹیشن جانے والی یونٹ پر گھات لگا کر حملہ کر دیا گیا تھا اور میجر بابر کو ان کی مدد کے لیے نئی کمک کے ساتھ جانا پڑا۔ ان کے بھی کچھ افراد شہید ہوئے لیکن ان کے مطابق باغیوں کے کئی لوگ مارے گئے اور باقی فرار ہو گئے۔

ایک ہفتے کے بعد تک کھلنہ کے حالات قابو میں تھے اور میجر بابر دریا کے راستے ایک کشتی میں جوٹ مل کی طرف گئے۔ ان کی کشتی پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی بے شمار گلی سڑی اور مسخ شدہ لاشوں سے ٹکراتی ہوئی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ راستہ تلاش کرنا محال ہو رہا تھا۔ حالات کی سنگینی دیکھ میجر بابر جیسے قوی القلب فوجی کو بھی رونا آ گیا۔ مل کے اندر تین مذبح خانے قائم کیے گئے تھے۔ ایک پھانسی گھاٹ نما ڈھانچہ تیار کر کے وہاں رکھا گیا تھا۔ ان جگہوں پر بغدے، پنجہ اور دیگر اذیت پہنچانے والے آلات رکھے ہوئے تھے۔ زمین خون سے لت پت تھی۔ بعدازاں میجر بابر آرمی چیف حمید اور ایسٹرن کمانڈر نیازی کو بھی ان مذبح خانوں کے دورے پر لے گئے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ یہ رپورٹیں پریس تک کیوں نہ پہنچائی گئیں اس پر انھیں بتایا گیا کہ حکومت نہیں چاہتی تھی کہ بنگالیوں کو اس شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑے۔

جب کھلنہ میں حالات معمول پر آ گئے تو میجر بابر آپریشن کی ڈیوٹی پر واپس چلے گئے، وہ بیناپول میں ایک کمپنی کی کمانڈ کر رہے تھے، ابھی وہ ۱۰۷ بریگیڈ کی دیگر یونٹوں کے ساتھ بریگیڈئیر حیات کی کمان میں کھلنہ کے اردگرد اپنی پوزیشین سنبھالے ہی ہوئے تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ ایک دن پہلے ہی ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے گئے ہیں اور اب وہ لوگ بھی جنگ ختم کر دیں۔

میں نے نئی کالونی، خالص پور میں بہاریوں سے پوچھا کہ انھوں نے بعد میں بنگالیوں سے بدلہ نہیں لیا۔ انھوں نے جواب دیا ''ہم ایسا کیسے کر سکتے تھے؟ ہم تو چاروں اطراف ان کے نرغے میں تھے'' لیکن ان کی آنکھوں اور انداز سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ کرنل (میجر) بابر نے مجھے بتایا کہ انھوں نے بہاریوں کی جانب سے بدلے کی خبریں سنی تھیں لیکن فیلڈ میں ہونے کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر ان واقعات سے لاعلم تھے۔ ایک بنگالی منیجر نے جو کہ پلاٹینم جوٹ مل میں ملازم تھے مجھے بتایا کہ ایک بنگالی ''لائن سردار' ہارون کو اس مقام پر (جگہ دکھاتے ہوئے) بہاری ''ڈیتھ اسکواڈ'' نے اٹھایا اور لے کر باہر چلے گئے۔ اس کے بعد منیجر نے ایک مقام تک ان کا پیچھا کیا، اس کے مطابق وہ ایک کونے سے مڑ گئے جس سے آگے بوائلر تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس نے نہیں دیکھا، لیکن منیجر اور مل میں موجود دیگر بنگالیوں کا خیال تھا کہ ہارون کو بوائلر میں ڈال کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔

اس واقعے کی اہم بات یہ ہے کہ خود منیجر کے مطابق بنگالیوں کی تعداد مل میں بہاری ''ڈیتھ اسکواڈ'' سے کہیں زیادہ تھی۔ اگر بنگالی مزاحمت کرتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ بہاری اس شخص کو باہر لے جاتے۔ لیکن اتنی بڑی تعداد میں بنگالی بیٹھ کر بے بس ہارون کی موت کا تماشہ دیکھتے رہے کسی نے کچھ نہ کہا انگلی تک نہ اٹھائی۔

میمن سِنگھ: ''کینٹ'' میں بغاوت اورمغربی پاکستانیوں کا قتل عام

اگست ۱۹۷۱ کو پاکستانی حکومت کی جانب سے شائع کیا جانے والا ''قرطاس ابیض بابت بحرانِ مشرقی پاکستان'' ''بڑے بڑے المناک واقعات'' کی ایک فہرست ہے جس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انھی واقعات میں ۲۷مارچ ۱۹۷۱ کو میمن سنگھ کینٹ میں EBR/ EPR کی طرف سے ہونے والی بغاوت اور اس کے نتیجے میں گھروں اور بیرکوں میں مقیم مغربی پاکستانی افسروں اور جوانوں کا قتل عام بھی شامل ہے۔ اس قرطاس ابیض میں ڈسٹرکٹ جیل پر حملے اور شنکھر یپارہ اور دیگر نو'' کالونیوں'' کے مردوں کو قتل کیے جانے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ مبینہ طور پر خواتین کو مسجدوں اوراسکولوں میں اکٹھا کردیا گیا تھا جنھیں بعدازاں ۲۱ اپریل کو آرمی نے آپریشن کر کے بچالیا تھا۔[۲۹]

کئی پاکستانی افسروں کی یادوں میں آج بھی میمن سنگھ کے واقعات محفوظ ہیں۔ لیکن جب میں نے لبریشن وار میوزیم ڈھاکہ سے اس واقعے کے بارے میں استفسار کیا تو مجھے ابتدأ بتایا گیا کہ میمن سنگھ میں کینٹ کا کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔ جبکہ میمن سنگھ'' کینٹ'' کے واقعات خود میمن سنگھ کے علاقے میں زبان زدِ عام ہیں اور کہیں کہیں ہمیں ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ میمن سنگھ شہر میں مقیم محمد عبدالحق نامی معمر شخص نے'' کینٹ'' کی نشاندہی کی اور مجھے بتایا کہ میمن سنگھ کا قدیم کینٹ تو انگریزوں کے دور سے ہی وہاں قائم ہے البتہ بعد میں جدید کینٹ کی تعمیر بھی کی گئی ہے۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ اس مقام پر مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کو ۱۹۷۱ میں قتل کیا گیا تھا۔

ایک اور رہائشی شیخ سلطان احمد نے بڑے ہی جذباتی انداز میں بتایا کہ کس طرح وہ مغربی پاکستانی فوجیوں کو مارنے والے بنگالی فوجیوں کے حق میں نعرے لگاتے ہوئے مجمع میں شامل تھا جو کہ کینٹ کو گھیرے ہوئے تھا۔ لیکن وہاں ہونے والے واقعات کے بارے میں سناتے ہوئے ایک

موقع پر اس کی آواز بھر آئی۔ اس کے مطابق جب ڈھاکہ میں ہونے والے فوجی آپریشن کی خبریں میمن سنگھ پہنچیں تو کینٹ میں موجود مغربی پاکستانی اور بنگالی فوجیوں کے مابین لڑائی شروع ہوگئی۔ کینٹ کے باہر ہزاروں مقامی افراد بنگالی فوجیوں کی حمایت میں جمع ہوگئے۔ کسی سویلین کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ کافی دیر تک اندر لڑائی جاری رہی۔۔۔ مغربی پاکستانی فوجی جتنی دیر مزاحمت کر سکتے تھے انھوں نے مزاحمت کی۔ اس کے مطابق تقریباً ۱۰۰ کے لگ بھگ مغربی پاکستانی ''افسر'' وہاں قتل کیے گئے تھے۔ گوکہ ''افسران'' کی اتنی بڑی تعداد کا وہاں موجود ہونا مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس اندازے سے معاملے کی سنگینی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے جانی نقصان کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔

احمد کہتا ہے کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد جب لوگ اندر چلے گئے تو اس نے بھی لاشوں کو ان مقامات پر دیکھا تھا۔ احمد کے مطابق چند فرار ہونے والے مغربی پاکستانی فوجیوں کو لوگوں نے مار ڈالا۔ احمد نے کہا کہ اس نے کینٹ ایریا میں ایک شخص کو دیکھا تھا جسے بنگالیوں کے ہجوم نے گھیر رکھا تھا، وہ شخص اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کے بیوی بچے بھی ہیں، لیکن انھوں نے اسے گولیوں، اور برچھیوں کے وار کر کے مار ڈالا۔ اس نے کہا کہ یہ منظر دیکھ کر اس کی حالت خراب ہوگئی۔ بڑے افسوس کے ساتھ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ بنگالیوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں تک کو مار ڈالا، اور کچھ عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور انھیں اغوا کر لیا گیا۔ چند خواتین کو دوسرے بنگالیوں نے بچا لیا اور انھیں قریبی جیل میں چند ''افسران'' کے ساتھ بند کر دیا۔[۳۰]

سانتاہار: بنگالی سویلین کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کا قتل عام

''......سابقہ مشرقی پاکستان، موجودہ بنگلہ دیش میں اپریل ۱۹۷۱ کا مہینہ تھا، میں اپنی بٹالین کے ساتھ سانتاہار نامی علاقے میں پہنچا، وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک بہاری اکثریت والا علاقہ تھا۔ وہاں پہنچنے پر سب سے قابل ذکر چیز تعفن تھا، جس کی وجہ سے پوری فضا بری طرح سے متعفن تھی، ہمارا دم گھٹنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انسانی لاشیں گل سڑ رہی ہوں''![۳۱] یہ واقعہ کیپٹن (بریگیڈیئر) شوکت قادر کے قلم سے ہم تک پہنچا ہے۔

اپریل ہی کے مہینے میں ایک نوجوان افسر سیکنڈ لیفٹیننٹ جسے ابھی ابھی ۲۵ پنجاب میں تعینات کیا ہی گیا تھا۔ایک میجر کے ساتھ بذریعہ ٹرین راج شاہی سے ناؤ گاؤں کی جانب جارہا تھا۔انھیں اپنی یونٹ سے ملنا تھا۔انھیں بھی گلتی سڑتی لاشوں کی بدبو نے آلیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے اطراف تمام گڑھے لاشوں سے پر ہیں۔ مشرقی پاکستان میں نئے نئے تعینات ہونے والے دونوں افسران کے لیے یہ مناظر ناقابل بیان تھے۔ استفسار پر انھیں بتایا گیا کہ اس علاقے کو سانتاہار کہتے ہیں۔[۳۲]

ان واقعات سے ہٹ کر، جب حالات بہت زیادہ بگڑنے لگے تو ۲۰۵ بریگیڈ کو بطور تازہ کمک مشرقی پاکستان بھجوایا گیا۔ بریگیڈ میجر انیس احمد بریگیڈ ہیڈکوارٹر کے ساتھ فضائی راستے سے ڈھاکہ روانہ ہوا جب کہ باقی یونٹیں بذریعہ بحری جہاز چٹاگانگ روانہ ہوئیں۔ ابھی وہ ڈھاکہ ہی میں تھے کہ ایک جے سی او جوئے دیوپور سے آیا۔۔۔اس نے بتایا کہ جوئے دیوپور میں ایسٹ بنگال یونٹ نے بغاوت کردی اور وہاں موجود تمام مغربی پاکستانی افسروں اور جوانوں کو ان کے خاندانوں سمیت قتل کردیا گیا تھا جس میں خود اس کا خاندان بھی شامل تھا۔[۳۳]

اپریل کے دوسرے نصف میں میجر انیس کو بوگرہ جانے کے احکامات ملے۔ وہ ٹرین کے ذریعے بوگرہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ابھی وہ سانتاہار سے میلوں دور تھے کہ لاشوں کی بدبو نے انھیں پریشان کردیا۔ وہاں پہنچنے پر انھوں نے دیکھا کہ پٹڑیوں اور پلیٹ فارمز پر چاروں طرف سڑی ہوئی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ انھوں نے وہاں چند گھنٹے قیام کیا اور ڈویژنل ہیڈکوارٹر کے لیے رپورٹ تیار کی۔ اسی اثناء میں چند زندہ بچ جانے والے بہاری وہاں آگئے اور تمام واقعات کی روداد ان کے سامنے بیان کی۔

۱۳ فرنٹیئر فورس کے بریگیڈیئر (کیپٹن) قادر ان واقعات کا آنکھوں دیکھا حال سناتے ہیں جب انھوں نے اپنی یونٹ کے ساتھ اس ویران بستی کی گھر گھر تلاشی شروع کی۔ انھیں ایک بلڈنگ کا دروازہ کھولنے میں کافی مشکل پیش آرہی تھی۔ "بالآخر جب ہم دروازہ کھولنے میں کامیاب ہوئے، تو جو منظر ہمارے سامنے تھا وہ میری زندگی کا بدترین اور خوفناک ترین منظر تھا: یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا سائز ۱۰×۱۲ فٹ ہوگا، یہ کمرہ بچوں کی لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ان بچوں کی عمریں چند ماہ سے لے کر چند برسوں کے درمیان تھیں۔ لگتا تھا کہ ان بچوں کو پیروں سے پکڑ کر ان کے سروں کو دیواروں سے مارا گیا تھا، دیواریں انسانی کھوپڑیوں اور مغز سے داغ دار تھیں...... مجھ سمیت کوئی شخص وہاں ایسا نہ تھا جو پھوٹ پھوٹ کر رویا نہ ہو۔جب ہم نے انھیں دفنایا تو گنتی میں چونتیس بچوں کی لاشیں وہاں موجود تھیں"۔[۳۴]

بریگیڈیئر شوکت قادر زور دے کر کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی سنگین واقعات کی ذمہ داری ریاست پر نہیں آتی۔ لیکن ذاتی طور پر ان کے مشاہدے میں آنے والا یہ سنگین ترین واقعہ تھا۔ سانتاہار میں یہ واقعہ دیکھنے کے بعد ان کی یونٹ میں ایک فوجی گرفتار شدہ بنگالیوں کے سر پھوڑنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اس قسم کا ایک واقعہ ۱۸ پنجاب کے کیپٹن سرور کے ساتھ راج شاہی جاتے ہوئے ایشوردی سے آگے ایک ریلوے جنکشن پر پیش آیا۔[۳۵] بہاری ریلوے ورکروں کے کوارٹروں کے درمیان ایک تالاب تھا۔ کیپٹن سرور کہتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے دیکھا کہ تالاب اور ارد گرد کا علاقہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کو درندگی کے ساتھ قتل کیا گیا تھا۔ عورتوں کی عصمت دری کرکے ان کے ٹکڑے کر دیے گئے تھے اور شیر خواروں کی لاشیں نیزوں کی نوکوں پر تھیں۔ کیپٹن سرور کہتے ہیں کہ ان کا ایک نوجوان ساتھی افسر ان المناک مناظر کو دیکھ کر غصے سے پاگل ہوگیا تھا۔ انھوں نے اس قتل عام کی تصاویر اتارنے کے بعد متعلقہ فوجی افسر کے حوالے کر دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تصویر میڈیا تک نہ پہنچ پائی۔

حکومت پاکستان کے قرطاس ابیض میں شائع ہونے والے تخمینے کے مطابق سانتاہار۔۔۔ ناؤگاؤں میں تقریباً ۱۵۰۰۰ (پندرہ ہزار) بہاریوں کا قتل عام کیا گیا تھا۔

چٹاگانگ: لاقانونیت کا راج

''سیاسی و سماجی انتشار...... ہر شخص ہر دوسرے شخص کے ساتھ جو چاہتا کرنے میں آزاد تھا۔'' یہ الفاظ پاکستان آرمی کے ایک افسر کے تھے جو چٹاگانگ میں مارچ کے اواخر پیدا ہونے والی میں صورتحال کا خلاصہ بتانا چاہ رہے تھے۔

۲۵ مارچ کو کومیلا میں تعینات بریگیڈیئر اقبال شفیع کو جنرل ٹکا خان کی طرف سے ایک کال موصول ہوئی:[۳۶] کہ چٹاگانگ میں بنگالی اہلکاروں نے بغاوت برپا کر دی تھی اور بریگیڈیئر صاحب کو فی الفور وہاں کے لیے روانہ ہونا تھا۔ بریگیڈ کے مختلف یونٹ اپنے زیر کنٹرول وسیع علاقے کے طول و عرض میں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ پھیلاؤ سلہٹ کے شمال سے چٹاگانگ کے انتہائی جنوب تک تھا۔ آرٹلری یونٹ ۵۳ فیلڈ رجمنٹ کو کومیلا میں چھوڑ کر بریگیڈیئر صاحب ۲۴ فرنٹیئر فورس کے ساتھ جو لیفٹیننٹ کرنل شاہ پور کی کمان میں تھی چٹاگانگ کے لیے روانہ ہوگئے۔ سینکڑوں میل کے اس سفر میں دو بڑے دریاؤں کو پیدل اور دیہاتی کشتیوں کے ذریعے عبور کرنا پڑا کیونکہ تمام پل تباہ کر دیے گئے تھے۔ وائرلیس سیٹ نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چٹاگانگ کے قریب پہنچ کر لیفٹیننٹ

کرنل شاہ پور ایک اسنائپر کی گولی کا نشانہ بن گئے۔

میجر جنرل مٹھا لکھتے ہیں کہ ’’تمام آپریشن منصوبے کے تحت چل رہے تھے ماسوائے اس کے کہ HQ53 بریگیڈ سے رابطہ قائم نہیں ہو پا رہا تھا، یہ بریگیڈ کومیلا سے چٹاگانگ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوئی تھی‘‘۔ وہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان کی تلاش میں نکلے اور بالآخر چٹاگانگ سے دس میل کے فاصلے پر یہ گمشدہ یونٹ انھیں مل گئی۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ ’’بریگیڈ کمانڈر (اگر میں بھول نہیں رہا ہوں تو اقبال شفیع) سے میری ملاقات ہوئی...... ان کے ساتھ صرف ایک بٹالین تھی اور بٹالین کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل شاہ پور کو صرف دس منٹ پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ بہت پرسکون اور پر عزم نظر آرہے تھے ...... انھوں نے مجھ سے کہا کہ انھیں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے اور جلد از جلد وہ چٹاگانگ پہنچ جائیں گے‘‘۔[۳۷]

بالآخر بریگیڈیئر شفیع چٹاگانگ پہنچ گئے اور بحریہ سے آرٹلری کی مدد لیتے ہوئے انھوں نے EPR سینٹر کو محفوظ بنالیا۔ گو کہ ۲۴ فرنٹیئر فورس ایک پٹھان رجمنٹ تھی، اس کا سیکنڈ ان کمانڈ ایک بنگالی افسر میجر امجد تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل شاہ پور کی شہادت کے بعد بریگیڈیئر شفیع نے بٹالین کی کمان اپنے ہاتھوں میں لے لی اور میجر امجد کو 2IC بنادیا۔ یہ بنگالی افسر آخری دم تک پاکستان آرمی سے وفادار رہا اور جنگ کے بعد بھارت میں بطور جنگی قیدی قید بھی رہا۔

تاہم ایک اور بنگالی افسر 8EBR کے میجر ضیاء الرحمٰن نے بغاوت کر دی اور اپنے ہی کمانڈنگ آفیسر کو مار ڈالا جو کہ مغربی پاکستان سے تھے۔ جس وقت بریگیڈیئر شفیع پاکستان ملٹری اکیڈمی میں انسٹرکٹر تھے اسی دوران ضیاء اور ارشاد (دونوں بعد میں بنگلہ دیش کے صدر بنے) بطور کیڈٹ زیر تربیت تھے۔ بریگیڈیئر شفیع بتاتے ہیں کہ انھوں نے ضیاء کا اگلے چند ہفتوں تک تعاقب کیا اس تعاقب میں وہ چندرا گھونا، کاپتائی رانگامائی اور رام گڑھ تک گئے لیکن اس کے بعد ضیاء سرحد پار کر کے بھارت جانے میں کامیاب ہو گیا۔ چکما کے سردار راجا تری دیو رائے اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ ضیاء اور اس کے ساتھی پاکستانی فوجیوں کے میزائلوں کے حملوں کی زد میں آگئے (میزو بھارت سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے) جب چکما کے علاقے سے ضیاء نے راہ فرار اختیار کی تو چکما کے لوگوں نے اس کی مدد کی۔[۳۸]

شمشیر جبین چودھری 8EBR میں میجر ضیاء کا ایڈجوٹنٹ تھا اور میجر ضیاء کے ساتھ بغاوت کرنے والوں میں شامل تھا۔ وہ چٹاگانگ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اپنے سابقہ ہم وطنوں اور ساتھیوں سے برسرپیکار تھا اور اس کے ساتھ ایک باغی ساتھی کیپٹن ہارون احمد چودھری

(بعد ازاں میجر جنرل اور بنگلہ دیشی سفیر) بھی شامل تھا۔ تاہم شمشیر مبین چودھری بھارت فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کلورگھاٹ برج پر جھڑپ کے دوران 11 اپریل کو وہ شدید زخمی ہوگیا اور اسے گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں پورا سال اس کا وقت بطور قیدی چٹاگانگ اور ڈھاکہ کے فوجی ہسپتالوں میں گزرا۔[۳۹]

مشرقی پاکستان میں آنے والی ۲۰۵ بریگیڈ کی نئی کمک کو بھی چٹاگانگ جانے کے احکامات دیے گئے۔ ائیرپورٹ باغیوں کے حملوں کی زد میں تھا اور کمانڈو فورس کے بانی جنرل مٹھا کو ائیرپورٹ کے دفاع کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔[۴۰] میجر انیس ایک C-130 میں فائرنگ کی زد میں سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچے۔ انھیں کئی دن اہم یونٹوں پر دفاعی پوزیشن اختیار کیے ہوئے گزر گئے۔ پورے چٹاگانگ میں لاشیں بکھری پڑی تھیں؛ وہاں بھی قتل عام ہوا تھا۔ علاقے کے لوگ آرمی کے اہلکاروں کو دل دہلا دینے والی داستانیں سنا رہے تھے۔ انھیں بتایا گیا کہ کرنافلی مل میں بنگالیوں نے مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کو ان کے خاندانوں سمیت کلب ہال میں جمع کر کے قتل کردیا۔ میجر انیس وہاں پہنچے اور انھوں نے لاشوں کے انبار دیکھے — صرف ایک عورت اور بچہ فلیٹ میں زندہ بچ گئے تھے۔ مرنے والوں کو اجتماعی قبروں کے سپرد کردیا گیا۔[۴۱] اپریل کے اواخر یا مئی کے اوائل میں آرمی ایوی ایشن کے کیپٹن (لیفٹیننٹ جنرل) علی قلی خان فضائی راستے سے چٹاگانگ پہنچے۔ انھوں نے کرنافلی مل کا رخ کیا۔ کلب ہاؤس میں اب تک قتل عام کے نشانات موجود تھے — گھروں کے درودیوار اور سیڑھیاں خون کے دھبوں سے بھری پڑی تھیں۔[۴۲] غیرملکی میڈیا میں بھی مل کے اندر غیر بنگالیوں کے قتل عام کی رپورٹیں پیش کی گئی تھیں۔[۴۳]

راجاتری دیورائے نے بھی چٹاگانگ میں پہلی ''افراتفری'' کے واقعات کو تحریر کیا ہے لیکن تمام اطراف سے کارروائیوں کا حال مبالغے کے ساتھ لکھتے ہیں۔ ان کے ایک انکل (چچا/ماموں) اور دو کزنوں کو مبینہ طور پر فوجی لے گئے تھے جو پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ جب کہ دوسری جانب ''رانگاماٹی میں ۲۶ مارچ سے لے کر بعد تک عوامی لیگ کے کارکنان باغی پولیس والوں اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے اہلکاروں کے ساتھ ''بہاریوں'' کو اٹھا اٹھا کر لاتے رہے ...... بنگالیوں نے پہاڑیوں پر رہنے والے لوگوں کو بھی اس گھناؤنے کھیل میں ان کا ساتھ نہ دینے پر دھمکانا شروع کردیا تھا اور ان سے کہنے لگے کہ مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کے بعد ان کا نمبر بھی آنے ہی والا ہے۔'' رائے غیر بنگالی مردوں، عورتوں اور بچوں کے خلاف بنگالیوں کی شدید ظالمانہ کارروائیوں کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہیں۔ عوامی لیگ کے کارکنان لوگوں سے زبردستی چاول اور پیسے لے لیا

کرتے تھے، اور جب فوج وہاں پہنچی تو انھوں نے سکھ کا سانس لیا۔[۴۴]

ٹنگیل: آرمی کی جانب سے باغیوں کی سرکوبی

ڈھاکہ سے ٹنگیل جاتے ہوئے سڑک پر ایک چھوٹا سا گاؤں ستیار چورا آتا ہے۔ مارچ کے آخری دنوں میں باغی بنگالی پولیس اہلکاروں اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے اہلکاروں نے اس گاؤں میں ایک دفاعی لائن قائم کر لی تھی۔ ایک دیہاتی جوئے نال عابدین دیوان کے مطابق ایک باغی فضل الرحمٰن فاروق ٹنگیل سے انھیں اس مقام پر مزاحمت کرنے کی ہدایات بھیجا کرتا تھا۔ بہت زیادہ مشہور...... یا بدنام زمانہ...... باغی گوریلا لیڈر قادر (''ٹائیگر'') صدیقی نے بھی باغیوں کے اس گروہ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔[۴۵]

عابدین کو اس وقت کھلنہ میں تعینات کیا گیا تھا، لیکن ملٹری آپریشن شروع ہونے کے بعد وہ واپس گاؤں آ گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس ایک بندوق بھی تھی اور اس کا بھائی جمعرات علی دیوان بھی مسلح تھا جو شاہ جہاں سراج کے ساتھ سیاسی طور پر سرگرم تھا اور اسلحہ چلانے کی تربیت بھی حاصل کر لی تھی۔ باقی ماندہ دیہاتیوں کی اکثریت لڑائی کے طریقوں سے واقف نہ تھی۔ عابدین کے مطابق باغی ای پی آر (EPR) اور پولیس اہلکاروں نے بنکر تعمیر کر کے ''مشین گنوں'' کے ساتھ پوزیشن سنبھال رکھی تھی۔

اس تمام تر تیاری کے باوجود جب ۱۳ اپریل کو پاکستان آرمی کا ایک بہت بڑا قافلہ وہاں پہنچا تو یہ تمام باغی دن نکلتے ہی بے خبری کی وجہ سے پکڑے گئے۔ عابدین کے مطابق تقریباً ۷۰ گاڑیاں وہاں موجود تھیں اور تیار نہ ہونے کے باوجود بھی بنگالی باغیوں نے فائر کھول دیا اور دس یا بارہ گاڑیاں تباہ کر ڈالیں نیز انھوں نے ۲۰۰ سے ۲۵۰ فوجی بھی مار ڈالے۔ میرے وہ ساتھی جو آزاد بنگلہ دیش کے حق میں تھے ان کے خیال میں بھی یہاں شدید مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو گاڑیاں تباہ کی گئی ہوں گی اور مارے جانے والے فوجی ایک آدھ درجن کے لگ بھگ ہو سکتے تھے۔ البتہ جس بات میں مبالغہ آرائی نظر نہیں آئی وہ عابدین کے مطابق ''گولیوں کی بارش'' تھی جو کہ آرمی نے جواباً باغیوں پر کی۔ اس نے اپنی بندوق پھینکی اور کسی محفوظ مقام کے لیے دوڑ لگا دی۔ اس کا بھائی جمعرات بنکر میں موجود تھا اور گولیوں کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا۔ عابدین کے مطابق تقریباً ۳۰۰ کے قریب دیہاتی اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ لیکن منطقی انداز کو اپناتے ہوئے اس تعداد اور آرمی کی بتائی ہوئی تعداد میں کوئی مطابقت تلاش کرنا ہی بہتر طریقۂ کار ہو گا۔ عابدین نے

یہ بھی بتایا کہ قادر صدیقی اس صبح وہاں آیا تھا اور اس نے محاذ کو گرم دیکھ کر ناتیاپاڑا کی جانب راہِ فرار اختیار کی، جہاں بعد میں اس نے جنگ میں حصہ بھی لیا۔

باغیوں کی سرکوبی کے بعد مبینہ طور پر فوجیوں نے گاؤں میں گھر گھر کی تلاشی لی اور حرکت کرتی ہوئی ہر چیز کو ہلاک کر ڈالا۔ تاہم عابدین کا کہنا ہے کہ فوجیوں نے خواتین کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا البتہ دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ کر چند خواتین اور بچے ضرور ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد فوج وہاں سے چلی گئی، اگلے دن پھر آرمی وہاں پہنچی اور جنازوں کے لیے جمع ہونے والے ہجوم کو منتشر کر دیا— اس کی بیوی شیولی عابدین نے بتایا کہ انھوں نے محض پانچ افراد کو جنازے میں شرکت کی اجازت دی۔ اس کے بعد سے آزادی تک گاؤں والے دربدر ہوتے رہے۔ سب لوگ دوسرے گاؤں میں رہ رہے تھے، البتہ اس کے بعد فوج سے کوئی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ بعدازاں آرمی نے جب ''رضاکاروں'' کو منظم کیا تو یہ عناصر ہندوؤں کو ڈرانے دھمکانے اور لوٹ مار کرنے میں ملوث رہے، اور ان میں سے چند ایک تو مر بھی گئے تھے۔

عابدین کا خیال ہے کہ بنگلہ دیش کی آزادی کے ضمن بہت سے حریت پسندوں کو دیے جانے والے ''سرٹیفکیٹس'' کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مقامی سیاست کے اعتبار سے وہ مشہور باغی رہنما قادر صدیقی کے مخالفین کی حمایت میں نظر آتا ہے اور اس کے مطابق صدیقی ایک ''موقع پرست'' اور ''شدت پسند'' انسان تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی اس سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ جنگ میں ''آزادی'' کے ضمن میں سیاسی انتشار کے سلسلے میں انھیں شکایت ہے کہ صدیقی نے ایک سازش کے تحت ساتیار چورا میں ہونے والی جنگ کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ تنقید بے جا معلوم ہوتی ہے کیونکہ اپنی یادداشت میں قادر صدیقی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ستیار چورا کے مقام پر ایک اہم دفاعی لائن قائم تھی، اس نے وہاں لڑتے ہوئے مرنے والوں بشمول جمعرات علی دیوان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، نیز وہ اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ ''سینکڑوں'' فوجیوں کو مارنے کے علاوہ وہاں تقریباً دس سے بارہ گاڑیوں کو بھی تباہ کیا گیا تھا۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ وہ محاذ سے اس لیے چلا گیا تھا کہ اسے مزید اسلحہ لے کر آنا تھا اس لیے وہ اس محاذ میں شرکت نہ کر سکا۔[46]

اپنی سوانح میں قادر صدیقی باغی 2EBR کے ساتھ میجر صفی اللہ کی ٹنگیل آمد کا ذکر بھی کرتا ہے جو جوئے دیوپور سے وہاں پہنچے تھے۔[47] 2EBR کی ''بی کمپنی'' پہلے سے ہی ٹنگیل کے سرکٹ ہاؤس پر تعینات تھی۔ اس کمپنی کے پانچ افسران میں سے تین بنگالی اور دو مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے۔ صدیقی کے مطابق جب میجر صفی اللہ اور دیگر بنگالی افسران میمن سنگھ کے لیے روانہ ہوئے تو انھوں

نے دونوں مغربی پاکستانی افسران کو قتل کر ڈالا اور ان کی لاشیں مقامی سیاسی کارکنوں کے حوالے کر دیں۔ انھوں نے پہلے تو ان کی تدفین سرکٹ ہاؤس کے عقب میں کر دی، لیکن پھر انھیں وہاں سے نکال کر دریا کے کنارے دفنا دیا، اور ایک مرتبہ پھر انھیں قبروں سے نکال کر ٹنکیل قبرستان میں دفن کر دیا۔[۴۸]

کشٹیا: باغیوں کا آرمی یونٹ پر غلبہ

لیفٹیننٹ عطاء اللہ شاہ ۲۷ بلوچ رجمنٹ میں ۱۹۷۰ سے مشرقی پاکستان میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔[۴۹] وہ دسمبر ۱۹۷۰ میں انتخابات کی ڈیوٹی پر کشٹیا گئے تھے اور پھر جیسور بیس میں واپس آ گئے تھے۔ فروری — مارچ کے دوران وہ لوگ کینٹ کے علاقوں تک محدود تھے لیکن ۲۵-۲۶ مارچ کی رات کو ان میں سے کچھ افراد — ''ڈی کمپنی'' اور ''اے کمپنی'' کے کچھ لوگوں کو دوبارہ کشٹیا جانے کے احکامات دیئے گئے۔ ان میں تقریباً ۱۵۵ جوان اور چار افسران شامل تھے۔ افسران میں میجر شیخ محمد شعیب، ان کے 2IC کیپٹن صمد علی، ''اے کمپنی'' کے کیپٹن اسلم اور لیفٹیننٹ عطاء اللہ شامل تھے۔ انھیں ڈی سی (ڈسٹرکٹ کمشنر) اور ایس پی (سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) اور مقامی قومی اسمبلی کے ممبران کو تلاش کرنے اور پولیس کو غیر مسلح کرنے کے علاوہ ٹیلی فون ایکسچینج کا چارج سنبھالنے کے اہداف دیئے گئے تھے۔

کمپنی ہیڈکوارٹرز کشٹیا ضلع اسکول میں بنایا گیا تھا۔ ایک پلاٹون کیپٹن اسلم کی سربراہی میں ٹیلی فون ایکسچینج کی جانب روانہ ہوئی۔ تیس سے پینتیس جوانوں کی ایک اور پلاٹون کو لے کر کیپٹن صمد اور لیفٹیننٹ عطاء اللہ پولیس لائن کی جانب اسلحہ خانے پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں نے ڈی سی، ایس پی اور ایم این اے حضرات کے گھروں پر رابطہ کیا۔ لیکن کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا۔ پولیس کے اسلحہ خانے پر چند مسلح گارڈ موجود تھے جنھیں غیر مسلح کر کے آرمی نے اپنے گارڈ تعینات کر دیئے۔ نائب صوبیدار ایوب نے چودہ سپاہیوں کے ساتھ وائرلیس اسٹیشن کو قبضے میں لے لیا۔ اس دوران کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ یہ لوگ اس جگہ سے پہلے ہی واقف تھے اور الیکشن کے دنوں ہی سے مقامی لوگوں سے بھی اچھے مراسم قائم تھے۔ لیفٹیننٹ عطاء اللہ پولیس لائنز ہی میں ٹھہرے رہے۔

اگلے ہی دن سے آرمی نے گروپوں کی شکل میں علاقے میں گشت شروع کر دی۔ ایس پی اور ڈی سی بھی آ گئے۔ ایک مغربی پاکستانی سول سرونٹ وقار نسیم بٹ جو کہ کشٹیا میں تعینات تھا کمپنی ہیڈکوارٹرز آیا۔ پولیس لائنز ویران دکھائی دے رہی تھی بیشتر بنگالی اہلکار وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔[۵۰]

اور ۲۸ مارچ تک خاموشی رہی ماسوائے ریلوے لائن کو تباہ کرنے کے اکا دکا واقعات کے کوئی خاص واقع رونما نہ ہوا۔

۲۹ مارچ کی صبح لیفٹیننٹ عطاء اللہ نے کچھ ایسا دیکھا جس سے انھیں پہلی مرتبہ خطرے کی بو محسوس ہونے لگی ۔ سینکڑوں افراد مہراب پور روڈ سے بڑی خاموشی کے ساتھ نقل مکانی کرنا شروع ہوگئے ۔ یہ سلسلہ کئی گھنٹے جاری رہا۔ اس نے ان سے وجہ جاننے کی کوشش بھی کی، لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ شام کے وقت ایس پی اور ڈی سی کمپنی ہیڈکوارٹر آئے اور افسران کو ایک تحریری نوٹ دکھایا جس پر درج تھا کہ جس کسی نے بھی مغربی پاکستانیوں کی مدد کی اسے قتل کردیا جائے گا۔ انھوں نے اس بات سے بھی آگاہ کیا کہ اسی رات ایک حملے کی منصوبہ بندی کی اطلاع بھی موصول ہوئی تھی۔ افسران نے غیر معمولی طور پر چوکنا رہنے کی ہدایات جاری کردیں، لیکن انھیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ واقعتاً کچھ ہونے والا تھا، یا یہ محض ایک دھمکی تھی۔

اس رات اچانک زور زور سے کلموں کی آوازیں آنے لگیں اور پھر چاروں اطراف سے فائرنگ شروع ہوگئی، آنے والے فائر میں مارٹر گولے بھی شامل تھے۔ آرمی کی چاروں پوزیشنیں حملوں کی زد میں تھیں اور ان کا محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ جنگ صبح تک جاری رہی اور اس وقت تک لیفٹیننٹ عطاء اللہ کے پاس نہ صرف اسلحہ کافی کم ہوچکا تھا بلکہ انھیں کافی جانی نقصان بھی سہنا پڑا تھا۔ کمپنی کمانڈر نے تمام گروپوں کو واپس اسکول میں واقع کمپنی ہیڈکوارٹرز میں آنے کو کہا۔ عطاء اللہ اور اسلم تو باقی ماندہ نفری کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ایوب کی کوئی اطلاع نہیں تھی ۔ سارا دن فائرنگ کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

پہلے انھیں بتایا گیا کہ جلد ہی فضائی مدد انھیں حاصل ہوگی اور مزید نفری بھی وہاں بھیجی جارہی ہے، لیکن بعد میں اطلاع موصول ہوئی کہ امداد ممکن نہ تھی ـــ اس لیے اپنے تئیں وہ لوگ جیسور پہنچنے کی کوشش کریں۔ رات کے وقت تقریباً ستر افراد بشمول زخمیوں کے جیسے تیسے دستیاب گاڑیوں میں سوار ہوکر وہاں سے چل پڑے۔ میجر شعیب کی جیپ بجلی کے کھمبوں سے جاٹکرائی ـــ اس لیے وہ صمد اور عطاء اللہ کے ساتھ پچھلی جیپ میں سوار ہوگئے۔ نیچے کی جانب سڑک پر انھوں نے دو جیپوں کو ٹوٹے ہوئے پل سے پانی میں گرتے دیکھا اور پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تمام لوگوں نے محفوظ مقامات پر آڑ لے لی ۔ جب عطاء اللہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ زخمیوں سے بھری ہوئی گاڑی کے سوا باقی تمام گاڑیاں خالی تھیں ـــ اور کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک گری ہوئی جیپ سے زخمی باورچی کو کھینچ کر نکالا ـــ انھوں نے چلنا شروع کیا اور پھر اچانک ہی بہت

سے لاٹھی برداروں نے انھیں گھیر لیا۔

پھر عطاء اللہ نے خود کو ایک جھونپڑی میں پایا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے۔ ایک بنگالی پولیس اہلکار نے ــ جس کا بیج نمبر ۷۹ آج بھی عطاء اللہ کو یاد ہے ــ اس کے سینے پر گھٹنہ رکھ کر اس کی بائیں آنکھ نکالنے کی کوشش کی۔ دن میں انھیں ایک جیپ کے ذریعے جھینیدہ لے جایا گیا۔ ایک پل پر سے گزرتے ہوئے، جس پر باوردی بنگالی پہرہ دے رہے تھے، عطاء اللہ نے دیکھا کہ چند افراد نے کیپٹن محمد کو نیچے جھکایا ہوا ہے اور اسے ''ذبح'' کر رہے ہیں۔

جھینیدہ پولیس اسٹیشن میں کمپنی کے مزید افراد کو بھی لایا گیا۔ ایک پٹھان حوالدار معاذ اللہ کو لایا گیا جس کا دایاں بازو تقریباً الگ ہو چکا تھا، لیکن اس حالت میں بھی اس نے پشتو میں عطاء اللہ کا حال احوال پوچھا۔ نائیک اشرف کو کمرے میں پھینک دیا گیا؛ اس کا پورا جسم سوجا ہوا تھا اور وہ نیم مردہ حالت میں تھا۔ کل بارہ سے چودہ افراد کو وہاں پھینکا گیا، وہ سب زخمی تھے اور ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ باہر لوگ جمع تھے اور فائرنگ کی کچھ آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ برابر والے کمرے میں ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو بھی سنائی دے رہی تھی۔ انھوں نے ایک ہندو بنگالی برہمن نام ''بھٹا چاریہ'' سنا۔

دوپہر کے وقت انھوں نے تمام افراد کو ایک کھلے ٹرک میں لاد دیا اور اس دوران لوگوں کا ایک ہجوم زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔ جیسے ہی ٹرک چلنا شروع ہوا تو بنگالیوں نے پہلے سے ہی شدید زخمی مغربی پاکستانیوں کو ان لاٹھیوں سے مارنا شروع کر دیا جن کے سروں پر چھریاں لگی تھیں۔ عطاء اللہ کے سر پر ایسی ہی ضرب کی وجہ سے نشان پڑا ہوا ہے۔ وقتاً فوقتاً ٹرک کو روکا جاتا اور ایک دو قیدیوں کو بطور چارہ بپھرے ہوئے ہجوم کی جانب پھینک دیا جاتا۔ ایک مقام پر عطاء اللہ کو بھی پھینک دیا گیا۔

وہ بندھی ہوئی حالت میں زمین کے ایک نرم ٹکڑے پر گرا۔ اس نے پانی مانگا۔ انھیں یاد ہے کہ چند افراد آئے اور انھیں ایک کشتی میں ڈال کر ایک گاؤں کی ڈسپنسری میں لے گئے۔ انھیں ایک میز پر لٹا کر دودھ اور دو کیلے دیئے گئے۔ یہ لوگ بھی بنگالی تھے ــ لیکن ان بنگالیوں سے یکسر مختلف جنھوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ انھوں نے عطاء اللہ کی رسیاں کھولیں اور اس کی مرہم پٹی کی اسے لنگی اور قمیض دی اور دودھ اور کیلوں سے ان کی تواضع کرتے رہے۔ بعد ازاں اسی دن یونیفارم میں ملبوس بنگالیوں کا ایک ٹرک آیا اور ایک مرتبہ پھر عطاء اللہ کو رسیوں سے باندھ دیا گیا، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے بھارتی سرحد کے قریب چوادنگا سرکٹ ہاؤس لے جایا گیا، جہاں چائے پیتے ہوئے

1EBR کے ایک باغی اہلکار نے اس سے سوالات پوچھنا شروع کیے۔ یہ چند مخصوص سوالات تھے :عورتوں کی عصمت دری کی تھی؟ عطاء اللہ نے کہا ''نہیں''۔ کتنے لوگ قتل کیے؟ عطاء اللہ نے ریلوے لائن کو تباہ کرنے کا ایک واقعہ بیان کیا جہاں اس نے کسی کو گولی ماری تھی، لیکن وہ زندہ بچ گیا تھا۔ عطاء اللہ کو کھانا دیا گیا اور دو تین دن تک لاک اپ میں بند کر دیا گیا۔

ایک دن بی بی سی کا ایک نمائندہ ان سے انٹرویو کرنے کے لیے آیا۔ اس کے آنے سے قبل عطاء اللہ کی نئی مرہم پٹی کی گئی اور اسے نئی قمیص بھی پہننے کے لیے دی گئی۔[50] پھر ایک دن اسے ہاتھ پیر باندھ کر اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر کہیں اور لے جایا گیا اور کچھ اور لوگوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ان کا سفر کلکتہ میں ختم ہوا— پہلے انھوں نے خود کو انڈین بارڈر فورس (BSF) کے سینٹر میں پایا اور پھر انھیں فورٹ ولیم کینٹ میں لے جایا گیا۔ بھارتی اہلکار بار بار ان سے سوال کرتے رہے، وہ لوگ بالخصوص ٹینک رجمنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انھیں طبی امداد بھی فراہم کی گئی اور پڑھنے کے لیے چند میگزین بھی دیے گئے۔ جب انھوں نے ایک میگزین کھولا تو ایک صفحے پر تصویر میں دیکھا کہ ایک بنگالی ہجوم کھڑا ہے اور ایک شخص کے ہاتھ میں مغربی پاکستانی سول سرونٹ نسیم بٹ کا کٹا ہوا سر تھا۔ نسیم بٹ نے وہاں سے پسپا ہونے والی آرمی یونٹ کے ساتھ جیسور جانے سے انکار کر دیا تھا۔ بعد ازاں پناہ گڑھ میں عطاء اللہ نے بھارتی تحویل میں مختلف عہدوں کے کئی پاکستانی افسروں اور جوانوں کو دیکھا۔ نومبر کے مہینے تک وہ آگرہ جیل میں موجود تھے۔ بعد میں انھیں پتہ چلا کہ ان کے ۱۵۵ ساتھیوں میں سے صرف گیارہ افراد ہی جیسور پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔

کومیلا کینٹ: خانہ جنگی کا حصار

کومیلا کینٹ میں پیش آنے والا ایک واقعہ واضح تصویر پیش کرتا ہے کہ کس طرح ۱۹۷۱ کے واقعات نے خاندان اور معاشرے کی سطح پر مشرقی پاکستان میں انتشار پیدا کر دیا تھا: دو بنگالی کزن پاکستان آرمی کی ایک ہی رجمنٹ میں، ایک ہی جگہ پر، ایک ہی کمانڈنگ آفیسر کے تحت خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک پاکستان آرمی سے وفادار رہا جب کہ دوسرے نے بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور اپنے کزن پر بنگالیوں کے قتل عام کے الزامات لگاتا رہا۔ دونوں مخالف فریقوں کی طرف سے لڑتے رہے۔ جنگ کے اختتام پر وفادار کزن تو بطور جنگی قیدی بھارت چلا گیا جبکہ دوسرا بھارت سے آزاد بنگلہ دیش واپس آ گیا۔ دونوں نے اپنی اپنی آرمی کو نہ چھوڑا۔ وفادار کزن بطور بریگیڈیئر پاکستان آرمی سے ریٹائر ہوا اور اب بھی پاکستان میں مقیم ہے۔ باغی کزن بنگلہ دیش

آرمی سے بطور میجر جنرل ریٹائرڈ ہوا اور اب بھی بنگلہ دیش میں رہائش پذیر ہے۔

اپنی تمام تر مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میجر جنرل امام الزماں مجھ سے اپنے گھر میں شام کے وقت بڑے پرتپاک انداز سے ملے۔ انھوں نے مجھے چائے پیش کی اور اپنی ایک کتاب کا ذکر کیا جو انھوں نے ۱۹۷۱ کی جنگ کے بارے میں لکھی تھی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی تھی؛ جس میں کومیلا کینٹ کے واقعات پہلے ہی بنگالی زبان میں شائع ہو چکے تھے۔ البتہ بنگالی تحریر میں کاٹ چھانٹ کی گئی تھی۔ اس طرح پاکستان آرمی کے بریگیڈیئر ابو اللیث احمد الزمان نے راولپنڈی میں اپنے گھر میں مجھے خوش آمدید کہا۔ ان کے ساتھ ایک اور بنگالی افسر کرنل کمال الدین بھی موجود تھے جنھوں نے ان کے ساتھ پاکستان آرمی سے وفادار رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے مجھے چائے پیش کی اور پھر ان دو فیصلوں کا ذکر کیا جن میں سے ۱۹۷۱ کے دوران ان کو ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

۱۹۷۱ء میں کیپٹن اے ایل اے زمان اور لیفٹیننٹ امام الزماں دونوں ہی ۵۳ فیلڈ رجمنٹ میں کومیلا کے مقام پر فرائض منصبی سر انجام دے رہے تھے۔ ان کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک اور بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر اقبال شفیع تھے۔[51] کومیلا میں رونما ہونے والے واقعات سے متعلق لیفٹیننٹ کی تحریریں تین مختلف مقامات پر شائع ہو چکی ہیں: بنگالی میں کاٹ چھانٹ کے ساتھ، انگریزی میں بنگلہ دیش کی آزادی سے متعلق ایک کتاب میں اور ۱۳ اپریل کو سڈنی شین برگ کی کہانی اگرتلہ بھارت سے اور بعد میں ۱۷ اپریل ۱۹۷۱ کو نیویارک ٹائمز میں بھی وہ کہانی شائع ہوئی۔ لیکن وہاں لیفٹیننٹ امام کے اصل نام کی بجائے ان کا نام ''دابر'' لکھا گیا ہے تاکہ ان کی شناخت ظاہر نہ ہو۔[52]

لیفٹیننٹ امام الزمان کے مطابق ملٹری ایکشن کے دوران، ''کومیلا کے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر اقبال شفیع متواتر تمام یونٹوں کے کمانڈنگ آفیسروں کے ساتھ میٹنگ کرتے رہے۔ لیکن ان میٹنگز میں بنگالی افسران کو شرکت کرنے کی اجازت نہ تھی''۔ جب میں نے یہ بات بریگیڈیئر شفیع کے سامنے رکھی تو وہ کچھ حیران ہو گئے۔ کیونکہ تمام کمانڈنگ آفیسرز مغربی پاکستان سے ہی تھے تو بنگالیوں کو الگ رکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کیپٹن اے ایل اے زمان، بنگالی افسر، صاف صاف اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ بریگیڈیئر صاحب نے کبھی بھی انھیں اپنے عزائم سے لاعلم نہیں رکھا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ امام الزماں چونکہ حال ہی میں سیکنڈ لیفٹیننٹ بنے تھے اور ان کی سروس محض چند ماہ تھی اس لیے انھیں سینئر افسران کی میٹنگز میں شامل نہ کیا جاتا ہو۔

لیفٹیننٹ امام الزماں یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ ۲۵ مارچ کی شام لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک نے یہ اعلان کیا کہ پورے ملک میں کرفیو نافذ کردیا گیا ہے اور وہ ''پورے کومیلا کو لاشوں سے بھرنا چاہتے تھے''۔ چونکہ بنگالی افسروں کے لیے اس قسم کے احکامات ناخوشگوار تھے، اس لیے انھیں دفتری کاموں میں مشغول رکھا جاتا رہا۔ لیفٹیننٹ امام کے مطابق کیپٹن اے ایل اے زمان، ایک اور بنگالی افسر کیپٹن نورالاسلام اور ایک بہاری افسر کو حقیقتاً کینٹ میں مقید کردیا گیا تھا۔ جہاں ان کی بنگالی کیپٹن نورالاسلام سے اکثر بات ہوا کرتی تھی: ''ہم کیپٹن زمان پر ہرگز بھروسہ نہیں کرسکتے کیونکہ وہ بہت زیادہ پاکستان کا حامی ہے''۔ اپنی کتاب میں لیفٹیننٹ امام لکھتے ہیں کہ کیپٹن زمان نے بارہا کمانڈنگ آفیسر سے ملنے اور ''محبِ وطن'' افسر ہونے کے ناطے انہیں خدمات پیش کرنے کی درخواست کی۔ کمانڈنگ آفیسر نے ان کی درخواست قبول کرلی اور انھیں وہاں سے باہر نکال دیا۔ لیفٹیننٹ امام کے مطابق ۲۶ مارچ کی صبح کومیلا کے ڈی سی اور ایس پی کو کینٹ لاکر نزدیکی کمرے میں قید کردیا گیا۔

کیپٹن اے ایل اے زمان نے بڑے ہی فخریہ انداز سے کہا کہ وہ محبِ وطن پاکستانی تھے اور علیحدگی پسند بنگالی انھیں اپنے ارادوں سے لاعلم رکھتے تھے۔ تاہم وہ اس بات سے صاف انکاری ہیں کہ انھیں قید رکھا گیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ شروع دن ہی سے وہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہے تھے جو افسران شہر میں ہونے والے ملٹری آپریشن میں حصہ نہیں لینا چاہتے تھے انھیں دفتری ڈیوٹی پر تعینات کردیا جاتا تھا— جیسا کہ ٹیلی فون کال وغیرہ موصول کرنا— اور ان کے مطابق لیفٹیننٹ امام الزمان اور دیگر دو افسران یہی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ خود لیفٹیننٹ امام الزماں بھی اپنی کتاب میں ایک دن ٹیلی فون پر ڈیوٹی دینے کا ذکر کرتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنی کسی بھی تحریر میں لیفٹیننٹ امام الزمان نے یہ ذکر نہیں کیا کہ وفادار کیپٹن زمان ان کے کزن تھے، جبکہ پہلی مرتبہ جب کیپٹن زمان سے میری بات ہوئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ لیفٹیننٹ امام الزمان ان کے کزن تھے اور کومیلا میں موجود اپنے دیگر رشتہ داروں کا بھی انھوں نے ذکر کیا۔ ایک اور بات جس کا لیفٹیننٹ امام الزمان ذکر نہیں کرتے وہ یہ کہ ۲۵ مارچ کو بریگیڈیئر شفیع چٹاگانگ چلے گئے تھے، لہٰذا آنے والے دنوں میں ہونے والے قتل عام کے جو الزامات بریگیڈیئر اقبال شفیع پر لگائے جاتے ہیں ان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔[۵۳]

لیفٹیننٹ امام الزماں نے دراصل یہ الزام لگایا تھا کہ اس دن کومیلا کینٹ میں موجود بنگالی سپاہیوں اور سویلین کا قتل عام کیا گیا اور خود ان کے ساتھی افسران نے انھیں اور ''لاک اپ میں بند''

دیگر دو افسروں کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کے مطابق انھوں نے خود کو مردہ ظاہر کیا اور معجزاتی طور پر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جبکہ بنگالی تحریر میں ان کا الزام یہ تھا کہ ایک مغربی پاکستان افسر بہت سے سویلین قیدیوں کو ٹرک میں بھر کر لائے تھے اور انھیں ایک اعلیٰ افسر کے حکم پر مار مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اپنی انگریزی تحریر میں وہ ان مظالم کے منصوبہ سازوں میں ایک نام کا مزید اضافہ بھی کرتے ہیں۔

ایک اور مغربی پاکستانی افسر میجر عبدالمجید مختلف انداز سے واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے ۷ یا ۸ اپریل کو کومیلا میں ۵۳ فیلڈ رجمنٹ میں ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔[۵۴] وہ مبینہ قتل عام کے وقت وہاں موجود نہیں تھے لیکن ان کے مطابق یونٹ میں یہ بات زبان زدِ عام تھی کہ مقامی ڈی سی اور ایس پی کو قتل کر دیا گیا تھا — فوج کے خلاف ان کی سابق کارروائیوں کے انتقام کے طور پر۔ البتہ جب ایس پی کے گھر سے لوگ معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے تو انھیں اس بات سے لاعلم رکھا گیا۔[۵۵] یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ کیپٹن بخاری اور لیفٹیننٹ کرنل یعقوب نے لوگوں کو قتل کیا تھا۔ بخاری کو اسی برس بعد گھات لگا کر مار دیا گیا۔ بنگالی قوم پرستوں کا کردار بھی اس معاملے میں کچھ حوصلہ افزا نہ تھا، تاہم — میجر ماجد کہتے ہیں کہ اپریل کے مہینے میں جب وہ برہمن باڑیہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے بنگالیوں کے ہاتھوں قتل کیے جانے والے بے شمار بہاریوں کی لاشیں بکھری پڑی دیکھیں — ان میں چھوٹے بچوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔

قتل و غارت گری کے اقدامات اور لیفٹیننٹ امام الزمان کے معجزاتی فرار کی کہانی میں کئی دلچسپ موڑ سامنے آتے ہیں۔ لیفٹیننٹ امام الزمان لکھتے ہیں کہ ایک مغربی پاکستان افسر کیپٹن اوصاف نے ۳۰ مارچ کو قید میں موجود ڈی سی اور ایس پی کو گولی ماردی اور جے سی او صوبیدار فیض سلطان نے لیفٹیننٹ امام اور کمرے میں قید دیگر دو افسران کو گولیوں کا نشانہ نہ بنایا۔ امام الزماں کے مطابق انھیں اور دیگر افسران کو قریب سے سب مشین گن کا نشانہ بنایا گیا — انھیں اس وقت گولیاں ماری گئیں جب وہ زمین پر پڑے تھے۔ لیفٹیننٹ امام کہتے ہیں کہ وہ زخمی تھے لیکن انھوں نے راہِ فرار اختیار کرنے سے پہلے خود کو مردہ ظاہر کیا۔ ان کے مطابق دیگر دو افسران مارے جا چکے تھے۔

تاہم میجر عبدالمجید نے مجھے بتایا کہ بہاری افسر زندہ بچ گیا تھا — کومیلا پہنچنے پر انھوں نے بہاری افسر کو ہسپتال میں زیرِ علاج پایا۔ کیپٹن زمان بھی بہاری افسر کے زندہ بچ جانے کی تصدیق کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر 2EBR کے باغی بنگالی میجر صفی اللہ گولیاں لگنے کے بعد لیفٹیننٹ امام اور بہاری افسر کے مابین ہونے والی گفتگو کا تفصیلاً ذکر کرتے ہیں — یہ بات انھوں نے صرف

لیفٹیننٹ امام سے ہی سنی ہوں گی کیونکہ اسی تحریر کے مطابق بہاری افسر نے لیفٹیننٹ امام سے کہا تھا کہ وہ فرار نہ ہوں اور خود دو طرفہ فائرنگ میں بہاری افسر مارا گیا![56] لیکن لیفٹیننٹ امام نے اپنی تینوں مذکورہ بالا تحریروں میں سے کسی ایک میں بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے۔

وفادار رہنے والے کیپٹن زمان کے مطابق پیش آنے والے واقعات کچھ اس طرح سے تھے۔ جس وقت انھیں اطلاع دی گئی کہ ان کا کزن اور دیگر دو افسران نے فرار ہونے کی کوشش کی ہے تو وہ ڈیوٹی پر باہر گئے ہوئے تھے۔ ان پر گولی چلائی گئی تھی۔ دوسرا بنگالی افسر مارا گیا تھا جبکہ بہاری افسر اور لیفٹیننٹ امام زخمی ہوگئے تھے اور موخرالذکر بعدازاں فرار ہونے میں بھی کامیاب رہے۔ اس بیان کے مطابق فائرنگ لاک اپ میں نہیں کی گئی تھی بلکہ تینوں افسران کو کینٹ میں کھلی جگہ راہ فرار اختیار کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

نیویارک ٹائمز کی رپورٹ میجر جنرل امام الزماں کی بنگالی اور انگریزی تحریروں پر مبنی ہے لیکن بعض پہلوؤں سے دونوں میں اختلافات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں مثلاً کہانی کے مطابق مغربی پاکستانی افسروں نے تین بنگالی افسروں کو لاک اپ میں بند کردیا اور بعدازاں انھیں قتل کرنے کی کوشش کی، جبکہ لیفٹیننٹ امام کے مطابق دو افسران بنگالی اور ایک افسر بہاری تھا۔ اس علاوہ نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق لیفٹیننٹ امام کو تین گولیاں ماری گئیں ـــ ایک دائیں کلائی پر، ایک گال کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور تیسری اس کی شرٹ کو پیچھے سے چیرتی ہوئی نکل گئی۔ کہانی کے مطابق لیفٹیننٹ امام نے کلائی سے بہنے والے خون کو چہرے پر مل دیا تاکہ وہ مردہ نظر آئے۔ جبکہ خود لیفٹیننٹ امام کے مطابق گولیاں اس کی دائیں کلائی، دائیں آنکھ اور شرٹ میں پیچھے سے لگیں تھیں۔ ان کے مطابق ان کی دائیں آنکھ سے بری طرح خون بہہ رہا تھا اور وہ اس آنکھ سے دیکھنے کے قابل نہیں تھے۔ کسی بھی طرح سے دیکھا جائے تو ایک ایسے شخص کے لیے یہ زخم بہت ہلکے تھے جسے سب مشین گن سے قریب سے اُس وقت نشانہ بنایا گیا ہو جب وہ زمین پر پڑا ہوا۔ جیسا کہ بہاری افسر بھی زندہ بچ گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مبینہ جے سی او فائرنگ میں بہت ہی کمزور تھا۔ اپنی کہانی میں لیفٹیننٹ امام لکھتے ہیں کہ اپریل کے دوسرے ہفتے میں باغیوں نے انھیں کومیلا ـــ چاند پور روڈ کو تباہ کرنے کی ذمہ داری سونپی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں ان کے زخم ٹھیک ہوچکے تھے۔ آخر میں نیویارک ٹائمز کی رپورٹ میں سویلین لوگوں کو ٹرکوں میں بھر کر کینٹ میں لانے اور ان کا قتل عام کرنے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ـــ اگر ''دابز'' نے اس قسم کی کوئی بات سڈنی شین برگ کو بتائی ہوتی تو وہ ضرور اسے رپورٹ کا حصہ بناتا بلکہ غالباً یہی بات بطور سرخی اخبار میں نظر آتی۔

امرتیا سین جو خود کو ایک ''بنگالی اور بنگلہ دیشی آباء و اجداد'' سے رشتے کو اپنی پہچان بتاتی ہیں اپنی کتاب ''Identity and Violence'' میں لکھتی ہیں کہ ''مارچ ۱۹۷۱ میں ڈھاکہ میں ہونے والے قتل عام اور علیحدگی کے پرسوز واقعات میں، جہاں آرمی بنگالی بغاوت کو کسی طرح دبانے پر تلی ہوئی تھی، لوگوں میں تفریق کی بنیاد زبان اور سیاست تھی نہ کہ مذہب جس کی بنیاد پر مغربی پاکستان سے مسلمان فوجی باغیوں — بالخصوص مسلمانوں — کو مشرقی پاکستان میں قتل عام کا نشانہ بنا رہے تھے''۔۵۷

سین ''شناخت کے تصادم تلے پروان چڑھنے والے تشدد'' کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کرتی ہیں اور ''واحد وابستگی'' کو سراب قرار دیتی ہیں۔ ہمیں جزوی طور پر مشرقی پاکستان کے واقعات میں ان کے تجزیات میں صداقت نظر آتی ہے۔ اولاً مغربی پاکستانی فوجی بنگالیوں کے خلاف محض لسانیت یا ثقافت کی بناء پر برسرپیکار نہ تھے کیونکہ تصادم کے دونوں اطراف خود بنگالی بھی موجود تھے مگر یہ سب سیاست کا شاخسانہ تھا — یعنی علیحدگی کی تحریک — جس کے لیے وہ لوگ مذہب (ہندو)، پارٹی ممبر شپ (عوامی لیگ) اور عمر/جنس (بالغ مرد) جیسے پتے بھی کھیل رہے تھے اور عسکریت پسندی ان پتوں کی پشت پناہی کے طور پر سامنے آرہی تھی۔ ثانیاً سین ان واقعات کا ذکر کرنے میں بری طرح ناکام رہتی ہیں جن میں غیر بنگالیوں اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو بنگالی قوم پرستوں نے ''وحشیانہ'' قتل عام کا نشانہ بنایا اور یہ محض لسانیت اور ثقافت ہی کی بنیاد پر تھا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان واقعات کا حذف کیا جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سین اپنے آباء اجداد کی زمین کو کسی داغ سے بچانا چاہتی ہیں۔ بلکہ ایسا غالباً اس لیے ہوا کہ سین کو یہ باتیں معلوم ہی نہ تھیں بالکل ایسے ہی جیسے کہ میں ان تمام باتوں سے لاعلم تھی۔ ایک دوسرے پر مکمل بالادستی اور مشرقی پاکستان کی سرزمین پر نفرتوں کی سیاست کے ماحول میں صرف وہی مواد ہمارے سامنے آسکا جسے فاتح نے موزوں جانا۔

باب پنجم:

بیواؤں کا گاؤں

دیہی علاقوں میں ''کارروائی''

''شالا کومپیٹنٹ چھلو''۔ (کمینہ بہت ذہین تھا)۔

— محمد عبدالستار زندہ بچ جانے والا شخص، پاکستانی افسر سے متعلق جس نے
اس پر اور اس کے گاؤں کے لوگوں پر گولیاں چلائی تھیں۔

''مجھے ہر فوج سے نفرت ہے۔ تمہاری، ہماری ......ساری فوجوں سے۔''

— محمد زینت العالم، وہ واحد شخص جس کی جان پاکستانی فوج کے اس افسر نے
بخش دی تھی جس نے اس کے گاؤں کے سب لوگوں کو مار دیا تھا۔

دریائے پدما کے کنارے 'راج شاہی' ڈسٹرکٹ میں بھارت کے سرحدی علاقے کے قریب تھانہ پاڑہ نامی ایک گاؤں واقع ہے۔ آج بھی بہت سے لوگوں کو یاد ہے کہ یہ ''بیواؤں کا گاؤں' بھی کہلاتا ہے۔ ۱۳ اپریل ۱۹۷۱ کو زندہ بچ جانے والے افراد کے مطابق پاکستان آرمی کی ایک یونٹ اس گاؤں میں آئی جو ساردا پولیس اکیڈمی کے پڑوس میں واقع ہے۔ پولیس اکیڈمی پر باغی بنگالیوں نے قبضہ جما رکھا تھا اور فوج کے آتے ہی یہ تمام باغی منتشر ہو گئے۔ آرمی نے اکیڈمی کا کنٹرول سنبھالنے کے بعد تھانہ پاڑہ کا رخ کیا، جہاں باغیوں کے ساتھ ساتھ دیہاتی لوگ بھی پناہ لیے ہوئے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو مردوں سے علیحدہ کر کے واپس گاؤں بھیج دیا گیا۔ تمام مردوں کو اکٹھا کر کے گولیاں ماردی گئیں۔ پھر ان لاشوں کا ڈھیر بنا کر انھیں آگ لگا دی گئی۔

۱۹۷۱ کی جنگ پر تحقیق کے دوران میں نے جو کہانیاں سنیں ان میں سب سے زیادہ وحشت تھانہ پاڑہ کی کہانی سے ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت کو کچلنے کے دوران پاکستان آرمی کو ساری دنیا میں سب سے زیادہ شرمندہ کرنے والی داستان تھانہ پاڑہ کی داستان تھی۔ لیکن تھانہ پاڑہ کے لوگ یہ سب باتیں دنیا کے سامنے نہیں لے کر آئے۔ بلکہ جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا مغربی میڈیا ویت نام میں ہونے والے مائی لائی کے قتل عام کے ضمن میں امریکی فوج کے لیفٹیننٹ ولیم کیلے کو مجرم ثابت کرنے میں مصروف تھا۔

بہر حال تھانہ پاڑہ گناہوں کی کوئی سادہ سی داستان نہیں ہے۔ اس باب میں وہاں موجود لوگوں کی زبانی ان واقعات کو کھول کھول کر بیان کیا جائے گا جو اس دن تھانہ پاڑہ میں رونما ہوئے تھے — ان میں ایک لڑکا، ایک لڑکی، ایک بیوہ، ایک ایسا شخص جسے گولی مارنے کے بعد زندہ جلایا گیا مگر وہ بچ گیا، وہ واحد آدمی جس کی جان آرمی افسر نے بخش دی تھی، آرمی کے وہ کمانڈنگ آفیسر جنھوں نے ڈھاکہ سے راج شاہی کی جانب فوجیوں کی کمان کی اور ایک ایسا نوجوان لیفٹیننٹ جس نے ساردا پولیس اکیڈمی کو واگزار کرانے کے لیے بنفس نفیس لڑائی میں حصہ لیا اور بعد میں پدما کے کنارے کی جانب کوچ کیا، شامل ہیں۔

لڑکا — ۱۹۷۱ میں ریحان علی بارہ یا تیرہ سال کا نوعمر لڑکا تھا[!] اس کی بیوی محمودہ بیگم گینا بھی لگ بھگ اسی عمر کی تھی۔ ریحان کے خیال میں اس دن آرمی ساردا پولیس اکیڈمی اور علاقے میں موجود ایسٹ پاکستان رائفلز کے ایک کیمپ پر قبضہ کرنے کے لیے راج شاہی سے آئی تھی۔ جب وہ ساردا بازار میں ایک سڑک سے گزر رہے تھے ایک بنگالی نے ان پر گولی چلا دی۔ بعد ازاں چند باغی بنگالیوں کی جانب سے ان پر مزید فائرنگ بھی کی گئی۔ یہ فائرنگ غالباً بیلپوکور کے مقام پر ہوئی تھی۔ پاکستان آرمی نے بھی جواباً فائر کھول دیا۔

اس فائرنگ کی زد سے بچنے کے لیے گاؤں کے لوگوں نے پدما کے کنارے جانے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ محفوظ رہ سکیں۔ ریحان کا خیال ہے کہ عورتوں، بچوں، مردوں، گرد و نواح کے لوگوں اور باغی بنگالی پولیس اہلکاروں کو ملا کر تین ہزار کے لگ بھگ لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے[!] پدما کے کنارے پر ایک میلے کا سماں دکھائی دے رہا تھا۔

دریا میں پانی نچلی سطح پر تھا اور دریا کا کنارہ نیچے کی جانب ایک ڈھلوان نما دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ دریا کے پانی کے قریب نچلے کنارے پر جمع ہو گئے تھے۔ اچانک ہی کنارے کی اوپر والی سطح پر ریحان نے ایک فوجی کو کھڑے دیکھا۔ اس فوجی نے ان سے کہا کہ وہ سب لوگ اوپر آ جائیں انھیں

گھر بھیج دیا جائے گا۔ جب وہ سب اوپر کی جانب آنے کے لیے تیار ہو رہے تھے تو ایک نوجوان نے کنارے کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کی۔ فوجی نے اسے دیکھ لیا اور چھلانگ لگا اسے گھسیٹ کر باہر نکالا اور اس کے بعد اسے گولی مار دی۔ باقی لوگوں کو اوپر میدان میں جمع کر کے کہا گیا کہ عورتیں اور بچے ایک طرف ہو جائیں اور مرد دوسری طرف ہو جائیں۔

ریحان اپنے والد (عمر ۴۶ برس)، بڑے بھائی (عمر ۱۷ برس) اور بہنوئی (عمر ۲۷ یا ۲۸ برس) کے ساتھ جا بیٹھا۔ وہ فوجیوں کے افسر سے کچھ ہی دور مردوں کی قطار کے آخر میں بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک فوجی اسے قطار سے باہر نکلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ریحان نے ایسا ظاہر کیا کہ اس نے دیکھا ہی نہیں۔ ریحان کے ساتھ بیٹھا دوسرا شخص یہ سمجھا کہ یہ اشارہ اس کے لیے تھا، اس لیے وہ اٹھا اور قدم آگے بڑھائے لیکن فوجی افسر نے بڑے ہی تحقیر آمیز انداز میں اسے لات مار کر واپس زمین پر گرا دیا۔ پھر اس نے ریحان کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اس سے کہا کہ وہ عورتوں اور بچوں والی قطار میں جائے۔

اب عورتوں اور بچوں سے کہا گیا کہ وہ وہاں سے چلے جائیں۔ جیسے ہی وہ لوگ جانے لگے تو افسر نے قطار میں بیٹھے افراد سے پوچھنا شروع کیا کہ — ان میں ہندو اور پولیس والے کون تھے۔ ایک شخص کھڑا ہوا — اسے گولی مار دی گئی۔ جب ریحان کی نظروں سے یہ منظر اوجھل ہوا تو باقی ماندہ افراد ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔

ریحان اب ٹھانہ پاڑہ میں ایک غیر سرکاری تنظیم چلاتا ہے جسے سویڈش ادارہ ''Swallows'' کی جانب سے فنڈز فراہم کیے جاتے ہیں، اس تنظیم نے جنگ کے بعد کئی بیواؤں کو ملازمتیں دیں اور ان کی مدد کے وسائل فراہم کیے۔ اپنے اس کام کے سلسلے میں ریحان کا رابطہ کئی پاکستانیوں سے بھی ہوا ہے لیکن ان سے ملاقات کے دوران وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔

لڑکی — محمودہ بیگم، جواب ریحان علی کی بیوی ہے، خواتین کی قطار میں تھی۔[۳] اس کے مطابق چند فوجی جو خواتین کی جانب پہرے پر کھڑے تھے تمام معاملات کو دیکھ کر انتہائی مغموم تھے۔ جب خواتین رو رہی تھیں تو چند فوجیوں کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلکنے لگے تھے۔ وہ سب کے سب برے نہیں تھے — محمودہ بیگم کہتی ہیں کہ ہمیں بعد میں پتہ لگا کہ ''بلوچی'' سپاہی ان میں سے بہتر لوگ تھے۔[۴]

ملٹری والے ایک علیحدگی پسند، ''شبلی'' کی تلاش میں بار بار گاؤں آتے تھے، شبلی وقتاً فوقتاً وہاں آیا جایا کرتا تھا اس لیے وہ بار بار اسے ڈھونڈنے گاؤں آتے تھے۔ ایک دن انھوں نے شبلی کو چند ساتھیوں سمیت کھیتوں میں پکڑ ہی لیا۔ دراصل شبلی کی گرفتاری چند رضا کاروں (وفادار بنگالیوں پر

مشتمل ایک مددگار فورس) کے ذریعے عمل میں آئی تھی، ان رضا کاروں نے شبلی پر نظر رکھی ہوئی تھی اور اسے پکڑ کر آرمی کے حوالے کر دیا۔ شبلی کو چار دن تحویل میں رکھنے کے بعد 9 مئی کو قتل کر دیا گیا۔

دوبارہ لڑکا — ریحان کو اگلے چند ماہ کے دوران آرمی کے ساتھ ہونے والے بہت سے دیگر مقابلے بھی یاد ہیں۔ ایک مرتبہ وہ پولیس اکیڈمی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک سپاہی اسے پکڑ کر اندر لے گیا اور اس سے تفتیش کی گئی۔ آخر کار اس نے ریحان سے کہا کہ وہ اسے اس شرط پر جانے دے گا کہ ریحان اسے دودھ کا ایک ڈبہ مارکیٹ سے لا کر دے۔ اس نے دودھ کا ڈبہ ریحان کو دیا۔ ریحان بازار گیا اور دودھ کا ڈبہ ایک دکان پر پھینک کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ ایک اور موقع پر ایک فوجی نے ریحان سے سگریٹ لانے کو کہا لیکن ریحان اسی طرح وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

ایک دن کھیتوں کے پاس کھڑے پانی میں ریحان نہا رہا تھا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے فوجی نے اسے پکڑ لیا۔ فوجی کو ایسا لگا کہ کوئی علیحدگی پسند پانی میں غوطے لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ریحان کو جانے دیا۔ ایک دن درخت پر چڑھ کر ریحان دیکھ رہا تھا کہ اونچی اونچی فصل میں کوئی مویشی تو موجود نہیں۔ جیسے ہی وہ نیچے اترا اسے ایک فوجی نے پکڑ لیا۔ اس فوجی کو ریحان کے جاسوس ہونے پر شبہ تھا۔ وہ فوجی ریحان کو اپنی رائفل کے بٹ سے مارنے ہی والا تھا کہ ریحان نے بھی اپنی درانتی ردعمل کے طور پر نکال لی۔ وہ ریحان کی اس حرکت سے کچھ جھینپ سا گیا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ بعدازاں ریحان کو خبر ملی کہ وہ فوجی مزید نفری لے کر دوبارہ اس علاقے میں تلاشی لینے کے لیے آیا تھا۔

ایک مرتبہ جب فوجی گاؤں میں آئے تو ریحان گھر کے پچھواڑے میں موجود جھاڑیوں میں جا چھپا۔ ابھی فوجی وہاں سے گئے ہی تھے کہ ایک ''رضا کار'' نے انھیں ریحان کے بارے میں اطلاع دے دی۔ انھوں نے ریحان کو پکڑ لیا اور پولیس اکیڈمی کے پاس نئے تعمیر ہونے والے ''بنکر'' میں کام کروانے لے گئے۔ اس کے بعد ایک افسر آیا جو کہ ریحان کے مطابق (غالباً) ''بلوچی'' تھا۔ اس نے ایک چھوٹے بچے کو وہاں کام کرتے دیکھا تو پوچھا کہ اسے کون وہاں لے کر آیا ہے؟ اس پر ریحان نے دو فوجیوں کی جانب اشارہ کیا اور ''بلوچی'' افسر نے ان دونوں کو بڑی ڈانٹ پلائی۔ اس کے بعد اس نے ریحان کو ۵۰ (یا ۲۰) روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکال کر دیا اور گھر جانے کو کہا۔

بیوہ — اویا جان کو اس وقت اپنی عمر کے بارے میں کچھ صحیح اندازہ نہیں ہے۔ جب ۲۰۰۴ء میں میری ملاقات اس سے ہوئی تو وہ پچاس کی دہائی میں تھی اور زندگی کی سختیوں کی وجہ سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔[۵]

جب ۱۹۷۱ء میں اس کے خاندان والوں کو دریا کے کنارے بلوایا گیا تو اس کے دو بیٹے تھے، ان میں سے ایک تو بہت ہی چھوٹا تھا جو اس کی گود میں تھا۔ ملٹری نے انھیں بچوں کے ساتھ واپس جانے کو کہا۔ جاتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ فوجی اپنے بھاری بھاری جوتوں سے کچھ لوگوں کو مار رہے تھے — اور انھیں گولیاں بھی مار رہے تھے۔ بعد میں انھوں نے سب مردوں کو مار ڈالا اور ان کی لاشوں کو آگ لگا دی۔

اس واقعہ میں اویا جان کا شوہر، اس کی نند کا شوہر اور اس کا دیور قتل کر دیئے گئے تھے۔ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ اویا جان کے لیے ممکن نہ تھا کہ واپس دریا پر جاتی اور ان کی لاشوں کو دفن کرتی۔ وہ باقی لوگوں کے ساتھ بھارت کے لیے روانہ ہوگئی۔ جہاں اس کے والدین رہائش پذیر تھے لیکن وہ صرف تین دن بعد واپس لوٹ آئی۔

دو سال بعد ''Swallws'' میں ملازمت مل گئی۔ کام کرنے کے باوجود وہ اپنے بیٹوں کو تعلیم دلوانے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ ایک بیٹے کی دکان تھی اور دوسرا دن بھر مزدوری کرتا تھا۔ اس کا شوہر اور دیور بھی مزدوری ہی کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سیاسی کارکن نہ تھا۔

اس کا ایک دیور بچ گیا تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹا تھا اس لیے اسے عورتوں کے ساتھ بھیج دیا گیا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے اویا جان اور اپنی ایک اور بیوہ بزرگ کو گھر سے نکال دیا۔

آدمی — محمد عبدالستار ایک غیر معمولی انسان ہے۔[6] یہ ریحان علی کا باپ ہے۔ اٹھتر برس کی عمر ہونے کے باوجود نہ صرف وہ جسمانی طور پر چست اور سیدھا نظر آتا تھا بلکہ ذہنی مستعدی کا بھی یہ عالم تھا کہ وقت ضائع کیے بغیر اس نے تمام واقعات تفصیلاً بتا دیئے۔ اس میں یہ خاصیت بھی پائی جاتی تھی کہ اس نے حالات کو معروضی انداز سے توازن کے ساتھ بیان کیا۔ اس نے نہ صرف ان لوگوں کے بارے میں بتایا جنھوں نے اسے ظلم کا نشانہ بنایا تھا بلکہ ان لوگوں کی بھی نشاندہی کی جو کہ بنگالی تھے اور پرتشدد کارروائیوں میں ملوث تھے۔ زبان و بیان میں یہ معروضی کیفیت مجھے کئی ایسے بنگالیوں میں بھی دیکھنے کو نہ ملی تھی جنھوں نے ان صعوبتوں کا عشر عشیر بھی برداشت نہ کیا تھا جو کہ عبدالستار نے برداشت کیں تھیں۔

۱۳ اپریل ۱۹۷۱ کو محمد عبدالستار اپنی دکان میں مصروف تھا۔ ابھی وہ دکان سے گھر کھانا کھانے کے لیے آیا ہی تھا کہ یہ پرسوز واقع رونما ہوا۔ دیگر گاؤں والوں کا خیال تھا کہ فائرنگ سے بچنے کے لیے انھیں دریا کے کنارے کی جانب فرار ہو جانا چاہیے۔ تو اس نے بھی دیگر افراد کے ہمراہ ایسا ہی کیا۔ عبدالستار اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ بازار سے گزرنے والے فوجیوں پر پہلے کسی نے

فائرنگ کی تھی اور بعد میں چند دیگر لوگوں نے دوبارہ ان پر فائرنگ کی — آرمی نے جواباً فائر کر کے انھیں مار ڈالا۔

ریحان اور دیگر خواتین اور بچوں کے جانے کے بعد ملٹری نے عبدالستار سمیت تمام مردوں کو اپنے حصار میں لیے رکھا۔ عبدالستار نے پاکستانی فوج کے کیپٹن کی حرکات کو تفصیلاً بیان کیا ہے (یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس نے لفظ کیپٹن، ''سربراہ'' کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد اس کا اصل عہدہ نہیں ہے۔) اس افسر کا بڑا رعب تھا — وہ سب کو احکامات دے رہا تھا۔ وہ سوالات پوچھ رہا تھا، جیسا کہ ''تم میں سے ہندو کون کون ہیں؟'' جب کسی نے بھی جواب نہ دیا تو اس نے لوگوں کو منتخب کرنا شروع کیا — ''تم آگے آؤ۔ تم ہندو ہونا؟'' پھر اس نے پوچھا — ''تم میں سے پولیس والے کون ہیں؟'' پھر کسی نے جواب نہ دیا تو ایک مرتبہ پھر اس نے چند لوگوں سے کہا: ''تم — تم پولیس والے ہو؟''

میں نے ان سے پوچھا کہ افسر واقعتاً ہندوؤں اور باغی بنگالی پولیس والوں کو ہی اٹھا رہا تھا؟ اس پر عبدالستار نے کہا وہ بالکل ٹھیک تھا اور پھر کہنے لگا ''کمینہ بہت ہی ذہین تھا''۔ جن افراد کو چن کر افسر نے الگ کیا تھا انھیں گولی مار دی گئی۔

ایک آدمی عزیز العالم راج شاہی عدالت میں وکیل تھا۔ اسے آگے آ کر سوالوں کے جوابات دینے کے لیے کہا گیا — جیسا کہ وہ مسلمان تھا یا نہیں وغیرہ اس وقت تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن عالم اسی پر نہ رکا۔ اس نے افسر سے کہا کہ ''میں عوامی لیگ کا رکن ہوں۔ تم چاہے کچھ بھی کر لو میرا وطن آزاد ہو کر ہی رہے گا''۔ اس پر عزیز العالم کو بھی گولی مار دی گئی۔

عزیز العالم کا ایک نوجوان بھتیجا تھا جسے لوگ ''جناح'' کہتے تھے۔ وہ دراز قد، صاف رنگت اور ہلکی آنکھوں والا تھا۔ وہ میمن سنگھ ایگریکلچرل کالج میں زیر تعلیم تھا۔ کیپٹن نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ بنگالی تھا — جب اس نے اپنا نام ''جناح'' بتایا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے افسر کو بتایا کہ وہ بنگالی ہی ہے اور پوچھنے پر اشارہ کر کے گاؤں میں اپنے گھر کی نشاندہی بھی کی، اس نے مزید بتایا کہ وہ میمن سنگھ ایگریکلچرل کالج میں زیر تعلیم تھا۔ یہ سننا تھا کہ ''کیپٹن'' نے انگریزی گفتگو شروع کر دی — معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ جناح سچ بول رہا تھا یا جھوٹ۔ لیکن پھر بھی وہ اس بات پر یقین کرنے پر تیار نہ تھا کہ جناح بنگالی ہے۔ اس نے جناح کو جانے کے لیے کہا۔ جب جناح گارڈ سپاہیوں تک پہنچا تو اس نے انھیں بھی اشارہ کیا اور کہا ''اسے جانے دو''۔

باقی ماندہ افراد سے مخاطب ہو کر کیپٹن نے کہا ''تم سب لوگ ہندوستانی ہو اور دریا پار کر کے

یہاں آئے ہو"۔ یہاں اس علاقے کے طبعی خدوخال کو مدِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ عبدالستار مجھے دریا کے اس کنارے پر لے گیا جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ دریائے پدما کا کنارہ کافی ٹوٹ پھوٹ اور کٹاؤ کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ "جہاں یہ سب کچھ ہوا تھا وہ علاقہ اب وہاں ہے"، عبدالستار نے نیم مرطوب[۹] علاقے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ دریا کے اس پار مجھے زمین اور درخت نظر آرہے تھے — وہ بھارتی علاقہ تھا۔ اپریل ۱۹۷۱ میں دریا میں قدرے کم پانی تھا اور دریا کے آر پار جانا بہت آسان تھا۔

• پاکستانیوں نے سوچا کہ دریا کے کنارے پر جمع ہونے والے یہ لوگ گاؤں والے نہیں بلکہ ہندوستانی ایجنٹ تھے جو دریا پار کر کے یہاں آئے تھے۔ دیہاتیوں نے اس بات سے انکار کر دیا، لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیپٹن نے پوچھا کہ "اگر تم دیہاتی ہو تو یہاں دریا کے کنارے چھپے ہوئے کیوں ہو؟"۔ انھوں نے بتایا کہ وہ فائرنگ سے خوفزدہ ہو کر وہاں آگئے تھے لیکن افسران کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے کہا کہ "اگر تم بھارتی ایجنٹ نہیں ہو تو تم نے ہم پر فائرنگ کیوں کی؟" اگر تم دیہاتی ہو تو ہم تمہارے ہی فوجی ہیں۔ تمہارے خادم ہیں۔ لیکن تم نے ہم پر گولی چلائی"۔ عبدالستار اس بات کو مانتا ہے کہ چند افراد نے فائرنگ کی تھی۔

چند مبینہ ہندوؤں اور پولیس والوں کو ابتداً علیحدہ کر کے ہلاک کرنے کے بعد — اسی طرح سب سے سوالات کیے جا رہے تھے کہ اسی دوران "وائرلیس واکی ٹاکی" پر اس افسر کو اپنے اعلیٰ افسران کی جانب سے ایک پیغام موصول ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہدایات تھیں کہ سب کو مار دیا جائے۔ انھوں نے وہاں موجود لوگوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ عبدالستار کو بائیں ٹانگ اور بائیں بازو پر پانچ گولیاں لگیں۔ عبدالستار نے مجھے اپنے کچھ زخم بھی دکھائے — ایک زخم بائیں ٹانگ پر تھا، گولی سامنے سے گھسی اور ٹانگ کے پیچھے سے نکل گئی تھی؛ اس کی وہ ٹانگ بے کار ہو گئی تھی۔ مردہ اور زخمی سب زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ پھر فوجیوں نے لاشوں کو ٹھکانے لگانا شروع کیا۔ عبدالستار کو بھی اٹھا کر دیگر لاشوں کے ساتھ رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے لاشوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر ان پر ایک فائر کیا۔ عبدالستار کو کچھ حرارت محسوس ہوئی۔ لاشوں کے ڈھیر میں جس جانب سے آگ کے شعلے اٹھنا شروع ہوئے تھے عبدالستار اس کی دوسری جانب پڑا ہوا تھا۔ وہ اب تک زندہ تھا۔ لیکن اس کے اوپر اور نیچے سب لوگ مردہ حالت میں تھے۔ اب اندھیرا چھا رہا تھا اور فوجی بھی جا چکے تھے۔ عبدالستار نے خود کو اپنی تیل سے بھیگی ہوئی بنیان سے باہر نکالا اور لاشوں کے انبار سے باہر نکل آیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سسکتے ہوئے اپنے گاؤں تک پہنچا تو وہاں ہو کا عالم تھا۔ انسان نام کی کوئی چیز

نظر نہ آتی تھی۔صرف چند کتے ویرانی کے عالم میں بھونک رہے تھے۔عبدالستار نے وہاں پہنچ آواز لگائی تو جھاڑیوں کے پیچھے سے اس کے گھر والے برآمد ہوئے اسے ساتھ لے گئے۔انھوں نے اس کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش کی۔۔ عبدالستار کو معلوم تھا کہ خون کا بے حد ضیاع اس کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا تھا۔اگلی صبح اس کے گھر والے ڈاکٹر کو تلاش کرنے لگے۔

عبدالستار کچھ عرصہ اپنے رشتہ داروں کے گھر پر ہی رہا۔۔اس کو ٹھیک ہونے میں چند ہفتے لگے پھر طویل علالت کے بعد تھانہ پاڑہ واپس آگیا۔

واپس آتے ہوئے عبدالستار نے راج شاہی سے آتے ہوئے آرمی کی دو یونٹوں کو سڑک پر دیکھا۔ان یونٹوں میں سے ایک یونٹ ''پٹھانوں'' کی تھی جو کہ ''مکتار پور کیڈٹ کالج'' چلی گئی۔جبکہ دوسری یونٹ پنجابی یونٹ تھی جو اس دن تھانہ پاڑہ اور ساردا پولیس اکیڈمی آئی تھی۔عبدالستار کے مطابق مکتار پور میں بھی تھانہ پاڑہ کی طرح بہت سے لوگ دریا کے کنارے جمع ہوگئے تھے، لیکن ''پٹھان'' یونٹ نے کسی کو بھی نہیں مارا اور انھیں گھر جانے کو کہا۔

ساردا پولیس اکیڈمی میں تعینات ہونے والی یونٹوں کے تبادلے ہوتے رہے لیکن عبدالستار کے مطابق پھر کبھی بھی ایسی یونٹ نہ آئی جو ۱۳ اپریل کو آئی تھی۔عبدالستار کو ایک ''اچھا'' افسر میجر شفیع اللہ۔۔یاد ہے جو'' ساردا پولیس اکیڈمی کے فوجی کیمپ میں تعینات رہا۔'' وہ افسر نہ صرف گاؤں والوں سے تبادلہ خیال کیا کرتا تھا بلکہ ان سے تعاون بھی کیا کرتا تھا۔وہ دیہات والوں سے بھی اس بات کی توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے جوانوں میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لیے اس سے تعاون کریں گے۔ستار کے مطابق اس نے عبدالستار اور دیگر دیہاتیوں سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کسی فوجی کو لوٹ مار یا عورتوں کو حراساں کرنے میں ملوث پائیں تو اسے مارنے کی بجائے انصاف کے لیے اس کے پاس لے آئیں۔۔دیہاتیوں نے بارہا اس کی ان ہدایات پر عمل بھی کیا۔ایک مرتبہ ایک سپاہی ''مرغا؟ مرغا؟'' کرتے ایک گھر میں جا گھسا۔باورچی خانے میں موجود خاتون خانہ نے اس کے منہ پر جھاڑو کی بوچھاڑ کردی اور جھاڑو پر مرچ لگی ہونے کی وجہ سے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہوگیا۔دیہاتی ہدایات کے مطابق اسے پکڑ کر میجر شفیع اللہ کے پاس لے آئے تو میجر صاحب نے کہا کہ سب سے پہلے تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔

نوجوان جس کا نام ''جناح'' تھا۔فروری کے مہینے میں ایگریکلچرل یونیورسٹی حالات خراب ہونے کی وجہ سے بند کردی گئی اور محمد زینت العالم (جناح) کو واپس گھر تھانہ پاڑہ آنا پڑا۔[۱۰] ان کا گھر ساردا پولیس اکیڈمی کے قریب ہی واقع تھا۔گھر میں اس کی چچی اور دو کزن رہتے تھے اور

اس کا ایک اور کزن ''شبلی''، ہندوستان میں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا چھوٹا بھائی اور بہنوئی بھی ہندوستان میں ہی مقیم تھے۔

ساردا پولیس اکیڈمی کے بنگالی پرنسپل خالق صاحب اولین دنوں میں تو بغاوت میں شامل ہونے سے گریزاں تھے لیکن ڈھاکہ پولیس کی بغاوت نے ان کی ہمت بندھا دی۔ جبکہ راج شاہی کیڈٹ کالج کے کیپٹن راشد شروع ہی سے بغاوت کے حق میں بہت سرگرم تھے۔ ساردا پولیس اکیڈمی پر باغیوں کا قبضہ ہوگیا۔

ساردا پولیس اکیڈمی میں مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ۲۵ کے لگ بھگ نوجوان زیر تربیت تھے جن کی عمریں بھی ۲۵ برس کے لگ بھگ تھیں انھیں بنگالیوں نے یرغمال بنالیا تھا۔ عوامی لیگ کی ''ایکشن کمیٹی'' کے ممبران ان نوجوانوں کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جناح کے مطابق وہ اور دوسرے مقامی بنگالی اس کے خلاف تھے اور ان کی کوشش تھی کہ انھیں بھارتی BSF کے حوالے کر دیا جائے۔ ۱۱ اپریل کو انھیں انڈین بارڈر سیکیورٹی فورس (BSF) کے ہاتھوں گرفتار کروایا دیا گیا۔ اسی دن اکیڈمی کے پرنسپل، خالق صاحب، کو بھی خاندان سمیت بھارت روانہ کر دیا گیا کیونکہ وہ وہاں سے جانے کے خواہشمند تھے۔

تھانہ پاڑہ اور بھارت کے مابین سرحدی دریا میں ان دونوں پانی کی سطح کافی نیچے تھی اور لوگوں کا دونوں اطراف آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک کاروباری شخص کا بیٹا بہرام پور، بھارت سے پٹرول کے ڈبے اور چار مینار سگریٹ کی ڈبیاں وغیرہ لایا کرتا تھا۔

شروع کے دنوں میں گوپال پور کے مقام پر چند بنگالیوں نے مغربی پاکستان کے ایک میجر کو اس کی بیوی اور ایک کیپٹن سمیت روک لیا اور میجر کی ناک اور کان کاٹ ڈالے[۱۱] اس کے علاوہ ۱۱ اپریل کو فرار ہونے والے ایک بہاری کو عوامی لیگ کے کارکنوں نے پکڑ لیا اور وہ اسے مارنا چاہتے تھے۔ جناح اور دیگر دیہاتیوں نے انھیں باز رکھنے کی بہت کوششیں کیں لیکن بے سود ثابت ہوئیں۔ اس شخص کو پہلے گولی ماری گئی، لیکن جناح کے مطابق عوامی لیگ کے کارکنوں کو صحیح طرح سے گولی بھی نہیں چلانا آتی تھی، اسی لیے وہ شخص مرا نہیں۔ انھوں نے اسے تھیلے میں بند کر کے زندہ ہی دفن کر ڈالا۔ بعد میں جناح وہاں گیا تو اب تک اس کی آوازیں آ رہی تھیں اور ریت بھی ہل رہی تھی۔ بعد ازاں، قاتلوں نے اسے وہاں سے نکال کر تھیلے میں بند ہی دریا برد کر دیا۔ اس سارے معاملے میں اصل مجرم ساردا پولیس اکیڈمی کے وائس پرنسپل کا ڈرائیور تھا۔

۱۳ اپریل کو باغیوں کو بذریعہ وائرلیس مطلع کیا گیا کہ میجر اور دیگر افراد کو قتل کرنے کا بدلہ

لینے کے لیے آرمی ڈھاکہ سے راج شاہی آ رہی ہے۔[۱۲] جب آرمی جھولمولیہ کے علاقے تک پہنچی تو باغیوں نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ ساردا پولیس اکیڈمی میں صرف ۲۰۰ یا ۳۰۰ کے لگ بھگ 0.303 رائفلیں موجود تھیں۔ انھیں اطلاع ملی تھی کہ آرمی ۱۵۴ گاڑیوں میں آ رہی۔ حالانکہ آرمی پیدل چلتی ہوئی دیہاتی علاقوں سے آ رہی تھی اور راستے میں آنے والی ہر چیز کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ راستے میں فائرنگ کی آوازیں سننے کو مل رہی تھیں اور ساتھ ساتھ دھواں نظر آتا تھا۔ غالباً وہ لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے جھونپڑیوں کو آگ لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

گاؤں کے تمام لوگ بشمول جناح جو لڑائی کا ارادہ ترک کر کے وائرلیس پر مامور تھے، باغی پولیس والوں کے ساتھ دریا کے کنارے جمع ہو گئے، یہ لوگ دریا پار کر کے بھارت جانا چاہتے تھے۔ گو کہ دریا میں پانی کی سطح کم تھی لیکن ان کے پاس مناسب تعداد میں کشتیاں موجود نہ تھیں۔ پانی میں طغیانی نہ ہونے کی وجہ سے جناح اور اس کے کزنوں نے تیر کر دریا پار کی کوشش کی لیکن جلد ہی تھک کر واپس آ گئے۔ اتنے میں انھوں نے ایک بانس کو تیرتے ہوئے دیکھا۔ جناح کا بہنوئی بانس کے سہارے دریا پار کرنا چاہتا تھا لیکن جناح نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ اسے اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر نہیں بھاگنا چاہیے۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی بانس کے سہارے دریا پار جانا چاہتا تھا لیکن جناح نے اسے بھی روک دیا۔ دیگر لوگ بانس کے ذریعے دریا پار چلے گئے۔[۱۳]

جناح دریا کے کنارے پر ہی پھنسا ہوا تھا کہ فوجی وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے سب کو اوپر آنے کو کہا۔ انھوں نے کہا کہ ''کیپٹن'' ان لوگوں سے بات کرے گا اور پھر سب لوگ گھر جا سکیں گے۔ میں نے جناح سے اس افسر کا یونیفارم بیان کرنے کو کہا۔ جناح نے بتایا کے اس کی شرٹ کے کاندھوں پر تین پھول (اسٹار) تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسر غالباً کیپٹن ہی تھا۔ جناح کو شک تھا کہ بات کرنے کا صرف بہانہ ہے اور فوجی ہم سب کو مار ڈالیں گے لیکن اوپر جانے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اوپر جا کر جب بچوں اور عورتوں کو گھر جانے کے لیے کہا گیا تو جناح کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا کہ تمام مردوں کو مار دیا جائے گا پھر اس افسر نے لوگوں کو الگ کرنا شروع کیا — ہندوؤں اور پولیس والوں کو۔ اس افسر نے ایک شخص سے اس کے مذہب کے بارے میں پوچھا اور ہندو ہونے پر اس کے سینے میں گولی ماردی۔ وہ گر پڑا اور اس کے سینے سے خون بہنے لگا۔ اس نے ایک اور آدمی سے کہا کہ وہ پولیس والا تھا (حالانکہ وہ نہیں تھا) اور پھر اس پر چار پانچ گولیاں برسائیں، وہ کسی نازک مقام پر گولی نہیں مار رہا تھا۔ وہ اسی طرح لوگوں کو ہندو اور پولیس والا کہہ کر چن چن کر اپنے ہی ہتھیار سے مارتا رہا اور باقی فوجی صرف لوگوں پر پہرا دے رہے تھے۔ ایک وقت

ایسا بھی آیا جب جناح کے ساتھ بیٹھے اس کے دوست نے جناح سے کہا کہ وہ اسے بلا رہا ہے۔ جناح نے یوں ظاہر کیا جیسا کہ اس نے دیکھا ہی نہیں لیکن چار و نا چار اسے جانا ہی پڑا۔

افسر نے اردو میں پوچھا ''تمہارا کیا نام ہے؟'' جب جواب میں ''جناح'' سننے کے بعد افسر نے اس کا پورا نام پوچھا تو جناح نے اسے بتایا کہ اس کا پورا نام محمد زینت العالم تھا۔[۳] اس نے پوچھا ''کیا کرتے ہو؟'' جناح نے جواب دیا ''طالب علم ہوں''۔ ''کہاں؟''، ''میمن سنگھ ایگریکلچرل یونیورسٹی میں''۔ اسی طرح یہ گفتگو اردو اور نگریزی میں جاری رہی۔

آخر کار کیپٹن نے جناح سے کہا کہ وہ اسے نہیں مارے گا— لیکن اسے بتانا ہوگا کہ کون لوگ تحریک آزادی میں ملوث تھے۔ جناح نے کہا کہ وہ کالج میں پڑھائی میں مصروف تھا اور کون وہاں کیا کر رہا تھا اس کے علم میں نہیں تھا۔ اس پر کیپٹن نے بندوق کا بٹ اس زور سے جناح کے کندھے پر مارا کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا۔ پھر بھی اس نے جناح کو مارنے کی بجائے ایک الگ جگہ بٹھا دیا۔ بعد میں اس نے چند مزید لوگوں کو جناح کے ساتھ ہی بٹھا دیا جنھیں وہ مارنا نہیں چاہتا تھا۔ غالباً یہ لوگ نصف درجن کے قریب تھے۔ جناح کو اب بھی یاد ہے کہ ان میں سے ایک شخص پولٹری فارم کا کاروبار کیا کرتا تھا۔

اس دوران وائرلیس سے مسلسل پیغامات آتے رہے۔ اب ایک مرتبہ تمام سپاہیوں سے کہا گیا کہ اپنے دائرے کو وسیع کرلیں۔ اس کے بعد کیپٹن نے اپنی مشین گن سے وہاں بیٹھے تمام لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ ایک فوجی اس کے پیچھے کھڑا میگزین میں گولیاں بھر بھر کر دے رہا تھا۔ دوسرے گروپ میں بیٹھے لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر کانپ اٹھے۔ یہ بہت ہی بھیانک منظر تھا۔

اس قتل عام کے بعد اس چنیدہ گروہ کو کیپٹن اپنے ساتھ اکیڈمی لے جانے کے لیے لے گیا۔ وہاں جیپوں میں سینئر افسران موجود تھے— ان کے یونیفارم سے جناح کو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ کرنل رینک کے تھے۔ وہ کیپٹن سے کہہ رہے تھے کہ اس نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ پھر انھوں نے کیپٹن سے پوچھا کہ ان تھوڑے سے لوگوں کو اپنے ساتھ زندہ کیوں لے کر آگئے ہو۔

اس موقع پر جناح نے دیکھا کہ لاشوں کے انبار سے بہت سے زندہ بچ جانے والے لوگ راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ سپاہیوں نے بھی یہ منظر دیکھا۔ انھوں نے چند ایک کا تعاقب کر کے انھیں مار ڈالا ''کیپٹن نے بھی چند مزید افراد کو گولیاں ماریں''۔ ایک مرتبہ تو جناح کو ایسا لگا کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کی آواز مرتے ہوئے سنی ہو۔ اس قیامت خیز منظر کے دوران جناح زیادہ تر اپنی بیوہ ماں کے بارے میں سوچتا رہا— جب وہ پانچ برس کا تھا اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس

کی سوچ لاشوں کے انبار میں اپنے بھائی اور بہنوئی کی جانب نہیں جا رہی تھی بلکہ وہ ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کے پاس اب کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں بچے گا۔

جناح کہتا ہے کہ سردی کے موسم میں اس کے چچا ''عزیز العالم'' کا دماغ ذرا ''گھوم'' جایا کرتا تھا۔ اب چونکہ گرمی کا موسم تھا اس لیے ان کی دماغی حالت بہتر تھی۔ جناح نے اپنے چچا کو لاشوں کے انبار میں بیٹھے دیکھا، وہ زخمی تھا مگر زندہ تھا، اس نے براہِ راست کیپٹن سے کہا ''اتنا ظلم کیوں؟'' کیپٹن نے اسے مار ڈالا۔

اب کیپٹن کو اندازہ ہو رہا تھا کہ فائرنگ سے سب لوگ نہیں مرے تھے — جس چھوٹے سے گروہ کو اس نے چھوڑ دیا تھا انھیں حکم دیا گیا کہ لاشوں کو ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کریں۔ اپنے ایک استاد کی لاش اٹھاتے ہوئے جناح نے دیکھا کہ ان کی لنگی ذرا ڈھیلی پڑ رہی ہے تو جناح نے احترام کے ساتھ ان کی لنگی کو کس دیا۔ ایک سپاہی نے جب یہ دیکھا تو چلا کر بولا کہ تمھارا بھی یہی حشر کر دیا جائے گا۔ لاشوں کا ڈھیر لگاتے لگاتے جناح بھی خون آلود ہو چکا تھا۔

ان ڈھیر لگانے والوں کو کیپٹن نے حکم دیا کہ لاشوں کے انبار کی ایک جانب قطار بنا کر کھڑے ہو جائیں۔ جناح کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ جا کر کیپٹن سے منت سماجت کرے کہ وہ اس کی جان بخش دے۔ یہی خواہش اسے کیپٹن کے پاس لے گئی۔ ایک سپاہی جو جناح کو پسند نہیں کرتا تھا اس نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک دوسرے سپاہی یا افسر نے جناح کو آگے جانے دیا۔ جناح کے خیال میں اس کی مدد کرنے والا سپاہی سندھی تھا۔[۱۵] اس فوجی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے دوسرے فوجی سے کہا ''اگر یہ اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے تو تمھارا کیا بگڑتا ہے؟'' اس پر دوسرا فوجی پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس ''سندھی'' فوجی نے جناح سے کیپٹن کے پاس جا کر اس کی جان بخشنے کو کہا — کہ ہو سکتا ہے اسے چھوڑ دیا جائے۔ وہ تھوڑی دور جناح کے ساتھ گیا لیکن پھر کیپٹن سے کچھ دور رک گیا اور اور جناح کو اکیلے کیپٹن کے پاس جانے دیا۔

جناح کیپٹن کے سامنے کھڑا اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے کیپٹن سے کہا کہ اس کی ماں بیوہ ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کا بھائی بھی ابھی مار دیا گیا ہے اور اگر اسے بھی مار دیا گیا تو اس کی ماں کو دیکھنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کیپٹن نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ''اوہ ہاں تم ایگریکلچرل کالج میں پڑھتے ہو۔ تمھاری ماں بیوہ ہے؟'' اچھا جاؤ میں تمھیں جانے دے رہا ہوں، اس پر جناح نے وہاں سے چلنا شروع کیا لیکن اسے خوف تھا کہ کہیں اسے پیچھے سے گولی نہ مار دی جائے کیونکہ ایک اور شخص کے ساتھ اس نے ایسا ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا اور وہ چلا آیا۔

میں نے ڈاکٹر عالم (جناح) سے کہا کہ اس نے کیپٹن سے دو بدو بات کی تھی تو کیا وہ کیپٹن کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟ ڈاکٹر عالم نے بتایا کہ قد میں وہ خود عالم سے لمبا تھا اور دیکھنے میں اچھا لیکن ظالم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے عالم سے کیپٹن کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کو کہا کہ اتنے سارے نہتے اور لاچار لوگوں کو قتل کرنے والا شخص پاگل تھا؟ اس پر عالم نے کہا "ہاں"۔ جب میں نے عالم سے پوچھا کہ اس کے خیال میں کیپٹن نے اسے کیوں چھوڑ دیا تھا؟ تو عالم نے جواب دیا کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بیوہ ماں کا بتانے پر اس کو رحم آ گیا ہو۔ ہوسکتا ہے کیپٹن کی ماں بھی بیوہ ہو۔ یا ہوسکتا ہے کہ "جناح" کا نام کام کر گیا ہو۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بہر حال صحیح صحیح بتانا بہت مشکل ہے۔

عالم نے بڑی شدت کے ساتھ کہا "مجھے ہر فوج سے نفرت ہے۔ تمہاری فوج، ہماری فوج، ساری فوجوں سے"۔ عالم نے بھی ڈھاکہ کے ڈاکٹر ابوالکلام کی طرح فوج کی جانب سے کی جانے والی زیادتیوں کا تجزیہ کیا کہ اصل مسئلہ پاکستانیوں کے ساتھ خاص نہیں تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ مسلح افراد کو عام لوگوں سے ہر قسم کا سلوک روا رکھنے کے لیے کھلی چھٹی دے دی گئی تھی۔

اپنی جان بخشی کے بعد عالم اپنی چچی کے پاس گیا اور انھیں ساتھ چلنے کو کہا لیکن چچی نے بے سود ضد لگا رکھی تھی کہ چچا کو دیکھے بغیر نہیں جائیں گی۔ انھیں چھوڑ کر عالم اپنی ماں کے رشتہ دار کے ہاں چلا گیا— اسے آج بھی یاد ہے کہ اس کی ماں اس کے زخموں اور اس کے جسم پر لگے خون کو دیکھ کر پاگل ہوگئی۔ لیکن عالم نے ماں کو بتایا کہ اس کے جسم پر دوسروں کا خون لگا ہوا تھا۔

اگلے دن اس کے دادا اپنی ٹم ٹم میں چند دیگر افراد کو لے کر کھوئے ہوئے رشتہ داروں کو تلاش میں تھانہ پاڑہ گئے۔[6] باقی لوگ جو مزدور تھے جانے کو تیار نہ تھے لیکن انھیں ڈرا دھمکا کر لے جایا گیا۔ باقی کی کہانی عالم نے انھی لوگوں سے سنی ہے۔

انھوں نے دیکھا کہ اس کے بہنوئی کی لاش دیگر لاشوں سے الگ پڑی ہے— یوں لگتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں شامل تھا جنھوں نے فائرنگ کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور انھیں بھاگتے ہوئے مار گرایا گیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی کی لاش ان کے اپنے گھر سے ہی ملی۔ یہ بات ساری زندگی عالم کا پیچھا کرتی رہی کہ اس کا بھائی زندہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گیا تھا لیکن اسے بہت سے زخم آئے تھے اور اس کا جسم ایک جانب سے جلا ہوا بھی تھا۔ گھر میں کوئی فرد موجود نہ تھا جو اس کی مدد کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوپر اپنے کمرے میں بھی گیا تھا، باورچی خانے میں بھی گیا اور کنوئیں سے پانی نکال کر پینے کی کوشش بھی کی تھی۔ بالآخر کسی بھی تیمار دار کی عدم موجودگی میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ انتقال کر گیا۔

جب زینت العالم ''جناح'' سے ۲۰۰۴ میں میری ملاقات ہوئی تو وہ پچاس کی دہائی کے درمیان تھا۔ اس کی رنگت صاف، نیلی آنکھیں اور چہرے پر ڈارھی تھی وہ روانی سے انگریزی اور اردو میں گفتگو کر سکتا تھا۔ وہ بنگلہ دیش کی ایک ایگریکلچرل یونیورسٹی میں انیٹومولوجی کے پروفیسر تھے۔ بعدازاں انھوں نے امریکہ کی فلوریڈا اور ارکنساس یونیورسٹیوں سے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور یونیورسٹی آف ارکنساس سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جب بل کلنٹن ارکنساس کا گورنر تھا اور ہیلری کلنٹن یونیورسٹی میں قانون پڑھایا کرتی تھی تو ڈاکٹر عالم اس وقت سٹل راک میں مقیم تھے۔

محمد زینت العالم ''جناح'' کی زندگی دکھوں سے عبارت ہے۔ اس کی بیوی کینسر کے مرض میں مبتلا ہوکر انتقال کرگئی۔ امریکہ واپس آئے تو ان کی بیٹی جو امریکہ میں پیدا ہوئی تھی، انتقال کرگئی اور اس کے بعد ایک بیٹے کا بھی انتقال ہوگیا۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھی دنوں ان کی بیوہ بہن کا داماد جوانی کے عالم میں انتقال کر چکا تھا۔ گھر پر میری ملاقات ان کی زندہ بچ رہنے والی بیٹی، تھانہ پاڑہ میں بیوہ ہونے والی بہن اور ان کی بیٹی اور — ان کی چھوٹی اور پیاری سی بھانجی سے ہوئی۔ عالم ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور اگلے ماہ حج کے سفر کے لیے جانے والے تھے۔

''جناح'' کو اس بات کا یقین ہے کہ کسی بھی شخص پر مصیبت اس کے اپنے کیے ہوئے گناہوں کی پاداش میں ہی آتی ہے۔ گوکہ انھوں نے صاف صاف یہ بات نہیں کہی لیکن محسوس ہوا کہ انھیں اس بات کا قلق ہے کہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوئی کو بانس کے سہارے دریائے پدما پار کیوں نہ کرنے دیا۔

کمانڈنگ آفیسر: ۳۲ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر، لیفٹیننٹ کرنل محمد تاج ۲۵ اور ۲۶ مارچ کی رات ڈھاکہ میں پہلی مرتبہ ملٹری آپریشن کے بعد اپریل کے پہلے ہفتے تک ڈھاکہ میں ہی مقیم رہے۔ وہ وہاں بطور سیکٹر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر موجود رہے۔ اس کے بعد وہ ایک اور شورش زدہ علاقے راج شاہی کی جانب ۵۷ بریگیڈ کے دیگر یونٹس کو لے کر بڑھے۔ بریگیڈیئر جہانزیب ارباب ان کی کمان کررہے تھے۔[۱۷]

لیفٹیننٹ کرنل تاج نے اریچہ، ناگر باڑی، پبنہ اور راج شاہی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ اریچہ تک انھیں باغیوں کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہ ہوا۔ اریچہ پر انھیں دریا پار کرنا پڑا۔ ناگر باڑی میں باغیوں سے لڑائی ہوئی لیکن ان پر فوج نے جلد قابو پالیا۔ باغیوں نے سڑک پر بیس بیس فٹ گہرے گڑھے بنا کر انھیں گھاس پھوس سے ڈھانپ دیا تھا اس لیے انھیں بہت سنبھل سنبھل کر گڑھوں کو پر کرتے ہوئے آگے بڑھنا تھا۔ جب لیفٹیننٹ کرنل تاج ناگر باڑی میں تھے تو دیگر

ساتھی پبنہ کو محفوظ کرنے چلے گئے۔ بعد میں تاج کو راج شاہی بلوا لیا گیا۔

تاج کے مطابق پبنہ میں سڑک پر انھوں نے بہت سے غیر بنگالی مردوں عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھیں، جنھیں ان کے مطابق بنگالی باغیوں نے قتل کیا تھا۔ پبنہ سے راج شاہی جاتے ہوئے سڑک پر بھی پاکستانیوں پر دوبارہ فائرنگ کی گئی۔ لڑائی کے نتیجے میں چند فوجی بھی ہلاک ہوئے۔ وہ لوگ جہاں کہیں بھی گئے انھیں غیر بنگالیوں کی طرف سے بنگالی باغیوں کے مظالم کی شکایات ملیں۔

راج شاہی پہنچتے ہی وہ سیدھے وفادار بنگالی وائس چانسلر سجاد حسین کے پاس گئے اور ان سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی ''بدمعاش'' تو نہیں ہے۔ وائس چانسلر نے جواب دیا کہ کوئی ''بدمعاش'' تو نہیں ہے لیکن بہت سے غیر بنگالی ایک بیرک میں بند ہیں — انھوں نے اس بیرک کی نشاندہی کرتے ہوئے تاج سے درخواست کی کہ انھیں بچایا جائے۔ تاج نے انھیں آزاد کروایا، ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنے کے بعد انھیں گھر جانے کو کہا۔ انھوں نے کہا کہ وائس چانسلر سجاد حسین ایک شریف انسان تھے، اور ان کے لیے اس کے دل میں بہت عزت ہے۔

میجر جنرل اے او مٹھا، پاکستان آرمی میں SSG کمانڈو کے بانی، کو خصوصی طور پر مارچ کے اواخر اور اپریل کے اوائل میں مشرقی پاکستان بلایا گیا تھا۔ ایک واقعے کے بارے میں انھوں نے لکھتے ہوئے، جب وہ بریگیڈ کے اختیار کردہ راستے سے جا رہے تھے، ذکر کرتے ہیں، جب... ''میں نے دیکھا کہ سڑک کے قریب کے بیشتر دیہات کی تقریباً تمام جھونپڑیاں جلی ہوئی تھیں، اور ان دیہات میں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔'' جب اس کے متعلق دریافت کیا، تو بریگیڈیئر — جہانزیب ارباب، جو ڈھاکہ سے باہر راج شاہی کے مضافات کی طرف جا رہے تھے — انھوں نے کہا کہ انھیں یہاں سے مزاحمت کا سامنا تھا، لیکن انھوں نے ''تین انچ کے مارٹر گولے فائر کرتے ہوئے 'حفظ ماتقدم فائر' کا طریقہ اختیار کیا، تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ باغی ان دیہات کو استعمال نہ کر سکیں۔'' انھوں نے کہا کہ انھیں یہ تکنیک استعمال کرنے کا مشورہ ایسٹرن کمانڈر اور گورنر، جنرل ٹکا خان نے دیا تھا۔ جنرل مٹھا لکھتے ہیں کہ جنرل ٹکا خان نے اس بات کی تردید کر دی تھی کہ انھوں نے ایسا کوئی مشورہ دیا تھا۔ جنرل ٹکا نے انھیں ان کا نام استعمال کرنے پر ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور آئندہ ایسا نہ کرنے کے لیے کہا۔ مجھے لگا کہ ٹکا کسی کو ایک راکٹ دینے کے قابل بھی نہیں تھا۔[۱۸]

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج کے مطابق راج شاہی جاتے ہوئے بریگیڈیئر ارباب ان کے پیچھے سفر کر رہے تھے۔ تاج نے کہا کہ وہ اور ان کے ۳۲ پنجاب رجمنٹ کے فوجی سارداپولیس اکیڈمی نہیں گئے تھے، بلکہ ۱۸ پنجاب کے فوجی گئے تھے۔ ممکن ہے کہ بریگیڈیئر ارباب بھی وہاں گئے

ہوں، تاج پُر یقین نہیں تھے۔ اپنے متعلق بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھوں نے راستے میں آنے والے کسی گاؤں کو نذر آتش نہیں کیا، لیکن انھیں نہیں معلوم کہ ان کے پیچھے کیا ہوا تھا۔

جہاں تک لیفٹیننٹ کرنل تاج کو یاد پڑتا ہے، وہ ۱۳ اپریل کو راج شاہی پہنچے تھے۔ ۲۱ یا ۲۲ اپریل کو لیفٹیننٹ کرنل رضوی راج شاہی میں چارج لینے آ گئے اور تاج دو تین دنوں میں وہاں سے چلے گئے۔[19] بریگیڈیئر ارباب ان سے پہلے راج شاہی سے چلے گئے تھے۔ تاج کو یاد پڑتا ہے کہ راج شاہی یونیورسٹی میں یوم اقبال منایا گیا تھا، اور انھوں نے اور تاج نے اس فنکشن کی صدارت کی تھی۔[20]

ایک لیفٹیننٹ۔ ڈھاکہ میں فوجی ایکشن کے بعد، یہ نوجوان افسر اپنی یونٹ ۱۸ پنجاب کے ساتھ پبنہ، راج شاہی اور بوگرہ آ گیا۔ اس علاقے میں تعینات ہونے والے ۲۵ پنجاب رجمنٹ کے ''پینی پیکٹس'' سخت مشکلات کا شکار تھے اور کچھ کو تو باغیوں نے مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔

راج شاہی کے راستے میں پڑنے والی ساردا پولیس اکیڈمی باغیوں کے قبضے میں تھی۔ فوج جب یہاں پہنچی تو انھیں باغیوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور باغیوں کا قبضہ ختم کروانے میں ڈیڑھ سے دو گھنٹے تک لڑائی جاری رہی۔ صرف رائفلیں اور مشین گنیں استعمال ہوئیں۔۔ کوئی بھاری ہتھیار استعمال نہیں کیا گیا۔ پہلے مرکزی عمارتوں کو محفوظ کیا گیا۔۔ وہاں کچھ لاشیں پڑی تھیں۔ افسر کے مطابق وہاں باغیوں کی تقریباً بیس سے پچیس لاشیں پڑی تھیں؛ کہیں کہیں کوئی ہتھیار بھی پڑا تھا، اس سے یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ بندوق سے مزاحمت کرنے والا باغی مر چکا تھا یا فرار ہو گیا تھا۔

اس کے بعد افسر دریا کے کنارے پر گیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ باغی اور گاؤں والے دونوں بھاگ کر یہاں آ گئے تھے، کچھ دریا میں تیر کر دوسری طرف بھی چلے گئے تھے۔ میں نے پوچھا، ''آپ نے وہاں کیا کیا؟'' افسر نے جواب دیا، ''کچھ نہیں''۔ وہاں سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور وہ کچھ دیر میں واپس آ گیا۔[21]

۵۷ بریگیڈ کے افسران کے مطابق، جب ساردا پولیس اکیڈمی پر دوبارہ قبضہ کیا گیا تو وہاں سینئر افسران بشمول کمانڈنگ آفیسر، ۱۸ پنجاب لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان، میجر مدد حسین شاہ (جو ''اے کمپنی'' کی کمان کر رہے تھے اور 2IC بھی تھے کیونکہ اصل 2IC ڈھاکہ میں ملٹری ایکشن کے بعد اعصابی خلل کا شکار ہو گئے تھے) اور میجر جمیل مسعود، ''سی کمپنی'' کے کمانڈر، بھی موجود تھے۔ اس کے بعد وہ لوگ ''بی کمپنی'' کو کیپٹن مظفر اولاد حسین نقوی کی کمان میں وہاں چھوڑ کر راج شاہی کی طرف چلے گئے۔[22]

وہ لیفٹیننٹ جو ساردا پولیس اکیڈمی سے پدما کے کنارے پر گیا تھا وہ پورے یقین سے کہہ رہا

تھا کہ وہاں عورتوں اور مردوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں کیا گیا تھا، اور نہ ہی وہاں کسی کو مارا گیا، کم از کم جب تک ہم وہاں تھے تب تک تو نہیں۔

تھانہ پاڑہ — قتل عام

تھانہ پاڑہ وہ علاقہ تھا جسے جغرافیہ کی تاریخ نے ناکارہ قرار دے دیا تھا۔ برطانوی حکومت کے آخری دنوں میں ایک برطانوی جج نے، جو اس سے پہلے کبھی ہندوستان نہیں آیا تھا، نقشہ سازی کی غلطی کے باعث دو دشمن ریاستوں کے درمیان ۱۹۴۷ء میں اسے سرحد بنا دیا تھا۔ اپریل ۱۹۷۱ میں اس دریا کی مسام دار سرحدوں نے اسے باغیوں کی ملن گاہ (میٹنگ پوائنٹ) بنا دیا تھا۔ تاہم ۱۳ اپریل کا قتل عام ناگزیر نہیں تھا۔

بہت سے واقعات میں فوج کی پوزیشن کے متعلق تصدیق پر معلوم ہوا کہ، تھانہ پاڑہ کے متاثر ہونے والے بنگالیوں اور باغیوں نے پہلے فائرنگ کی تھی اور فوج نے ان پر جواباً فائرنگ کی۔ ہوسکتا ہے کہ بازار میں ان پر فائرنگ نہ کی جاتی تو فوجی یونٹ اپنے راستے چلی جاتی اور اسے مزید "بدمعاشوں" کی تلاش میں گاؤں تباہ نہ کرنے پڑتے۔ باغیوں نے خود کو گاؤں والوں میں شامل ہو کر چھپانے کی کوشش بھی کی، جس کی وجہ سے گاؤں والوں کی جان کا خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ رحمدل گاؤں والوں کو "حریت پسندوں" سے ہمدردی تھی۔

تھانہ پاڑہ میں دوران جنگ انسانی اور غیر انسانی سلوک کے بہت سے واقعات ہوئے۔ وہ سپاہی یا افسر جس نے ریحان علی کو عورتوں اور مردوں کو الگ کرتے ہوئے مردوں کی لائن سے باہر نکال دیا تھا اس نے واضح طور پر اس کی جان بچائی۔ اس نے ذاتی طور پر اس کو لائن سے باہر نکالا کیوں کہ بارہ سال کی عمر میں اس کو بچہ ہی تصور کیا جا رہا تھا— یعنی قتل کرنے یا تفتیش کرنے کے لیے وہ بہت چھوٹا تھا۔ جبکہ اسی شخص نے ریحان کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس شخص کو بے رحمی سے لات مار کر واپس بٹھا دیا تھا جو غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ اسے بلایا جا رہا ہے۔ وہ اسے آرام سے بھی واپس بیٹھنے کے لیے کہہ سکتا تھا لیکن اس نے اسے لات مار کر بٹھایا۔ بارہ سالہ بچے کی زندگی بچانے کا یہ عمل اس کی انسان دوستی کی گواہی دیتا ہے، لیکن شاید اس میں بھی قواعد پر عمل کرنا مدنظر تھا— بچے اور عورتیں مستثنٰی تھے اور ریحان غلط لائن میں بیٹھا تھا۔

ظلم وستم کا شکار ہونے والے لوگوں نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ تمام فوجی ظالم نہیں تھے — کچھ تو پریشان نظر آ رہے تھے، جبکہ دوسرے بدقسمت گاؤں والوں کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے

تھے۔ خواتین اور بچوں کو واپس بھیجے جانے سے پہلے جو سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے وہ کافی غمگین نظر آ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔ جہاں ایک فوجی زینت العالم ''جناح'' کے خلاف تھا تو دوسرا افسر یا سپاہی اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا کہ وہ ان کے انچارج کے پاس جا کر اپنی جان بخشی کے لیے درخواست کرے۔ تھانہ پاڑہ میں تعینات ایک افسر نے ذاتی طور پر وہاں جمع کیے گئے مرد دیہاتیوں کو قتل کیا تھا، لیکن دوسرا افسر جو اس جگہ سے کچھ ہی آگے گیا تھا اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ اسی سال بعد میں ایک افسر نے ریحان کو پولیس اکیڈمی میں کرائی جانے والی جبری مشقت سے رہائی دلوائی تھی اور اسے وہاں لانے والے سپاہیوں کو ڈانٹا بھی تھا۔ عبدالستار، جو فوجی افسر کی طرف سے گولی مارے جانے کے بعد لاشوں کے جلائے جانے والے ڈھیر سے زندہ بچ نکلا تھا، وہ وہاں بعد میں تعینات ہونے والے دوسرے میجر — شفیع اللہ — کی بہت تعریف کرتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ''رحمدل'' افسران کو ''بلوچی''، ''پٹھان'' یا ''سندھی'' سمجھا جاتا تھا، چاہے ان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو — ''پنجابیوں'' کے خلاف نفرت بنگالی قوم پرست تحریک نے پیدا کی تھی۔[۲۳]

تھانہ پاڑہ کی یادداشتوں نے بنگالیوں میں پیوست قوم پرستی کے سوال پر گہری فرقہ بندیوں کا انکشاف بھی کیا۔ ہر کوئی علیحدگی یا نئے آزاد ''بنگلہ دیش'' کے لیے نہیں لڑ رہا تھا۔ راج شاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے لے کر تھانہ پاڑہ کے دیہاتوں تک بہت سے ایسے بنگالی تھے جو متحدہ پاکستان پر یقین رکھتے تھے۔ مقامی ''رضا کاروں'' نے ''شبلی'' جیسے باغیوں کو پکڑ کر فوج کے حوالے کیا۔ ایک پڑوسی نے — جو ''رضا کار'' — تھا، آنے والے فوجیوں کو مطلع کیا کہ ریحان گھر میں ہے جب وہ ان سے بچ کر جھاڑیوں میں چھپ رہا تھا۔ بہت سے دیگر، جیسے اویا جان کے خاندان کے مزدور، کلی طور غیر سیاسی افراد تھے۔

مزید برآں، فوجی مشرقی پاکستان میں صرف نہتے لوگوں کا قتل عام نہیں کر رہے تھے۔ گاؤں والوں کے مطابق عوامی لیگ کے بہت سے کارکنان بھی تشدد اور قتل و غارت گری میں ملوث تھے۔ وہ نہ صرف مغربی پاکستانی سیکیورٹی اہلکاروں، مثلاً سارداپولیس اکیڈمی میں زیر تربیت پولیس اہلکاروں کو قتل کرنا چاہتے تھے، جنھیں بعد میں بھارتی سیکیورٹی فورسز کے حوالے کیا گیا بلکہ مشرقی پاکستان کے سویلینز، مثلاً ایشوردی کے بہاریوں کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ عوامی لیگ کے کارکنان کا قتل عام کا طریقہ نہایت ہی وحشیانہ تھا — وہ بہاریوں کو پہلے گولی مارتے تھے، پھر ان کو زندہ دفن کرتے تھے اور آخر کار انھیں بوری میں بند کر کے دریا میں پھینک دیتے تھے۔ بنگالی قوم پرست، فوجیوں اور عام شہریوں پر وحشیانہ طریقے سے تشدد کرتے اور انھیں قتل کرتے تھے۔

تھانہ پاڑہ اور، چند ہفتے قبل ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہونے والے ملٹری ایکشن میں ایک پر اسرار مماثلت پائی جاتی ہے، کیونکہ پہلے چند دیہاتیوں کو علیحدہ کر کے ان سے لاشیں اٹھوانے کا کام لیا گیا بعد میں انھیں بھی لاشوں کے قریب لائن میں کھڑا کر کے گولیاں ماردی گئیں۔ اسی رجمنٹ ۱۸ پنجاب، کی ایک کمپنی ۲۶-۲۵ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئی تھی۔ ۲۶ مارچ کو پرانے ڈھاکہ کے علاقے شنکھاری پاڑہ میں بھی ۱۸ پنجاب ہی گئی تھی۔ یہ غیر معمولی بات ہے کہ ایک ہی رجمنٹ کی کمپنیوں کو غیر متحارب بنگالیوں کے خلاف استعمال کیا جائے، اس کی وجہ سے پوری فوج کی ساکھ کو دھچکا لگا۔ پاک فوج کے لیے اس بات کا پتہ لگانا قدرے آسان ہوگا کہ کس افسر نے تھانہ پاڑہ میں جمع کیے گئے مردوں پر فائرنگ کی تھی اور اس کے کون کون سے اعلیٰ افسران نے اسے ایسا کرنے کی اجازت دی تھی یا اس کی حوصلہ افزائی کی تھی ــــ اگر کسی اور کے لیے نہیں تو یہ فوج کے حق میں ہی بہتر ہوگا۔[۲۴]

مارچ ۱۹۷۱ء کے دوران امریکی انتظامیہ، ان چند مغربی پاکستانیوں کے حوالے سے بہت پریشان رہی جو مشرقی پاکستان میں بحران سے نمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب شیخ مجیب ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آزادی کا اعلان کرنے والے تھے تو اس سے صرف ایک دن پہلے ۶ مارچ کو وائٹ ہاؤس میں ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ہنری کسنجر نے پوچھا، ''ان کے پاس کیسی طاقت ہے؟'' اس کے جواب میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر رچرڈ ہیلمز نے مغربی پاکستانی وفادار پاکستانی افواج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواباً کہا، ''۲۰۰۰۰ فوجی''۔ کسنجر نے پوچھا، ''کیا مشرقی پاکستانی مدافعت کریں گے؟''، ''ان کی آبادی کتنی ہے؟'' اس پر الیکسس جانسن، انڈر سیکریٹری برائے سیاسی امور نے جواباً کہا ''۷۵ ملین''، ''اور وہ مدافعت بھی کریں گے''۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ''کسی بھی قسم کی مدافعت کے نتیجہ میں خون کی ہولی ہوگی اور اس کے باوجود اس بات کی کوئی امید نہیں ہے کہ مغربی پاکستان دوبارہ کنٹرول حاصل کر لے''۔[۲۵]

فوجی ایکشن کے فوراً بعد، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ غلط نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔ ''ہوسکتا ہے کہ حالات بدل گئے ہوں'' صدر نکسن نے محتاط انداز میں ۲۹ مارچ کو کسنجر سے فون پر دریافت کیا، ''لیکن اگر آپ اقوام کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ۳۰۰۰۰ باقاعدہ فوج ۷۵ ملین کی آبادی پر قابو پا سکتی ہے۔ دیکھو ہسپانویوں نے کس طرح آکر انکاؤں کی سلطنت پر قبضہ کیا تھا؟ دیکھو برطانویوں نے ہندوستان میں کیا کیا؟'' ''بالکل صحیح''، کسنجر نے تائید کی۔ صدر نے کہا ''یہ تو صرف چند مثالیں ہیں''۔ کسنجر نے گفتگو میں انتہائی نوٹ شامل کرتے ہوئے کہا، ''ان مثالوں میں عوام کم و

بیش غیر جانبدار تھے''[۲۶]

۷۵ ملین افراد پر قابو پانے کے لیے جن نوجوان افسروں کو وہاں بھیجا گیا تھا وہ خود کو خدا سمجھنے لگے تھے۔۔ کہ جن کو اس بات پر قدرت حاصل تھی کہ فیصلہ کریں کہ کسے زندہ رہنا ہے اور کسے مرنا ہے۔البتہ تھانہ پاڑہ میں تعینات افسر نے محمد زینت العالم''جناح'' کے گڑگڑانے پر اس کی جان بخشی کر دی تھی، لیکن باقی ماندہ افراد کو قتل کر دیا تھا۔

باب ششم:

ہندوؤں کو ہراساں کرنا

اقلیتوں سے امتیازی سلوک کی سیاست

"ہمیں اس بات کا ادراک ہونے لگا تھا کہ مسلمان بنگالیوں کے قتل عام کے لیے "نسل کشی" کی اصطلاح کا استعمال کرنا مناسب نہ تھا۔ جب کہ دوسری جانب خصوصی سلوک روا رکھنے کی غرض سے جس انداز سے چن چن کر ہندوؤں کا انتخاب کیا گیا اس کے لیے 'نسل کشی' کی اصطلاح کو استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

— آرچر بلڈ، امریکی قونصل جنرل، ڈھاکہ، ۱۹۷۱[1]

"وہ ہمیں اس لیے نہیں مارتے تھے کہ ہم ہندو تھے، بلکہ اس لیے کہ ہم ان کے دشمن تھے؛ ہمیں واپس آنا تھا اورہم خالی ہاتھ واپس نہ آئے۔"

— نیتائی گائن، چکنگر میں ہندو پناہ گزیں مردوں پر حملے میں
بچ جانے والا شخص، ۲۰ مئی ۱۹۷۱۔[2]

کھلنہ اور جیسور اضلاع کی سرحدوں پر دریائے بھادرا کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ چکنگر ہے۔ مئی ۱۹۷۱ء میں یہ علاقہ ان ہندوؤں کے لیے عارضی جائے پناہ بن گیا جو بھارت جانے کے لیے اردگرد کے علاقوں سے مغرب کا رخ کیا کرتے تھے۔ کھلنہ ضلع سے ہندو دیہاتی کشتیوں کے ذریعے چکنگر پہنچتے تھے اور یہاں سے براستہ سڑک ہندوستانی سرحد کی جانب روانہ ہوا کرتے تھے۔

۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو ہزاروں پناہ گزین اس عارضی پناہ گاہ میں دریا کے کنارے اور بازار میں

موجود تھے۔ وہ کشتیوں کے ذریعے وہاں پہنچ رہے تھے، مقامی مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی کشتیاں اور قیمتی یا فالتو سامان اونے پونے داموں بیچ رہے تھے یا ویسے ہی چھوڑ چھاڑ کر جا رہے تھے اور کچھ زمین پر بیٹھے پیدل بھارت کی جانب روانہ ہونے سے پہلے کھانے پینے میں مصروف تھے۔ وہ جو کچھ تھوڑا بہت سامان لے جاسکتے تھے انھوں نے اٹھا رکھا تھا۔ عینی شاہدین کے مطابق اس مقام پر میلے کا سماں تھا۔[۳] زندہ بچ جانے والوں اور عینی شاہدین کے مطابق، ۳ پک اپ ٹرکوں میں فوجیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ چکنگر میں آیا اور انھوں نے پناہ گزینوں میں موجود مردوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ حملے کے بعد بے شمار مُردہ اور نیم مُردہ افراد سے دریا کا کنارہ اٹا پڑا تھا۔ بچ جانے والوں میں سے کچھ بھارت کی جانب ہولیے اور کچھ واپس اسی گاؤں چلے گئے جہاں سے وہ آئے تھے۔ چکنگر کے باسی جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے انھیں دریا برد کرنے لگے۔

کھلنہ کے ایک خوبصورت گاؤں میں میری گفتگو ایک ہندو سے ہوئی جو چکنگر میں ہونے والے قتل عام سے بچ گیا تھا۔ کچھ لوگ فوجیوں کے آنے سے پہلے ہی بھارت جا چکے تھے: کچھ کو بھارت جاتے ہوئے مار دیا گیا اور کچھ حملے کے بعد بھارت چلے گئے لیکن بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد پھر واپس آگئے: جبکہ کچھ لوگ حملے کے بعد ہی اپنے گاؤں واپس لوٹ آئے تھے۔ عورتوں نے اپنے بھائیوں، شوہروں اور بیٹوں کو کھو دیا تھا اور بہت سے مرد اس سانحے میں محفوظ بھی رہے تھے۔

نئی تعمیرات کی وجہ سے چکنگر کا بازار دریا کے کنارے تک پھیل چکا ہے جس کی وجہ سے کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے، لیکن دریا کے کنارے کے مناظر اب بھی کم و بیش وہی ہیں۔ اس دن ایک مقامی دیہاتی کشتی کو کئی کئی افراد کا بوجھ جھیلنا پڑ رہا تھا۔ میں نے کئی علاقہ مکینوں سے انٹرویو کیے، جن میں ایک مسلمان ملاح بھی شامل ہے جسے فوجی زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے تاکہ لاشوں کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔

عوامی لیگ کے ایک سیاستدان کو اس بات کا افسوس ہے کہ بنگلہ دیش کی تاریخ میں چکنگر کے واقعے کو کوئی اہم مقام نہ مل سکا اور وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ مذکورہ واقعہ کو 1971 کے ''سب سے بڑے قتل عام'' کے طور پر تاریخ کا حصہ بنایا جائے۔[۴] حیرت کی بات یہ ہے کہ دیہاتیوں کے مطابق اس کا انکل (چچا/ ماموں) حکومت کے حامی رضا کاروں میں صف اول میں تھا اور غالباً آرمی کو وہاں لانے میں اسی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس بات پر کوئی اتفاق نہ ہو سکا کہ آرمی ستکھیرا کی جانب سے وہاں آئی تھی یا جیسور کی جانب سے ۔ چکنگر کا روٹ کچھ اس طرح کا ہے کہ آرمی کا دونوں اطراف سے آنا ممکن تھا۔ کوئی بھی شخص یہ بات وثوق سے نہیں بتا سکا کہ آرمی کے وہاں

آنے کا مقصد کیا تھا ماسوائے اس کے کہ کسی مقامی شخص نے انھیں اس مقام پر بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کے اکٹھے ہونے کی اطلاع دی تھی۔

جھودنگا کے مقام پر گھات لگایا جانا

چلنگر سے مزید آگے مغرب کی سمت میں بھارت کی سرحد کی جانب جھودنگا کا مقام واقع ہے۔ کچھ پناہ گزین جو چلنگر سے گزر چکے تھے اسی صبح سڑک پر جاتے ہوئے جھودنگر کے مقام پر حملے کی زد میں آ گئے۔ بہت ممکن ہے کہ فوجیوں کا وہی گروہ بعد میں چلنگر کی جانب روانہ ہو گیا ہو۔

تارا داسی بیراگی— ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو اپنے شوہر، تین بیٹوں، دیور، اس کی بیوی اور دو بچوں سمیت بھارت جا رہی تھی۔ اس کا تعلق بولا بونی گاؤں سے ہے۔ میں نے تارا داسی سے پوچھا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر کیوں جا رہے تھے؟ تو اس نے جواب دیا ''ظلم'' میں نے پوچھا ''ظلم کون کر رہا تھا؟'' اس پر تارا داسی اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ ہم لوگ ایک دوسرے گاؤں میں ایک صحن میں موجود تھے۔ ہمیں دیہاتیوں نے گھیر رکھا تھا (ان میں زیادہ تر مسلمان تھے) پھر اپنی کہانی مزید آگے بڑھانے سے قبل خود بولی ''مسلمان اس گاؤں کے نہیں تھے''۔

تارا داسی ایک ہندو ہے اور اب بھی بنگلہ دیش میں رہتی ہے، ایک ایسا ملک جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور جس کا ریاستی مذہب اسلام ہے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ گاؤں کے باہر سے آنے والے بنگالی مسلمانوں سے خوفزدہ ہو گئی اور کشتی کے ذریعے اپنے خاندان سمیت چلنگر پہنچ گئی۔ وہ مشرقی پاکستان سے راہِ فرار اختیار کر کے بھارت جانے والے لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔

تارا داسی کے مطابق، جھودنگا کے مقام پر چند فوجی اپنی گاڑیوں سے اترے اور انھوں نے مہاجرین کے قافلے پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ وہ لوگ مردوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ تارا داسی کے شوہر کالی پاڑہ بیراگی اس کے سب سے بڑے جوان بیٹے رامیش، اور اس کے دیور بنوئے بیراگی کو گولیاں لگیں اور وہ مارے گئے۔

جب تارا داسی واپس لوٹ کر گھر آئی تو اس کے گھر میں کوئی سامان نہ تھا۔ اس کے زندہ بچ جانے والے دو بیٹوں میں سے ایک بنگلہ دیش میں رہتا ہے اور دوسرا بھارت میں کام کرتا ہے۔

معینہ مستری— ہاتبتی گاؤں سے تعلق رکھنے والی معینہ مستری بھی اپنے شوہر اور سسر کے ساتھ اپنے گاؤں سے کوچ کر رہی تھی۔ یہ لوگ بھی کشتی کے ذریعے چلنگر پہنچے تھے اور براستہ سڑک بھارت جا رہے تھے۔ معینہ کو یاد ہے کہ راستے میں ایک موڑ پر ان کا سامنا فوجیوں سے ہو گیا۔ انھوں

نے مردوں کو الگ کر دیا، اس پر مردوں نے کھیتوں میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ فرار ہونے والوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کا شوہر شرت مستری مارا گیا اور بھگدڑ کے عالم میں اس کا سسر گری دھاری مستری کھو گیا، جس سے اس کی ملاقات بعدازاں بھاوت میں ہوئی۔

آخر کار معینہ کو اپنے ٹوٹے پھوٹے اور لٹے ہوئے گھر میں واپس لوٹنا پڑا۔ اس کا ایک نوعمر بھائی چیتا نیا گولیوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔ معینہ اب اپنے بھائی کے ساتھ رہتی ہے، لیکن اس نے بڑے فخریہ انداز میں بتایا کہ وہ اپنے گزر بسر کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے محنت کرتی ہے۔

چکنگر میں قتل عام

لاتیکا گائن — لاتیکا گائن کا تعلق دونیا پھندنا می گاؤں سے ہے۔ جس دوران وہ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کے واقعات کو ماضی کے جھروکوں میں تلاش کر رہی تھی ہم اس کے صحن پر سیڑھیوں میں بیٹھے تھے۔ اس دن لاتیکا گائن اپنے شوہر ایشور گائن، اپنے چار بیٹوں، بڑی بہو، دو پوتوں اور ایک بیٹی کے ساتھ چلنگر میں بھارت جانے کے منتظر تھے۔ وہ لوگ دریا کے کنارے برگد کے ایک درخت کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا بنوئے تقریباً ۲۳ برس کا تھا۔

لاتیکا بڑی مشکل سے کہانی کے اس موڑ پر پہنچی جب فوجیوں نے اس کے ساتھ کھڑے اس کے شوہر کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ لیکن جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بڑے بیٹے کو مرتے ہوئے دیکھنے کا ذکر کرنے لگی تو غم سے نڈھال ہو گئی۔ تینتیس برس کا طویل عرصہ بھی ماں کے زخموں کو نہ بھر سکا تھا۔ اس کی بیوہ بہو بھی پوجا سے فارغ ہونے کے بعد خاموشی سے آکر ہمارے پاس بیٹھ گئی۔

نیتائی گائن۔ نیتائی گائن وہ ہندو مرد ہے جو ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو چلنگر کے قتل عام سے زندہ بچ رہنے میں کامیاب رہا۔ ایشور گائن کا ایک رشتے دار، لاتیکا گائن کا شوہر نیتائی ۱۹۷۱ء میں ۲۲ برس کے لگ بھگ تھا۔ وہ اپنے باقی خاندان کے جانے کے ایک دن بعد بھارت کے لیے روانہ ہوا کیونکہ مناسب تعداد میں کشتیاں میسر نہ تھیں۔ نیتائی کا کہنا ہے کہ ہندو اس علاقے سے مسلسل دو ہفتوں سے فرار ہو رہے تھے۔ جب وجوہات پوچھی گئیں تو اس نے بھی ''ایک خاص طبقے سے تعلق رکھنے والے'' بنگالی مسلمانوں کے بارے میں بتایا کہ وہ لوگ لاٹھیوں اور درانتیوں سے مسلح ہو کر ہندوؤں کے گاؤں میں لوٹ مار کی غرض سے آیا کرتے تھے۔

چلنگر کے واقعے سے قبل اردگرد کے علاقوں میں مسلح افواج سے تصادم کی خبریں بھی ملتی ہیں۔ اپریل کے اواخر میں قریب ہی ایک اسکول چکرا کھالی سیکنڈری اسکول، پر آرمی نے بمباری کی تھی۔

اس کی وجہ مجھے یہ بتائی گئی کہ مذکورہ اسکول باغیوں کے زیر استعمال تھا۔ مئی کے مہینے میں قریب ہی بدم تولہ نامی گاؤں میں فائرنگ کا واقعہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں نیتائی کا انکل (چچا/ ماموں) زخمی ہو گیا تھا اور ایک گھر کو آگ بھی لگائی گئی تھی جس کا دورہ خود میں نے بھی کیا۔ اس واقعے کے بعد تمام افراد وہاں سے چلے گئے۔

نیتائی ۲۰ مئی کو 9:30 سے 10:00 بجے کے درمیان چلکنگر پہنچا تھا۔ ابھی وہ باقی لوگوں کے ساتھ براستہ سڑک بھارت کی جانب کوچ کرنے ہی والا تھا کہ پکی سڑک کی جانب سے، جس پر انھیں جانا تھا، فائرنگ شروع ہو گئی۔ نیتائی کے مطابق فوجیوں کے تین ٹرک آئے تھے اور ۵۰ سے ۶۰ کے قریب فوجی ان ٹرکوں میں سوار تھے۔ ان کے ساتھ چند غیر مسلح بہاری بھی تھے۔ اس کے خیال میں یہ لوگ جیسور کی جانب سے آئے تھے۔ فوجیوں کا ایک گروہ کشتی میں بیٹھ کر دریا کے شمالی کنارے کی جانب بھی گیا تھا۔

نیتائی واپس اپنے خاندان والوں کی طرف دوڑا۔ اس نے بوڑھے لوگوں کو وہیں چھوڑ دیا جہاں وہ تھے اور یہ سوچ کر وہاں سے بھاگا کہ فوجی نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنائیں گے۔ اس نے اپنے کزن رنجیت، اپنے بھتیجے بنوئے اور ایک دوسرے بھتیجے دھیرین کو بھی بھاگنے کو کہا۔ نیتائی بذات خود دوڑ کر ایک مسجد میں گھس گیا جہاں چند مسلمان یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ مسلمان ہیں بآواز بلند قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ نیتائی نے کھجور کی بنی ہوئی چٹائی اپنے اوپر لپیٹ لی اور گاؤں کی ایک عورت اس پر بیٹھ گئی۔

وہاں چھپے چھپے نیتائی اپنے گھر والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تین سپاہیوں نے اس کے والد، چچا اور والد کے بہنوئی اور بڑے بھائی ایشور کے ماتھے پر بندوقیں رکھیں اور انھیں مار ڈالا۔ اس موقع پر اس کا بھتیجا بنوئے اور کزن رنجیت چھپی ہوئی جگہوں سے نکل آئے اور سپاہیوں کو پکڑ لیا۔ ایک جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس کی تائی نے سپاہی کو پکڑ لیا اور چلا چلا کر کہنے لگی ''ماریں نہ، ماریں نہ''۔ ایک سپاہی نے دوبارہ اپنی بندوق سنبھال لی اور بنوئے کو مار ڈالا، دوسرے نے رنجیت اور پھر تائی کو مار دیا— نیتائی کے خیال میں اس نے تائی کو غصے کی وجہ سے مارا تھا، کیونکہ تائی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے پھر دھیرین کو نہیں دیکھا— وہ غالباً چند دیگر لوگوں کے ساتھ برگد کے درخت کے ایک تنے کے نیچے دب کر مر گیا تھا۔

نیتائی کا خیال ہے کہ فائرنگ تین چار گھنٹوں تک جاری رہی۔ اس کے مطابق اس علاقے میں ۸ سے ۱۰ ہزار لوگ تھے۔ سپاہی جو ان آدمیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ نیتائی بتاتا ہے کہ اس نے

کسی فوجی کو کسی عورت کے ساتھ زیادتی کرتے نہیں دیکھا اور نہ ہی چلنگر سے جانے کے بعد اس نے ایسی کوئی بات سنی تھی۔

آخرکار جب یہ سارا معاملہ ختم ہوا، تو نیتائی خاندان کے بچ جانے والے لوگوں کو کشتی کے ذریعے مشرق کی جانب دور لے گیا یعنی کہ وہ بھارتی سرحد سے دور چلا گیا۔ پھر وہ لاشوں کے پاس واپس چلنگر آیا۔ اسے اپنے بھتیجے بنوئے کی جیب سے ۲۰۰۰ روپے اور ۳ سے ۴ سونے کی بھوریاں (سکے) ملیں۔ ایک نامعلوم شخص کے اٹیچی کیس میں ۸۰۰۰ سے ۱۰،۰۰۰ روپے تھے۔ اس نے لاشوں کو دریا کی جانب لے جانے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ مقامی لوگ مرنے والوں کا سامان لوٹ رہے تھے جبکہ چند زخمی افراد درد سے کراہ رہے تھے۔ چند لوگ دریا میں ڈوب کر بھی مر گئے تھے۔

واپس جاتے ہوئے نیتائی نے دیکھا کہ ایک شخص ایک کم گہرے تالاب میں بار بار غوطے لگا رہا تھا۔ اس کے مطابق چونکہ اس کا پورا خاندان مارا گیا تھا اس لیے وہ بھی مرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیتائی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بھارت جائے، تربیت حاصل کرے اور پھر اپنے خاندان والوں کے قتل کا بدلہ لیتے ہوئے اپنی جان دے۔ اس پر اس شخص نے غوطے لگانا بند کر دیے اور چلا گیا۔

لاشوں میں نیتائی نے ایک چھوٹے بچے کو بھی دیکھا جو اب تک زندہ تھا اور اپنی ماں کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کے والدین مر چکے تھے۔ وہ اس بچے کو کشتی میں لے آیا۔ وہ بچہ رو رہا تھا۔ ایک دوسری کشتی میں بیٹھی ایک عورت نے نیتائی سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ اس بچے کے ماتھے پر کوئی نشان تو نہیں ہے— جب نیتائی نے دیکھا تو واقعتاً ایک نشان موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ مرنے والی بچے کی ماں اس عورت کی بہن تھی۔ یہ لوگ بریسال کے علاقے موتھباڑیہ سے تھے۔ نیتائی نے بچہ اس عورت کو دے دیا۔ کہانی کے اس موڑ پر اب تک پرسکون رہنے والا نیتائی گائن رو پڑا۔

شیلندرا ناتھ جوردار۔ شیلندرا ناتھ جوردار (شائلین) ایک ہندو ہے جس کا تعلق کاتھا ماری گاؤں سے ہے۔ یہ چلنگر کے قتل عام سے زندہ بچ گیا تھا۔

۱۹۷۱ء میں شائلین کی عمر ۱۷ یا ۱۸ برس تھی۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی ماں، بھائی اور بہن کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس کا والد ایک کسان تھا۔ ان کا ایک چھوٹا سا فارم تھا اور باقی کچھ زمین پر شراکت داری کی بنیاد پر کاشتکاری کی جاتی تھی۔

شائلین کے مطابق کاتھاماری گاؤں سے دریا کے اس پار مسلمان بنگالیوں کا ایک گاؤں ہالیہ واقع تھا، ۱۹۷۱ء میں ہالیہ کے لوگوں نے اپنے گاؤں میں ہی لوٹ مار شروع کر دی اور ہالیہ کے

ہندو باسی کا تھا ماری کا رخ کرنے لگے۔ آنے والے ہندوؤں نے بتایا کہ مسلمان نہ صرف ان کی املاک ان سے چھین رہے ہیں بلکہ ان کی عورتوں کو بھی اغواء کیا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ تو ہندوؤں نے حفاظتی نظام بنا کر رہنے کی کوشش کی۔ لیکن بعدازاں فیصلہ کیا گیا کہ وہ لوگ مشرقی پاکستان چھوڑ کر بھارت چلے جائیں گے۔

شائلین کا بھارت میں کوئی بھی جان پہچان والا نہیں تھا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ کشتی میں براستہ دموریہ ۲۰ مئی کو چلکنگر پہنچا۔ وہ اپنی ذاتی کشتی میں وہاں آئے تھے — جو انھیں وہیں چھوڑنا پڑی۔ مقامی مسلمانوں نے کشتی اور اس میں موجود ہر چیز پر قبضہ کرلیا— شائلین کے مطابق چند افراد نے تھوڑا بہت کرایہ دیا اور چند افراد نے کچھ بھی نہیں دیا۔

بڑی تعداد میں دریا کے کنارے بیٹھے لوگ کھا پی رہے تھے اور بیٹھنے کی جگہ بمشکل میسر تھی۔ شائلین اور اس کے گھر والے بھی ایک جگہ بیٹھ گئے اور اپنا کھانے کھانے لگے۔ جیسے ہی وہ وہاں سے چلنے لگے کسی نے انھیں اطلاع دی کہ آرمی والے آرہے ہیں۔ پہلے انھیں کچھ فاصلے پر گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں اور بعد میں قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ بھاگنے لگے اور کچھ لوگوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ شائلین اس وقت بازار میں تھا جب اس نے خاکی وردی میں ملبوس دو سپاہیوں کو فائرنگ کرتے ہوئے بازار کی طرف آتے دیکھا۔ وہ دریا کی جانب فرار ہوگیا۔ معمر افراد نے شائلین کو اس جانب نہ دوڑنے کا مشورہ دیا، لیکن اس نے ان کی ایک نہ سنی۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگائی اور کشتیوں کی آڑ میں جا چھپا۔ پھر اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کہیں اسے کوئی کشتیوں کے پیچھے سے دیکھ نہ لے اور وہ پانی کی سطح کے نیچے تیرنا شروع ہوگیا۔ جیسے ہی سانس لینے کے لیے وہ پانی کی سطح پر آیا ایک گولی زناٹے کے ساتھ اس کے کان پر سے گزری۔ اس نے ایک مرتبہ پھر پانی میں غوطہ لگا دیا۔ ایک مرتبہ پھر سطح پر آکے وہ گولی کی زد میں آنے سے بال بال بچ گیا۔ لیکن تیسری مرتبہ ایک گولی اس کی بائیں کہنی پر لگی اور اس کی ہڈی ٹوٹ گئی — اس نے کہنی پر زخم کا نشان بھی مجھے دکھایا۔ دریا اسی سمت بہہ رہا تھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد شائلین فائرنگ کی پہنچ سے دور جا چکا تھا۔

بالآخر وہ کنارے پر آگیا اور نڈھال ہو کر لاشوں کے درمیان گر پڑا۔ وہ ساری رات وہیں پڑا رہا۔ صبح ایک مقامی مسلمان عورت نے جب اسے زندہ پایا تو چند لوگوں کی مدد سے اسے گھر لے گئی اور جڑی بوٹیوں سے اس کے زخموں کا علاج شروع کر دیا۔ اسی دوران فائرنگ کی زد سے بچ کر اس کی ماں، بہن اور بھائی جیسور کی جانب چلے گئے تھے۔ اگلے دن وہ لوگ واپس آگئے کیونکہ اسے

کھو دینے کے بعد ان کے پاس کوئی راہ نمانہیں تھا۔ چلنگر میں انھیں بتایا گیا کہ کاتھاماری گاؤں کا ایک زخمی لڑکا گاؤں کے کسی گھر میں زیرِعلاج ہے، اس طرح یہ لوگ ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے جا ملے۔ یہ لوگ تو بچ گئے تھے، لیکن شائلین کو بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی بڑی بہن کا شوہر اور سسر فائرنگ میں مارے جا چکے تھے۔ وہ چلنگر کے اس گھر میں ایک ہفتہ مقیم رہا اور پھر کاتھاماری کی جانب روانہ ہوگیا۔

اس کا بھائی جو دس بارہ سال کا تھا اس واقعہ میں زندہ بچ نکلا۔ وہ معمر افراد جنھوں نے شائلین کو بھاگنے سے منع کیا تھا سب کے سب مارے جا چکے تھے۔ صرف خواتین کو زندہ چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کا گاؤں مکمل طور پر ویران ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ ایک قریبی ہندو گاؤں خولسی بنیاں چلے گئے۔ اس گاؤں میں اب تک چند لوگ موجود تھے اور سال کے اخیر تک وہ لوگ اسی گاؤں میں قیام پذیر رہے۔ زندگی بہت سخت تھی اور انھیں خیرات پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن شائلین کے مطابق ان دنوں چاول بہت سستے تھے۔

بعد ازاں علاقے میں ایک ''رضا کار''[5] فورس بنا دی گئی۔ انھوں نے ہندوؤں کو دھمکانا شروع کر دیا اور ان پر الزامات لگائے کہ وہ بھارتی لوگوں کو پناہ دے رہے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی پڑوس میں آجاتا تو شائلین جھاڑیوں میں چھپ جاتا۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں ''رضا کاروں'' نے کئی ہندوؤں کو اغوا کر کے قتل کر دیا تھا، لیکن شائلین کے مطابق یہ سب کچھ ذاتی دشمنیوں کا شاخسانہ تھا اور سیاست کا اس بات میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔

شائلین نے اس کے بعد پھر کبھی ملٹری والوں کو نہ دیکھا۔ جب وہ اپنے گاؤں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سب کچھ لٹ چکا تھا۔ بعد میں بحث مباحثے کے دوران لوگوں کو اس بات کا پتہ لگا کہ چلنگر کے لوگوں (مسلمانوں) نے ۲۰ مئی کے دن آرمی والوں کو بلوایا تھا تاکہ راہِ فرار اختیار کرنے والے ہندوؤں کا سونا، چاندی اور مال و متاع لوٹا جا سکے۔

محمد واجد علی۔ محمد واجد علی اور اس کا بھائی شیر علی دونوں چلنگر کے مسلمان رہائشی ہیں۔ یہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو چلنگر میں مارے جانے والے ہندوؤں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے دریا برد کیا تھا۔

واجد علی ایک ملاح ہے۔ اس کے مطابق صبح کے وقت جب وہ اور دیگر مقامی مسلمان بازار میں بیٹھے ہوئے تھے ایک لال رنگ کی جیپ آئی۔ گاڑی میں بیٹھے افراد نے پوچھا کہ ہندو لوگ کہاں ہیں۔ واجد اور اس کے ساتھ بیٹھے لوگوں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ مسلمان ہیں ''نعرہ تکبیر'' لگانا

شروع کر دیا۔

بعد میں فوجیوں کی دو گاڑیاں آئیں۔ یہاں واجد علی بڑے طمطراق کے ساتھ ایک خط امتیاز کھینچتا ہے کہ "پاکستان آرمی نے کوئی گولی نہیں چلائی تھی، گولی تو بہاری آرمی نے چلائی تھی"۔

مقامی عوامی لیگی سیاستدان اور دیگر افراد نے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا، لیکن واجد علی اس بات پر مصر تھا کہ گولی بہاریوں نے چلائی تھی۔ اس کے مطابق صبح کے وقت جو لوگ لال جیپ میں ہندوؤں کے بارے میں پوچھنے کے لیے آئے تھے وہ پاکستان آرمی سے تھے جبکہ بعد میں آنے والے فوجی جنھوں نے قتل عام کیا وہ "بہاری فوجی" تھے۔[۹]

وہ لوگ جو کوئی بھی تھے، واجد علی کے مطابق انھوں نے اس جگہ کو ویران کر دیا تھا۔ جب فائرنگ رک گئی اور مارنے والے جا چکے تو موجودہ عوامی لیگ کے سیاستدان کے چچا عبدالوہاب نے واجد علی اور دیگر لوگوں سے لاشیں دریا میں پھینکنے کو کہا۔ واجد علی کے مطابق عبدالوہاب نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بدلے میں ہر فرد کو ۴۰۰۰ روپے دیئے جائیں گے؛ اس کے علاوہ لاشوں سے ملنے والا قیمتی سامان اور پیسے بھی وہ رکھ سکتے تھے۔ واجد علی اور اس کے بھائی نے لاشوں کے پیروں میں رسی باندھ کر انھیں دریا کی جانب گھسیٹنا شروع کیا۔ واجد کے مطابق دونوں افراد نے چار گھنٹوں کے دوران "سینکڑوں" لاشیں دریا برد کیں — اور کچھ دیر بعد انھوں نے لاشیں گننا چھوڑ دیں — لیکن کام کے بعد انھیں صرف ۲۰۰۰ روپے دیئے گئے۔ البتہ واجد علی بتاتا ہے کہ انھیں لاشوں سے کافی مال ملا تھا— تقریباً ۸۰۰،۰۰۰ روپے اور چار کلو سونا۔ اس دعوے پر بھی وہاں بیٹھے لوگوں نے اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا۔ سونے کی قیمت کچھ بھی تھی، واجد علی نے ۱۲۰۰ روپے کے عوض وہ سونا ایک مقامی شخص کے ہاتھوں بیچ دیا، لیکن اسے محض ۵۰۰ روپے ملے۔ جہاں تک "آٹھ لاکھ روپے" کا تعلق ہے، تو وہ رقم اس نے ایک مقامی عوامی لیگ کے رہنما حیدر کو دے دی جس نے کچھ عرصے بعد واجد علی کو بتایا کہ ایک بینک ڈکیتی کی وجہ سے اب وہ پیسے گردش میں نہ تھے، اس طرح سے وہ پیسہ بھی اکارت گیا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اگلے سال واجد علی کا انٹرویو کیا۔ اس مرتبہ یہ انٹرویو چکنگر کے سیاسی رہنماؤں سے دور ایک دوسرے گاؤں میں تھا۔ اس کی کہانی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ چکنگر میں لوگوں کو قتل کرنے والے "خان سینا" (پاکستان آرمی) کے لوگ نہ تھے بلکہ "بہاری ملٹری" والے تھے۔ اس نے پھر وہی بات دہرائی کہ دریا میں پھینکی گئی لاشوں سے اسے اور اس کے بھائی کو چار کلو سونا اور آٹھ لاکھ روپے وصول ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اسے شک تھا کہ رقم

اور سونے کے معاملے میں اسے ان لوگوں نے دھوکہ دیا تھا جن کے حوالے اس نے یہ چیزیں کی تھیں۔ اس نے دبے الفاظ میں یہ ذکر بھی کیا کہ دو سادہ لوح انسانوں کو دھوکہ دینے والے وہ لوگ کس طرح اذیت ناک موت کا شکار ہوئے۔ وہ اسے مکافاتِ عمل قرار دیتا ہے۔

محمد واجد علی نے بتایا کہ اُس دن اس نے اور اس کے بھائی نے جتنی لاشیں بھی دریا میں بہائی تھیں، وہ سب کے سب مرد تھے۔ ان میں ایک بھی عورت یا بچہ شامل نہ تھا۔ انھیں ایک عورت زخمی حالت میں ضرور ملی تھی جس کے کندھے میں گولی لگی تھی۔ اس کا نام شفالی تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے اس عورت کو اپنی بہن بنا لیا اور وہ واجد کو اہم تہواروں پر دعوت پر بلایا کرتی تھی۔

چکنگر کا ایک تجزیہ

عینی شاہدین اور مرنے والوں کے زندہ بچ جانے والے لواحقین کے بیانات کے بعد اب اس بات میں تو کوئی شک نہیں دکھائی نہیں دیتا کہ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کو چکنگر کے مقام پر بالغ ہندو مردوں کو بلا امتیاز قتل کیا گیا۔ تاہم اس ضمن میں دیگر حالات ابھی غور طلب ہیں۔

بات کچھ اس انداز سے شروع کی جاسکتی ہے کہ اس علاقے میں یہ واقعہ اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ تھا۔ نیتائی گائن نے چکنگر کے اس واقعے جیسے واقعات کے بارے میں پھر کبھی کچھ دیکھا نہ سنا۔ یہی بیان اچنتیا ساہا کی جانب سے بھی سننے کو ملتا ہے جو ہندو ہے اور اسی دن واقعہ سے کچھ دیر پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ چکنگر سے گزرا تھا۔ یہ دونوں افراد مدبرانہ سوچ اور ٹھنڈے دماغ کے مالک ہیں۔ ان دونوں نے چکنگر کے واقعے اور ۱۹۷۱ء سے منسوب دیگر واقعات پر کافی سوچ بچار سے کام لیا ہے اور اس ضمن میں یہ ان لوگوں کی طرح جذبات کی رو میں نہیں بہتے جو ان کے مقابلے میں مصائب کا شکار بھی کم ہوئے اور مصائب ان کے مشاہدے میں بھی کم ہی آئے۔ اچنتیا ایک سلجھا ہوا شخص ہے جو مارکس ازم پر یقین رکھتا ہے اور چکنگر میں تحقیق کے دوران میرا قیام بھی بنیادی طور اسی کے ہاں رہا۔ اس نے اس سلسلے میں ہر طرح سے میری رہنمائی بھی کی۔ اس کی حس مزاح بھی بہت اچھی ہے اور بنگلہ دیش کے انتخابات میں حصہ بھی لیتا رہا ہے۔

جس شخص سے بھی میری بات ہوئی اس نے یہی بتایا کہ کسی نے چکنگر سے ہی آرمی کو بلوایا تھا، لیکن قتل عام کے محرکات غیر واضح ہی رہے۔ چکنگر سے ہزاروں کی تعداد میں پناہ گزین گزر رہے تھے لیکن اس دن سے پہلے تک کسی کا دھیان اس جانب نہ گیا۔ اگر حکومت صوبے کو ہندوؤں سے پاک کرنا چاہتی تھی تو اس مقصد کے لیے انہیں ہندوستان کیوں نہ جانے دیا گیا؟ شواہد اس بات کو

ثابت کرتے ہیں کہ دراصل مقامی بنگالی مسلمان اس مقصد کے لیے ہندو بنگالیوں کو بے دخل کر رہے تھے، اور عموماً ان کے ذہن میں یہ بات بھی ہوا کرتی تھی کہ ہجرت کر کے جانے والوں سے مال و متاع بھی چھین لیا جائے۔ چلنگر کے مقامی مسلمانوں کو اور فوائد بھی حاصل ہو رہے تھے، ایک جانب وہ کشتیوں کے ذریعے جانے والے ہندوؤں سے کمائی کر رہے تھے اور دوسری جانب ان کی قیمتی اشیاء کو اونے پونے خرید کر اور چھوڑی ہوئی اشیا پر قبضے جما کر فوائد حاصل کر رہے تھے۔ مذکورہ حملے کی وجہ سے مہاجرین کا یہ بہاؤ رک گیا اور باقی ماندہ لوگ اپنے اپنے گاؤں واپس لوٹ گئے۔[۷]

جیسا کہ شائلین جو ردار بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہیں پکا یقین تھا کہ چلنگر کے مسلمان باسیوں نے ہی آرمی کو ہندوؤں پر حملے کی دعوت دی تھی تا کہ جو روپیہ پیسہ اور سونا چاندی وہ لوگ اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے وہ اسے لوٹ سکیں۔ بالفاظ دیگر اس حملے کا ایک ممکنہ مقصد یہ بھی تھا کہ ڈاکہ زنی ہو سکے۔ اگر نیتائی گائن کو صرف ایک شخص کی لاش سے ۱۰،۰۰۰ روپے مل سکتے ہیں تو واجد علی کو سینکڑوں لاشوں سے لاکھوں روپیہ اور چار کلو سونا ملنا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ تاہم مارنے والوں نے لوٹ مار نہیں کی تھی۔ قتل عام کرنے والے باوردی تھے اور باہر سے آئے تھے جو قتل عام کر کے چلے گئے؛ لوٹ مار کرنے والے مقامی تھے۔ اس لیے مارنے والوں کا محرک وہ لوٹ مار نہ تھی جو بعد میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

تاہم اس قتل عام کو تمام ہندوؤں کی نسل کشی گردانا جا سکتا ہے جیسا کہ امریکی قونصل جنرل آرچر بلڈ لکھتے ہیں۔ مزید یہ کہ مقتولین میں بھی صرف بالغ مردوں کو چنا گیا— بلا شبہ بلڈ کی تحریر کا ثبوت ہمیں گاؤں میں کی گئی کارروائی سے ملتا ہے— "ہمیں بہت سی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں ......جن کے ذریعے اندازہ ہوتا تھا کہ آرمی مختلف آپریشنز ایک ہی انداز میں کر رہی تھی یعنی آرمی کسی گاؤں میں داخل ہوتی ہے اور پوچھتی ہے کہ ہندو کہاں رہتے ہیں اور پھر بالغ مرد ہندوؤں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو بچوں اور عورتوں کو قتل نہیں کیا جاتا یا ان کا قتل نہ ہونے کے برابر ہے"۔[۸] آرچر بلڈ مسلمان بنگالیوں کا ہندو بنگالیوں کے خلاف روا رکھے جانے والے سلوک کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

نیتائی گائن — چلنگر سے زندہ بچ جانے والے بالغ ہندو— کا بیان سچائی پر مبنی دکھائی دیتا ہے اس نے مجھ سے کہا۔ کہ "وہ لوگ ہمیں اس لیے قتل نہیں کر رہے تھے کہ ہم ہندو ہیں بلکہ اس لیے کہ ہم ان کے دشمن تھے؛ ہم واپس لوٹ کر آنے کے لیے جا رہے تھے اور ہمیں خالی ہاتھ واپس نہیں آنا تھا"۔

بلڈ اپنے مشاہدے میں لکھتا ہے کہ "......شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی فوج بھارتیوں اور مشرقی پاکستانی ہندوؤں میں تفریق کرنے میں ناکام رہی تھی دونوں ہی کو دشمن گردانا گیا"۔[9] بالفاظ دیگر فوجی حکومت وقت نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ ہندو مذہب کا ہر شخص دشمن سے ملا ہوا علیحدگی پسند ہے اور تمام بالغ ہندو مرد دراصل خطرناک دشمن ثابت ہو سکتے تھے۔

اس دن چلکنگر میں مارے جانے والے ہندوؤں کی صحیح تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ مرنے والوں کا تعلق صرف چلکنگر ہی سے نہ تھا بلکہ ان میں مختلف علاقوں سے آنے والے ہندو بھی شامل تھے کیونکہ ان کے لیے چلکنگر ایک عارضی جائے پناہ تھا۔تاہم مقامی سیاسی رہنماؤں اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے دانشوروں کی جانب سے چلکنگر میں ہونے والے قتل عام کو ۱۹۷۱ء میں کیے گئے قتل عام میں سب سے بڑا قتل عام دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ان کا یہ الزام کہ محض ۲۵ سے ۳۰ پاکستانی فوجیوں نے عام ہتھیاروں کی مدد سے صبح کے گشت کے دوران ۱۰،۰۰۰ ہندوؤں کو قتل کر ڈالا۔تاریخ کے اعتبار سے اس بات کو سمجھنے میں مددگار ثابت نہیں ہوتا کہ یہ قتل عام کیوں کیا گیا۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک جانب تو مختلف دعوؤں میں مرنے والوں کی تعداد میں واضح تضاد پایا جاتا ہے تو دوسری جانب انھی دعوؤں میں مارنے والوں کی تعداد میں اتفاق دیکھنے کو ملتا ہے۔ تمام دعویدار یہی بتاتے ہیں کہ مارنے والے تعداد میں کم تھے، بیس یا پچیس یا اس سے بھی کم۔وہ لوگ چلکنگر میں تین گاڑیوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔اس کے علاوہ اس بات پر بھی اتفاق دیکھنے کو ملتا ہے کہ فوجی اہلکار بہت زیادہ مسلح نہ تھے اور ان کے پاس محض چھوٹے ہتھیار ہی تھے۔اتنی تعداد میں ذاتی اسلحہ لے کر چلنے والے فوجی اگر، مذکورہ حالات میں، کچھ اضافی اسلحہ اور گولیاں ساتھ لے کر چلیں تو بھی ۳۰ فوجیوں کے گروہ کے پاس ۱۲۰۰ سے زائد گولیاں نہیں ہونی چاہئیں۔نہ تو ہر گولی اپنے ٹھیک نشانے پر لگی ہوگی اور نہ ہی گولی لگنے والے ہر فرد کا انتقال ہوا ہوگا۔مثال کے طور پر صرف شائلین جوردار پر ہی تین گولیاں چلائی گئیں جن میں سے دو گولیاں ضائع گئیں اور تیسری اس کے بازو میں جا لگی۔ بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلحہ ختم ہونے سے پہلے حملہ آوروں نے سینکڑوں افراد کو گولیوں کا نشانہ ضرور بنایا ہوگا۔

ایک اور قابل ذکر بات مرنے والوں اور مارنے والوں کی تعداد کے مابین پایا جانے والا تناسب ہے۔اگر تمام بڑے بڑے دعوؤں کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو بھی اس مقام کے طبعی خدوخال کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ۲۰ مئی ۱۹۷۱ء کی صبح دریا کے کنارے اور بازار میں موجود ہندوؤں کی تعداد کئی ہزار میں ہو سکتی تھی۔اچنتیا ساہا جو فائرنگ سے کچھ دیر قبل ہی

چلنگر سے گزرا تھا، اپنے سیاسی جلسوں کے تجربے کی بنیاد پر اندازہ لگاتا ہے کہ اس دن لگ بھگ پانچ ہزار افراد وہاں موجود تھے؛ اور اگر ان لوگوں کو بھی شامل کر لیا جائے جو ذرا دور اس کی نظر میں نہیں آئے تھے تو یہ تعداد اس سے بھی کچھ زائد کہی جاسکتی ہے۔ پناہ گزینوں میں خواتین اور بچوں کا تناسب زیادہ ہوگا۔ اگر ہر تیسرا شخص بالغ مرد مان لیا جائے تو بھی پچیس سے تیس فوجیوں کے مقابلے میں ہزاروں بالغ مرد موجود تھے۔ فوجی ان کے درمیان دو یا تین کے گروپ میں وارد ہوتے تھے اور انہوں نے عورتوں اور بچوں کو چھوڑتے ہوئے صرف بالغ مردوں کا انتخاب کیا تھا۔ اگر مردوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے بھی مزاحمت کی ہوتی تو حملہ آور فوجیوں کو غیر مسلح اور بے بس کیا جاسکتا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بھی مزاحمت نہ کی نیتائی گائن بھی اس بات سے اتفاق کرتا ہے۔ اس نے اپنے کزن رنجیت اور بھتیجے بنوئے کے سوا کسی کو مزاحم نہ پایا کہ جس نے فوجیوں سے بندوقیں چھیننے کی کوشش کی ہو۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ غالباً یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا اور بھگدڑ سی مچ گئی نیز چونکہ تمام لوگ مختلف مقامات سے یہاں آکر اکٹھے ہوئے تھے اس لیے ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہونے کی وجہ سے کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔

سب سے آخر میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ موجودہ شواہد سے یہ پتہ نہیں چل پایا کہ قاتل آخر کار تھے کون؟ میں نے ایسے کئی پاکستان افسران سے گفتگو کی ہے جو مئی ۱۹۷۱ء میں چلنگر کے قریب جیسور۔ کھلنہ کے علاقوں میں تعینات تھے۔ ان افسران میں جیسور کنٹونمنٹ میں ۱۰۷ بریگیڈ کے بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر محمد حیات، 22 فرنٹیئر فورس کے کرنل (میجر) ثمین جان بابر اور ۵۳ فیلڈ رجمنٹ کے لیفٹیننٹ جنرل (لیفٹیننٹ) غلام مصطفیٰ شامل ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی چلنگر کے واقعہ کا ذکر تک نہ سنا تھا۔ میری طرف سے پیش کیے گئے شواہد کو مانتے ہوئے انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ چلنگر میں قتل عام لازماً ہوا ہوگا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ اگر ان کی یونٹوں کی جانب سے نہیں ہوا تھا تو کسی نہ کسی نے تو یہ سب کچھ کیا تھا جو ٹھہرا — جیسور میں موجود تھا۔ یہ مسلح افواج کا کام ہے کہ وہ اس بات کا تعین کریں کہ ایسا کس نے کیا ہوگا۔ انصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے — نہ صرف ان کے لیے جو چلنگر سانحہ سے متاثر ہوئے بلکہ بذات خود آرمی کے مفاد میں بھی ہے۔ کیونکہ محض پچیس سے تیس افراد کی نفری نے جو کچھ کیا اس کی بدنامی کا داغ پوری آرمی بلکہ پوری قوم پر لگا ہوا ہے۔

باب ہفتم:

مارو اور دوڑ جاؤ

سبوتاژ اور سرزنش

"بڑے آپریشنز ہمیشہ بھارت کی جانب سے کیے جاتے ہیں ...... اور پھر وہ اسے مکتی فوج کی "فتح'' کہتے ہیں ۔ہم ناشکرے نہیں ہیں ۔ لیکن یہ جنگ ہماری ہے ،یہ زمین ہماری ہے اور یہ سب کچھ ہم خود ہی کرنا چاہتے ہیں ۔"

— آزادی کے لیے لڑنے والا ایک بنگالی رضا کار،
بنگالی ٹراد برطانوی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے ۔دی گارجین، اگست ۱۹۷۱[1]

"پروپیگنڈہ مشینری کا سخت اور مؤثر استعمال کیا گیا ۔لنگی میں ملبوس اور ہاتھ میں بندوق تھامے مکتی باہنی کا گوریلا دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بن گیا...... خبروں کے بھوکے پریس نے کامیابیوں کے باطل دعووں کو بھی من وعن قبول کرلیا اور ان پر خاص وعام یقین کرنے لگے ۔"

— میجر جنرل لچھمن سنگھ، انڈین آرمی[2]

"مکتی باہنی کو اپنے اہداف حاصل کرنے کے قابل بنانے کے بعد بھارتی یونٹیں بھارتی علاقوں میں واپس چلی گئی......گوکہ کبھی کبھی ایسا کرنا عارضی ثابت ہوتا تھا کیونکہ ،بھارتی فوج کی امیدوں کے برعکس ، جب بھی پاکستانی فوج جوابی حملے کرتی تومکتی باہنی کے عسکریت پسندوں کے قدم اکھڑ جاتے ۔"

War and Secession: Pakistan, سیزن اور روز۔ —
India and the Creation of Bangadesh.[۳]

پیٹر کین ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو شائع ہونے والے Wall Street Journal میں بالکل صحیح تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس مرحلے پر بنگلہ دیش سب سے کمزور — اور غالباً قلیل ترین — انقلابی جنگ کی تاریخ رقم کرتا ہوا نظر آتا ہے''۔ کین مزید لکھتے ہیں کہ ''ایک ماہ سے بھی کم عرصے کے دوران ۵۰،۰۰۰ سے بھی کم کی نفری پر مشتمل ایسی آرمی جسے محدود پیمانے پر فضائیہ کی مدد اور اسلحہ کی ترسیل حاصل تھی ، فی الحال ، پچھتر ملین بھرے بنگالیوں کو قابو کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے''۔ کین اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہیں: ''بہر حال یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بنگلہ دیش کے لیے کی جانے والی جدوجہد ختم ہو چکی۔ لیکن اگر مشرقی پاکستان آزاد ہو بھی گیا تو ہم پچھلے چار ہفتوں میں اچانک شروع ہونے والے گرم انقلاب پر اس کی ساری ذمہ داری نہیں ڈال سکتے۔ آزادی سالوں میں حاصل ہوئی نہ کہ ہفتوں میں؛ جس میں الفاظ سے زیادہ افعال کو عمل دخل حاصل ہوگا۔ اس میں گوریلا طرز کی کارروائیاں کارگر ہوں گی نہ کہ روایتی جنگ اور یہ سب کچھ غالباً عسکریت پسند بائیں بازوؤں کے افراد کی جانب سے ہوگا نہ کہ اعتدال پسندوں کی جانب سے۔ اس کا انحصار بڑی حد تک بھارت پر بھی ہوگا......''[۴]

مئی ۱۹۷۱ء میں فوجی حکام نے غیر ملکی صحافیوں کے ایک چھوٹے سے گروپ کو مشرقی پاکستان جانے کی اجازت دے دی۔ نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہر قسم کی سنگین مسلح مزاحمت دم توڑ چکی ہے''۔[۵] فوجی حکام کی جانب سے عائد سینسر شپ سے بچنے کی غرض سے ایسوسی ایٹڈ پریس کے مارٹ روز ینبلم بنکاک سے لکھتے ہیں کہ پورا صوبہ اس وقت ''عدم فعالیت''[۶] کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ جبکہ دور دور تک جنگ کے ختم ہونے کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ جیسا کہ Financial Times کے ہاروے اسٹاکون رقم طراز ہیں ''......پاکستان اپنے ہاتھوں اپنی ہی تباہی پر تلا ہوا ہے۔ ابھی مزید تشدد کا جنم لینا یقینی دکھائی دیتا ہے''۔[۷]

اگلے کئی ماہ تک حکومت پاکستان بحران کا کوئی سیاسی حل تلاش کرنے میں ناکام رہی اور مشرقی پاکستان میں موجود پاکستان آرمی بنگالی باغیوں کی کارروائیوں سے مسلسل پریشانی کا شکار ہے، ان کارروائیوں میں بھارت کی براہِ راست مداخلت روز بروز بڑھتی چلی گئی اور بالآخر یہ تصادم دو ممالک

کے مابین ایک مکمل جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس باب میں بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑنے والے ''زیرِ زمین'' عسکریت پسندوں کی کارروائیوں اور طویل مزاحمتی جنگ میں پاکستان آرمی کے ردِّعمل پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ایک آرٹسٹ کی تصویر بطور باغی جنگجو

ابوالبرق علوی ایک آرٹسٹ ہے۔ پست قد، دھیمے لہجے اور اچھے اخلاق کا مجسم یہ شخص کسی بھی لحاظ سے مسلح باغی جنگجو دکھائی نہیں دیتا۔ ان تمام خصوصیات کے باوجود ہم اسے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ایک عسکریت پسند کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ وہ ان بہت سے بنگالی نوجوانوں میں سے ایک تھا جنھوں نے بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے جنگ کی ٹھان لی تھی اور اس مقصد کے لیے سرحد پار بھارت بھی گئے تاکہ خود کو ایک باقاعدہ جنگ اور جاسوسی کے لیے تیار کر سکیں۔ میری ملاقات ان سے ان کے گھر پر ڈھاکہ یونیورسٹی کیمپس میں ہوئی جہاں وہ انسٹی ٹیوٹ آف فائن آرٹس میں پروفیسر ہیں۔[۸]

فوجی حکومت کی نظروں میں آ کر موصوف گرفتار بھی ہوئے ___ لیکن گفت و شنید کے ذریعے رہائی پانے میں کامیاب ہو گئے۔ ابوالبرق علوی ان لوگوں میں سے ہے جن سے حالات و واقعات کی اصل صورت کی بابت مکمل آگہی مل سکتی ہے کہ زیرِ زمین گوریلا جنگ اور اس کے مقاصد کیا تھے، انھوں نے کہاں تربیت حاصل کی، ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کہانی کیا تھی اور قید و بند میں انھوں نے کیا کیا صعوبتیں جھیلیں۔

ابوالبرق علوی نے مجھے بتایا کہ ۱۹۷۱ء سے قبل وہ کبھی بھی سیاست میں متحرک نہ تھا البتہ عام نوجوانوں کی طرح وہ بھی حالات و واقعات کی رو میں بہہ کر بائیں بازو کے سیاسی نظریات سے متاثر ہو گیا تھا۔ انھوں نے پوسٹر اور پمفلٹ بھی بنائے۔ وہ فلم اور اشاعت کے محکمہ میں ملازم تھے۔ مئی ۱۹۷۱ء میں انھوں نے کومیلا کے راستے سرحد پار کر کے بھارت میں قدم رکھا اور آخرکار بھارت کی ریاست تری پورہ میں واقع میلا گھر ٹریننگ کیمپ میں تربیت حاصل کی۔

علوی بھارت سے چوتھی مرتبہ مشن پر ڈھاکہ آتے ہوئے گرفتار ہو گئے۔ شروع شروع میں وہ معلومات اور نقشے اور پناہ گزینوں کے لیے جمع کیے گئے ''چندے'' وصول کرنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ لیکن اگست ۱۹۷۱ء میں وہ اپنے گروپ کے ساتھ خود ان کے مطابق ''بڑی تعداد میں اسلحہ'' کے ساتھ آئے تھے۔ ان کے ساتھ تین دیگر افراد بھی تھے ___ بکر، فتح علی اور کمال۔ بکر گروپ لیڈر تھا۔ ان کے پاس پانچ عدد ایس ایل آر (سیلف لوڈنگ رائفلیں) اتنی ہی تعداد میں اسٹین گنیں،

دس عدد دستی بم پانچ یا چھ بکس گولیاں اور بڑی مقدار میں دھماکہ خیز مواد موجود تھا۔

منصوبے کے مطابق انھیں پہلے ہی سے طے شدہ ایک مقام پر ملاقات کے لیے اکٹھے ہونا تھا اور اس مقام پر منصوبے کے اگلے مرحلے پر غور وخوض کرنا تھا۔ تاہم جب گروپ لیڈر بکر منصوبے کے مطابق مطلوبہ جگہ نہ پہنچ سکا، تو علوی نے واپس میلا گھر جانے کا ارادہ کیا۔ ڈھاکہ کے ایک مشہور میوزک ڈائریکٹر الطاف محمود نے علوی سے کہا کہ وہ اس کے ایک دوست کو بھی بھارت لے جائیں۔ اس لیے 29 اگست کو علوی، محمود کے گھر اس سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے چلے گئے۔ وہاں کچھ دیر ہوگئی۔ محمود کا گھر راجر باغ پولیس لائنز کے بالمقابل تھا۔ علوی کو اس رات فتح علی کے پاس جانا تھا لیکن محمود اور اس کے گھر والوں کا اصرار تھا کہ علوی اتنی رات گئے وہاں سے روانہ نہ ہو۔ اس لیے علوی وہیں ٹھہر گئے۔

الطاف محمود ایک بہت ہی مشہور بنگالی گانے ''امار بھایر روکتے رنگانو ایکوشے فیروری، امی کی بھولیتے پری'' کے کمپوزر تھے جو مشرقی پاکستان میں زبان کی بنیاد پر بغاوت کی تحریک کے یوم آغاز یعنی 21 فروری کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ ان کی اہلیہ، سارہ آرا محمود لکھتی ہیں کہ محمود ''فری بنگال ریڈیو اسٹیشن'' کے لیے کام کیا کرتے تھے۔ آزادی کے لیے لڑنے والے جنگجو ان کے پاس آیا کرتے تھے اور ان کے گھر میں بہت سا اسلحہ مدفون تھا۔[۹] جس انداز سے خیالوں کی دنیا میں رہنے والے یہ رضا کار آزادی کی تحریک کو چلا رہے تھے اس سے ان کی حد درجہ سادہ لوحی ظاہر ہوتی ہے کہ خفیہ ریڈیو میں کام کرنے والے محمود کے اس گھر میں جہاں باغی جنگجو نہ صرف ڈیرے ڈالتے ہیں بلکہ اپنا اسلحہ بھی ذخیرہ کرتے ہیں اور پھر اسی گھر میں رہائش بھی اختیار کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک دن انھیں ایک دستک سنائی دیتی ہے۔

یہ دستک ۳۰-۲۹ اگست کے دن اس وقت ہوئی جب ابوالبرق علوی ان کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا — فوجیوں نے گھر کا محاصرہ کرکے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ الطاف محمود نے بذات خود دروازہ کھولا — دروازہ کھلتے ہی فوجی اندر گھس آئے۔ انھوں نے باقاعدہ ''الطاف محمود، میوزک ڈائریکٹر'' کہہ کر انھیں مخاطب کیا۔ تمام لوگوں کو باہر جمع کرکے ہر کمرے کی تلاشی لی گئی۔ پھر وہ فوجی گاڑی میں بیٹھے ایک اور شخص کو لے کر آئے (جسے علوی کے مطابق دیگر لوگوں نے صمد کے نام سے شناخت کیا)، اس شخص اور محمود کو فوجی گھر کے پچھواڑے میں لے گئے اور وہاں سے اسلحے سے بھرا ہوا ایک صندوق برآمد کیا گیا۔ بے شک یہ بات اندر کے ہی بندے نے ان تک پہنچائی تھی۔ علوی کے گھر میں موجود تمام آدمیوں — علوی، محمود، اس کے چار بہنویوں، دیگر دو

افراد پڑوس سے اور تین آدمی جو اوپر والے فلیٹ میں رہتے تھے، کو آرمی والے ایم پی ہاسٹل ائیر پورٹ روڈ لے گئے جہاں مارشل لاء کورٹ قائم کیا گیا تھا۔! علوی کے مطابق تمام افراد پر تشدد کیا گیا۔ یہ تشدد چھاپے کے دوران اور ہاسٹل پہنچنے پر کیا گیا۔

انھیں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا، جہاں علوی کی ملاقات چند دیگر افراد سے ہوئی جنھیں وہ جانتا تھا۔ ان میں اس کے بچپن کا دوست جیول (ایک ہندو کھلاڑی)، رومی (جہاں آراء امام کا بیٹا)، چلو (اس پر الزامات لگائے گئے لیکن اسے قتل نہ کیا گیا)، ولایت اور آزاد وغیرہ شامل تھے۔ اس نے ان سب کو وہاں اپنے قیام کے دوران پہچانا۔ یہاں باغیوں کے بہت سے مرد رشتے دار بھی موجود تھے، جو ان کے ساتھ اس جال میں پھنس گئے تھے۔!! ان لوگوں کو فرداً فرداً برابر والے کمرے میں تفتیش کے لیے بلایا جاتا تھا۔ کبھی کبھار دروازہ ادھ کھلا بھی رہ جاتا تھا اور زیرِ تشدد قیدیوں کی درد بھری چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

علوی کہتے ہیں کہ تشدد اتنا شدید ہوا کرتا تھا کہ جو کوئی جو کچھ بھی جانتا تھا اسے بتانا ہی پڑتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اور دیگر ذرائع سے تصدیق ہوتی ہے کہ حکام نے باغیوں کے پورے گروپ کو گرفتار کر لیا تھا اور وہ ان کی سرگرمیوں کے بارے میں باخبر تھے۔ لیکن تمام لوگوں نے تشدد کے وجہ سے زبان نہ کھولی تھی۔ میوزک ڈائریکٹر الطاف محمود بھی ان میں سے ایک تھا جنھوں نے زبان بند رکھی تھی۔ علوی نے صرف اسے اتنا کہتے سنا تھا کہ اس نے ایک دوست کے کہنے پر اسلحے سے بھرا صندوق گھر میں رکھا تھا۔ اسے خون میں لت پت واپس لایا گیا۔

ایک موقع پر گارڈ نے ''علوی'' کا نام پکارا۔ اس سے علوی کو بہت حیرت ہوئی کیونکہ اسے تو محض محمود کے گھر سے اٹھایا گیا تھا اور اس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ کسی نہ کسی نے یقیناً تفتیش کاروں سے اس کے بارے میں مخبری کی تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ بھارت سے کب آیا، اس کے ساتھ اور کون کون تھا، وہ کون کون سا اسلحہ ساتھ لایا تھا، اور وہ اسلحہ اس نے کہاں چھپایا تھا؟ — علوی نے جواب دیا کہ وہ کبھی بھی بھارت نہیں گیا۔ اسے مارا گیا لیکن وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ اس کے تفتیش کار نے گارڈز کو بکر کو اندر لانے کو کہا اور فہرست علوی کے سامنے جھٹک دی جس پر اس کے ساتھ آنے والے افراد کے نام اور اسلحے کی تفصیلات درج تھیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی پہلے ہی گرفتار ہو چکا تھا اور اس نے سب کچھ اگل دیا تھا۔ لیکن علوی اس سارے معاملے سے اپنی لاتعلقی پر اصرار کرتا رہا۔ بکر کو اندر لایا گیا— تفتیش کے اس موڑ پر بکر کو اندر لانے کا مقصد اب سمجھ میں آیا۔ اسے بلوا کر علوی کی شناخت کروائی گئی جو اس نے ہاں میں سر ہلا کر کی۔

ہماری گفتگو کے دوران اس موڑ پر ابولبرق علوی کی آواز بہت دھیمی پڑ گئی — اور وہ کہنے لگا کہ مجھے بکر پر ذرا غصہ نہ آیا کہ اس نے سب کچھ کیوں اُگل دیا تھا، وہ بے چارا تشدد برداشت نہ کر سکا ہوگا۔ علوی کی جانب سے کسی ایسے شخص کے لیے اس سے بڑھ کر فیاضی کی مثال نہیں مل سکتی جس نے اسے شناخت کرکے اس کی موت کے پروانے پر تقریباً دستخط بھی کر ڈالے تھے۔ علوی کی پھر کبھی بکر سے ملاقات نہ ہوئی۔

سب کچھ برباد ہوتا دکھائی دے رہا تھا، لیکن علوی اپنے انکار پر مصر تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے بکر کو اپنی زندگی میں کبھی دیکھا ہی نہیں، یا تو بکر کو غلط فہمی ہورہی ہے یا پھر اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اس قسم کا بیان دے دیا ہے۔ اس بات پر اسے مزید تشدد کا نشانہ بنایا گیا، انعامات کا لالچ دیا گیا اور موت کی دھمکی بھی۔ جب کوئی بھی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تو غصے کے عالم میں اس فوجی افسر نے کاغذ کا وہ ٹکڑا ہاتھوں میں مسل کر ایک کونے میں پھینک دیا۔ اس کے بعد علوی کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ علوی بتاتے ہیں کہ اس تشدد کے بعد ان کی حالت ناقابلِ بیان ہو چکی تھی۔ الفاظ میں صرف اتنا ہی بتایا جاسکتا ہے کہ وہ خون میں لت پت تھا، اور اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کے جبڑے اور تمام انگلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس تمام عرصے کے دوران کسی کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا گیا ماسوائے اس کے کہ ایک ادھیڑ عمر کا فوجی — جو علوی کے مطابق ''صوبیدار میجر'' دکھائی دیتا تھا، چھپ چھپا کر ان کے لیے روٹی کے کچھ ٹکڑے اور کچھ گڑ لے آیا تھا۔ علوی کو گمان ہوا کہ وہ شخص ''بلوچ'' تھا۔[۱۲]

بعدازاں تمام قیدیوں کو ایک بس میں بٹھا کر رمنا پولیس اسٹیشن لے جایا گیا۔[۱۳] وہاں اس نے اپنا نام ''سید ابوالبرق'' رجسٹر کروایا اور ''علوی'' کا لفظ حذف کر دیا۔ دیگر قیدیوں نے نئے آنے والے قیدیوں کی خاطر تواضع ادویات اور کھانے سے کی۔ بعد میں اس نے الطاف محمود اور دیگر افراد کے ساتھ اس صورتحال پر تبادلۂ خیال کیا کہ اسے الطاف محمود کے تمام رشتہ داروں کے نام یاد کر لینے چاہئیں تاکہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ الطاف محمود کا رشتہ دار ہے اور ان سے ملنے کے لیے آیا تھا کہ گرفتار ہو گیا۔

اگلے دن پھر انھیں ایم پی ہاسٹل میں واپس لایا گیا، لیکن اس مرتبہ عمارت مختلف تھی۔ رپورٹس کے مطابق تمام لوگوں کو ایک کمرے میں بلوایا جارہا تھا۔ الطاف محمود کے تمام گھر والوں کو ایک ساتھ بلوایا گیا۔ چونکہ ''سید ابوالبرق'' کے نام سے کوئی فائل موجود ہی نہ تھی اس لے علوی کو نہیں بلوایا گیا۔ موقع پاتے ہی علوی نے کسی سے پوچھا کہ اسے کیوں نہیں بلایا گیا تو اس سے اس کا نام پوچھا گیا۔

اس نے اپنا نام سید ابوالبرق بتایا۔ اس سے پوچھا گیا کہ وہ وہاں کیسے پہنچا تو اس نے کہا کہ وہ الطاف محمود کا رشتہ دار ہے اور گرفتاری والے دن ان کے گھر والوں سے ملنے آیا تھا کہ دھر لیا گیا۔ اب علوی سے محمود اور اس کے گھر والوں سمیت تفتیش کی گئی ۔ اس مرتبہ تفتیش کار مختلف تھے اور سنیئر افسران معلوم ہوتے تھے ۔ کچھ لوگوں کو علوی سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی، کیونکہ وہ نوعمر اور چھوٹا دکھائی دیتا تھا اور اسے بہت مارا پیٹا بھی گیا تھا۔ انھوں نے علوی سے چند باغیوں کے نام پوچھے جو اسی کے عمر کے تھے۔ لیکن علوی نے بتایا کہ وہ سارا دن کام کرتا ہے اور اسے نہیں معلوم کہ کون باغی ہے اور کون نہیں۔ اس سے اس کے دفتر کا فون نمبر مانگا گیا جو اس نے دے دیا اور انھیں بتایا کہ کسی سے بھی بات کر کے پتا کر لیں، وہ انھیں اس کی حاضری کے بارے میں بتادیں گے ۔ ابھی علوی کو یہ گمان ہوا ہی تھا کہ اس کی ترکیب کام کر گئی کہ وہ فوجی اندر آ گیا جس کے سامنے گزشتہ روز بکر نے علوی کی شناخت کی تھی ۔ یہ وہی فوجی تھا جس نے خفیہ طور پر کھانا بھی پہنچایا تھا۔ علوی کو یوں محسوس ہوا کہ سب کیے کرائے پر پانی پھر گیا ہو لیکن وہ فوجی خاموش رہا۔

علوی سے قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر یہ قسم کھانے کو کہا گیا کہ وہ کبھی بھی بھارت نہیں گیا تھا اور نہ ہی کسی باغی کو جانتا تھا — علوی نے دل ہی دل میں خدا سے معافی مانگتے ہوئے یہ جھوٹی قسم کھالی ۔ ۳۱ اگست کی شام کو الطاف محمود کے سوا سب افراد رہا کر دیئے گئے — اور اس دن کے بعد الطاف محمود کا کچھ پتہ نہ چلا۔ جس فوجی نے علوی کی پہچان ظاہر نہ کرنے میں مدد کی تھی وہ اسے دروازے کے باہر ملا اور اس کی کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بولا جاؤ کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کراؤ۔

رومان کی موت

پہلی مرتبہ رومی کا نام میں نے امریکہ میں اس کے دوست ظفر احمد سے سنا جس نے مجھے ایکاٹور ر ڈِنگُلی (۱۹۷۱ کے وہ دن) پڑھنے کا مشورہ دیا۔ یہ ایک کتاب کا نام ہے جسے رومی کی والدہ جہاں آراء امام نے تحریر کیا۔ میں نے پوری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ ڈائری کی طرز پر لکھی گئی یہ کتاب ۱۹۷۱ء کے واقعات کو متاثر کن انداز میں بیان کرتی ہے۔[۱۴] کتاب میں یکم مارچ سے ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کے واقعات کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ تحریر کے آغاز میں جہاں آراء کا خاندان اس کے شوہر شریف، سسر اور دو بیٹوں — رومی اور جامی پر مشتمل تھا۔ لیکن کہانی کے اختتام تک رومی ۱۹۷۱ء کے ان لاپتہ افراد میں شامل ہو چکا تھا جن کا کبھی پتہ نہ چلا۔ وہ ۲۹ اگست کو گرفتار ہوا تھا۔ شریف امام بنگلہ دیش کی آزادی سے صرف تین دن قبل دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

رومی کی کہانی ایک کلاسیکی المناک بنگالی رومانوی داستان ہے ۔اس کہانی میں ان روایتی کہانیوں کے ساتھ مماثلت پائی جاتی ہے جن میں پرعزم انقلابی نوجوان خفیہ طور پر برطانوی سامراج کے خلاف متحرک نظر آتے ہیں۔ کلکتہ میں زندگی کے دن گزارتے ہوئے مجھے ایسے کئی باغی نوجوانوں کے متعلق کہانیاں پڑھنے کو ملا کرتی تھیں۔ جہاں آراء اپنے بیٹے اور اس کے دیگر باغی دوستوں کو ''بچوز'' کہہ کر پکارتی ہے — یہ بنگالی زبان میں بچوں کو پیار سے پکارنے کی غرض سے استعمال کی جانے والی ایسی اصطلاح ہے جس کا ترجمہ کرنا ناممکن ہے، اگر اس لفظ کا ڈھیلا ڈھالا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جائے تو ''چھوٹا بدمعاش'' کہہ سکتے ہیں ۔جہاں آراء امام کے مطابق ''بچوز'' نے مارچ کے ابتدائی دنوں سے ہی گھر میں بارودی مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا، پھر وہ ''جنگ کی تیاری'' کے لیے منظر عام سے غائب ہو گئے اور بعد میں بم دھماکوں اور فائرنگ کے ساتھ کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر وارد ہوا کرتے تھے ۔ان کے حملے دشمن کو ہراساں کرنے کے ضمن میں نہ ختم ہونے والے ایک سلسلے کی کڑی تھے۔ کئی بنگالی تحریروں میں ہمیں ایسے ''بنگال کے ناقابل تسخیر'' اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ''لڑاکا'' لڑکوں کا ذکر ملتا ہے ۔ہمیں برطانوی سامراج کے خلاف برسرپیکار رہنے والے انقلابیوں کے لیے بھی یہی اصطلاحات پڑھنے کو ملتی ہیں جس میں ان ہیروز کی جانب سے کی جانے والے غیر معمولی کارروائیوں اور پھر ان کی المناک موت کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں آراء کی ڈائری میں ایک اندراج ایسا بھی ملتا ہے جب رومی بھارتی سرحد عبور کرنے کی ایک ناکام کوشش کے لیے جا رہا تھا اور جہاں آراء رات گئے اس کے بالوں کو اپنے ہاتھوں سے سہلاتی ہے اور رومی ۱۹۰۸ء میں برطانوی حکومت کی جانب سے پھانسی پر لٹکائے جانے والے پہلے قوم پرست بنگالی عسکریت پسند خدی رام بوس کا نغمہ ''اک بار بی دے داؤ ما، گھورے آشی'' گنگناتا ہے۔

درحقیقت کئی ناکام کوششوں کے بعد بالآخر ۱۴ جون کو رومی بھارتی سرحد عبور کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رومی کی والدہ کے مطابق اس نے اگرتلہ کے نزدیک باغی افسر میجر خالد مشرف کی رفاقت حاصل کر لی تھی اور تری پورہ کی ریاست میں اس نے بطور ''گوریلا'' تربیت حاصل کی۔ جولائی کے مہینے میں خالد مشرف کی جانب سے ایک پیغام آیا کہ اسے صوبے میں موجود تمام پلوں اور نالوں سے متعلق معلومات درکار تھیں۔ رومی کا والد شریف امام روڈ اینڈ ہائی ویز ڈویژن کے ڈیٹا سے یہ معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ میلا گھر میں زیر تربیت دیگر جوان بھی آتے جاتے رہتے تھے جن سے رومی کا حال احوال بھی معلوم ہو جاتا تھا۔

رومی ۸ اگست کو گھر واپس آ گیا۔ وہ میلا گھر کے شب و روز کی باتیں کیا کرتا تھا۔ رومی ''کیپٹن

حیدر" کی زیرنگرانی تربیت حاصل کررہا تھااور اسے اس کے گروپ کے ساتھ ایک مخصوص ٹارگٹ کے لیے ڈھاکہ بھیجا گیا تھا۔حیدر نے جنرل مٹھا کی جانب سے قائم کیے جانے والے ایس ایس جی گروپ میں تربیت حاصل کی تھی۔ بظاہر اس قسم کے "گوریلوں" کے نوگروپ ڈھاکہ میں موجود تھے۔ ان تمام امور کی نگرانی بھارتی فوجی افسران کے ذمہ تھی ۔ اس کی والدہ لکھتی ہیں کہ رومی کو ہمیشہ سے "گوریلا" بننے کا شوق تھا—ایک مرتبہ تو اس نے فلسطین لبریشن تنظیم میں شمولیت کی خواہش بھی ظاہر کی تھی!

آنے والے دنوں میں، رومی اکثر باہر رہتا، اب تک اس نے شہر میں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔اس کی والدہ نے اس کے کئی باغی ساتھیوں— قاضی، عالم، بودی، سواپن اور چلو— سے ملاقات کی تھی کیونکہ وہ اس کے گھر پر اکٹھا ہوتے تھے اور رومی کی والدہ ان سب کے لیے کھانا تیار کرتی تھی۔اسے یہ معلوم ہوا کہ ان کا ٹاسک سدھیر گنج پاور اسٹیشن تباہ کرنا ہے — لیکن وہاں کی سیکیورٹی بہت سخت ہے۔ان کے گروپ لیڈر قاضی اور گروپ کے باقی ممبران کے پاس اس مقصد کے لیے وافر اسلحہ تھا، اس میں راکٹ لانچر بھی شامل تھے ۔ ایک دن علاقے کا معائنہ کرنے وہ لوگ دو کشتیوں میں سوار ہوکر گئے۔جس کشتی میں قاضی، بودی اور جیول سوار تھے اس کا ٹاکرا ایک فوجی کشتی سے ہوگیا۔ مقابلے کے دوران جیول کی انگلی زخمی ہوگی۔ فائرنگ اور دستی بم حملوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات معمول بن گئے تھے جو بغیر منصوبہ بندی کے موقع دیکھ کر کیے جاتے تھے۔تا کہ خوف وہراس کی فضا قائم رہے۔

بالآخر ۲۵ اگست کو رومی نے ایسے ہی ایک حملے میں حصہ لیا۔ یہ اس کی پہلی اور آخری کارروائی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ گھر آیا تو بہت پرجوش تھا وہ اپنی والدہ کے ساتھ وہ ہتھیار اٹھانے گیا جو انھوں نے ایک گلی میں چھوڑ دیے تھے۔امام کی تحریر کے مطابق، رومی اور اس کے دوستوں نے دو گاڑیاں "اغوا" کیں اور گلی نمبر ۲۰ دھان منڈی میں واقع چینی سفارتکار کے گھر پہرے پر مامور پولیس والوں پر فائرنگ کرتے گئے، لیکن اس شام وہاں پہرے دار نہیں تھے۔تو اس کے بجائے انھوں نے گلی نمبر ۱۸ کے ایک مکان پر پہرہ دینے والے پولیس والوں پر فائرنگ کردی۔ قاضی، بودی اور سلیم نے فائرنگ کی، جبکہ رومی اور سواپن کو صرف جوابی کارروائی کی صورت میں فائرنگ کرنی تھی لیکن اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ واپسی پر وہ ایک چیک پوسٹ میں گھس گئے اور سواپن اور بودی نے دو اور ملٹری پولیس والوں کو گولیاں ماردیں۔ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے انھوں نے محسوس کیا کہ ایک جیپ ان کا پیچھا کررہی ہے۔

با لآخر رومی نے کارروائی کی — اس نے کار کا پچھلا شیشہ توڑا اور جیپ پر فائر کھول دیا سواپن اور بودی نے بھی اس کارروائی میں اس کا ساتھ دیا؛ جیپ ایک کھمبے سے ٹکرا کر الٹ گئی۔

امام کی ڈائری میں اس بہادری کے کارنامے کے بارے میں کئی دن تک اندراجات ملتے ہیں۔ رومی گھر پر مختلف کھیلوں ۔اور ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ اور دعوتوں میں وقت گزارتا رہا۔ ۲۹ اگست کو وہی منظر تھا۔ ماں بیٹے کے بال سہلا رہی تھی اور ریڈیو پر خودی رام بوس کا نغمہ چل رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آرمی نے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک کیپٹن جو امام کے مطابق کالج کا طالب علم لگتا تھا اپنے ادھیڑ عمر بہاری صوبیدار کے ساتھ گھر کی تلاشی لینے لگا اور تفتیش کی غرض سے گھر کے تمام مردوں کو ساتھ لے گیا۔

اگلے دن جہاں آرا امام نے کیپٹن اور صوبیدار کو کئی مرتبہ فون کیا کہ ان کے شوہر اور بیٹوں کی خیریت معلوم ہو جائے، لیکن یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ شام کے وقت اچانک اس کا رابطہ اس ادھیڑ عمر افسر سے ہوا تو اس نے جہاں آراء سے شائستہ لہجے میں کہا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں تفتیش میں ذرا دیر لگ سکتی ہے۔ جب جہاں آراء نے اپنے شوہر اور بیٹوں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ذرا توقف کے بعد افسر نے اس کے چھوٹے بیٹے جامی کو فون تھما دیا۔ ماں کو پتہ لگا کہ انھوں نے سارا دن کچھ نہیں کھایا ہے تو اس نے صوبیدار سے درخواست کی کہ ان سے پیسے لے کر انھیں کچھ کھانا لا دے۔ اگلے دن جہاں آراء تفتیشی مرکز ایم پی ہاسٹل پہنچ گئی۔ وہ اپنے ساتھ صاف ستھرے کپڑے اور سینڈوچ لائی تھی۔ انھوں نے صوبیدار کو تلاش کیا اور اسے پکڑ لیا اور کہا اپنے گھر والوں سے مل کر ہی جائیں گی۔ صوبیدار کو یہ سب بہت عجیب سا لگا۔ بہر حال وہ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک افسر موجود تھے اور اس افسر سے بات کی — اس افسر نے بتایا کہ اس کے گھر والے وہاں موجود نہیں ہیں بلکہ انھیں کینٹ بھیج دیا گیا ہے اور جہاں آراء کو گھر واپس جانے کا مشورہ دیا۔ جہاں آراء نے کپڑے اور سینڈوچ دیتے ہوئے درخواست کی کہ یہ چیزیں ان تک پہنچا دی جائیں — وہ بے بس لگ رہا تھا لیکن اس نے وہ چیزیں لے کر رکھ لیں۔

کچھ دیر کے بعد ماسوائے رومی کے تمام لوگ واپس گھر لوٹ آئے۔ ان لوگوں کو کینٹ لے جایا ہی نہیں گیا تھا۔ ان کے مطابق رومی کی شناخت مین روڈ پر ایک اور گاڑی میں موجود شخص کے ذریعے سے کروائی گئی تھی اور اسے ایک الگ افسر ایک مختلف گاڑی میں ساتھ لے گیا اور جب انھیں ایم پی ہاسٹل لایا گیا تو ایک مرتبہ پھر ان کی شناخت کروائی گئی۔ باقی تمام لوگوں سے بھی تفتیش کی گئی اور دوران تفتیش ان پر تشدد بھی کیا گیا اور آخری مرحلے پر ہر شخص کو ائر پورٹ روڈ پر واقع

تفتیشی سینٹر میں ایک کرنل صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ اس کے بعد ان سب کو ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا جہاں ان کی ملاقات ایک دوسرے سے ہوئی۔۔ بودی، چلو، الطاف محمود اور اس کے تمام رشتہ دار، علوی، جیول اور دیگر افراد۔

ظاہر ہوتا تھا کہ ٹھوس خفیہ معلومات کی بنیاد پر آرمی نے یہ گرفتاریاں نو یا دس گھروں سے کی تھیں اور ماسوائے قاضی کے سب کو گرفتار کر لیا تھا۔ قاضی کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ جب رومی کو اس چھوٹے سے کمرے میں لایا گیا تو اس نے بتایا کہ تفتیش کار کو ہر بات پورے وثوق کے ساتھ معلوم تھی کہ کس کس نے کیا کیا کیا۔ کون کون شخص کس کس گاڑی میں سوار تھا اور اس نے کتنے افراد کو قتل کیا۔ اس لیے اس کی تجویز یہ تھی کہ وہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو قبول کر لے گا اور اس کے گھر والے اس کی سرگرمیوں سے لاعلمی کا اظہار کر دیں۔ الطاف محمود نے بھی اپنے گھر والوں سے یہی کچھ کہا۔ جامی نے بتایا کہ جہاں آراء سے پیسے لے کر صوبیدار ان کے لیے کچھ روٹیاں اور کباب لے آیا تھا۔[۱۵] رومی کو اس رات باقی افراد کے ساتھ رمنا پولیس اسٹیشن نہیں لے جایا گیا تھا۔۔ اسے اس دن کے بعد پھر کبھی کسی نے نہ دیکھا۔

رومانس کی موت:

رومی نے پہلی اور آخری کارروائی ۲۵ اگست کو کی اور ۲۹ اگست کو اسے اس کے رشتہ داروں اور ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ مختلف بنگالی تحریروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آرمی نے اس رات کئی گھروں میں چھاپے مارے تھے۔ ان میں الطاف محمود، شریف اور جہاں آراء کے گھر بھی شامل ہیں۔ یہ چھاپے انتہائی ٹھوس اور مربوط شواہد کی بنیاد پر مارے گئے تھے۔ تفتیش کاروں کو مطلوبہ افراد کے نام اور سرگرمیوں کا مکمل علم تھا کہ کون کب بھارت سے، کتنا اور کیا اسلحہ لے کر آیا اور کہاں چھپا ہوا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مخبر یا تو خود باغیوں کے درمیان موجود تھے یا ان کے بہت قریب تھے۔ امام کی کتاب اور سارہ آراء محمود کی ماضی کی یادوں میں ہمیں اس دھوکے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

تاہم ڈھاکہ کے باغیوں سے متعلق جہاں آراء کی کتاب کئی سوالوں کو جنم دیتی ہے۔ اولاً تو ہمیں رومی اور اس کے ساتھی باغیوں کا ذکر بہت ہی شاندار الفاظ میں ملتا ہے کہ انھوں نے ڈھاکہ کے مرکز میں کئی پولیس والوں کو نشانہ بنایا اور پھر زندہ سلامت گھر لوٹ آئے اور بڑے ہی پرجوش انداز میں کھانے کے دوران ''اپنی کارروائی'' پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ ان تمام کارروائیوں کے دوران

انھوں نے اپنے گھر پر قیام کر کے نہ صرف اپنی گرفتاری کو آسان بنا دیا بلکہ گھر میں موجود باقی تمام افراد کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ ان بیوقوفیوں اور غیر پیشہ وارانہ رویے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ''گوریلا'' تربیت حاصل کی ہی نہیں تھی۔

اس سے بھی زیادہ اہم سوال جو ہمارے سامنے سر اٹھاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا رومی اور اس کے ساتھی جس انداز سے زندگی گزار رہے تھے انھیں ایسی ''کارروائیاں'' کرنا زیب دیتا تھا؟ گو کہ ہم جہاں آراء اور دیگر ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے دکھ درد کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا رومی کے لیے یہ جائز تھا کہ پولیس کی ایک جیپ کو الٹا دیتا یا کسی کے گھر کے دروازے پر کھڑے مٹھی بھر گارڈز کو مار ڈالتا؟ کیا کسی اہم شخصیت کی معاونت کرتے ہوئے رومی کی موت زیادہ کارآمد نہ ہوگی؟ جو کچھ اس نے کیا وہ سب کچھ کس طرح بنگلہ دیش کی آزادی میں سنگ میل ثابت ہو سکتا تھا؟

بہت سے بنگلہ دیشیوں نے مجھے بتایا کہ ان دنوں چھوٹی سے چھوٹی سرکاری تنصیبات کو نشانہ بنانے سے بھی ان کو جلا ملتی تھی۔ لیکن مسئلہ یہ ہے خودی رام بوس کی شہادت سے لے کر اب تک بنگالی سیاست میں موجود مربوط پر تشدد ''انقلابی'' رویے اور کسی کی جانب سے کی جانے والی ''انفرادی'' دہشت گردی آپس میں گڈمڈ نظر آتی ہیں—جہاں آراء بھی خودی رام بوس کے واقعے کو یاد کرتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے رومی کو خراج تحسین پیش کرتی ہیں۔ خودی رام بوس ایک برطانوی جج کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن غلطی کر گیا۔ بنگالی ''انقلابی دہشت گردی'' کی اس لڑی کے پہلے شہید اور قوم پرست کو دو معصوم برطانوی خواتین کے قتل کے الزام میں پھانسی لگا دی گئی۔

بنگلہ دیش کی آزادی میں خودی رام بوس کی کہانی سے توانائی حاصل کرنے میں ایک اور قباحت نظر آتی ہے۔ لبریشن وار میوزیم، ڈھاکہ میں برطانوی دور کے بنگالی انقلابی ''شہیدوں'' کی ایک فہرست آویزاں ہے؛ اس فہرست میں خودی رام بوس کا نام سب سے اوپر درج ہے۔ تمام نام ہندوؤں کے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلم نوجوانوں میں حب الوطنی کا جذبہ موجود نہ تھا، لیکن اس سے زیر زمین جاری رہنے والی اس تحریک کا کردار سامنے آتا ہے۔ تاریخ دان لیونارڈ گورڈن لکھتے ہیں ''...... بنگال میں انقلابی کارکنوں کو آبادی کے ایک خاص حصے میں لیا گیا تھا۔ تقریباً تمام افراد اعلیٰ ہندو طبقات کی نمائندگی کرتے تھے اور نچلی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان میں شامل ہی نہ کیا گیا...... ہندو علامتیں، ہندو فرقوں اور عقائد سے ماخوذ رواج اور بالخصوص مادر وطن اور دیوی ماں جیسے تصورات کو مربوط کر کے پیش کرنا...... جیسے اقدامات وہ اسباب تھے جن کی بنیاد پر مسلمان ان امور سے دور رہے''۔ لیکن اگر دوسرے حوالے سے دیکھا جائے تو ١٩٧١ء کے باغی بنگالی خفیہ

عسکریت پسندی کی روایت کا حصہ نظر آتے ہیں: ''انقلابی عموماً خواہش اور جذبے کے تحت کسی منصوبہ بندی کے بغیر متحرک ہوتے تھے اور ان کے مدنظر محض قلیل المدتی اہداف تھے۔ ہندوستان کی آزادی اور مخصوص پر تشدد سرگرمیوں کے مابین ایک مبہم سا تعلق موجود تھا''۔[۱۶]

بنگلہ دیش کی تحریک میں رومی کا مقام بطور ہیرو اس کے اپنے کارناموں کے بجائے اس کی جذباتی اور مشتعل ماں کے متاثر کن خراج تحسین کا مرہون منت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس خراج تحسین نے ان لوگوں کی کاوشوں کو بھی پس پشت ڈال دیا جو بعد میں زیادہ عرصے تک زندہ رہے اور عملاً کامیاب بھی رہے۔ سدھیر گنج پاور اسٹیشن کو نومبر میں دیگر باغیوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ بموں سے اڑا دیا تھا۔ بہر حال رومی کی حیثیت تاریخ میں ایک علامت کی سی ہے جنھوں نے ۱۹۷۱ء میں خود کو تحریک کے لیے وقف کر دیا تھا، اور بطور ''گوریلا'' وطن کی آزادی کی خاطر لڑنا چاہتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت شاطر نہ ہوں لیکن ایک چیز پر ان کا پختہ یقین تھا کہ ان کا مقصد بہت ہی اعلیٰ و ارفع تھا اور ان کے مقصد کی حیثیت تمام انفرادی حیثیتوں سے بڑھ کر تھی۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان کے مدمقابل بھی ایک ''اعلیٰ'' مقصد کے لیے برسر پیکار تھے — وہ لوگ اپنے ملک کی سلامتی اور بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسا ہمیشہ سے ہی ہوتا آ رہا ہے کہ ایک شخص کا حریت پسند دوسرے کے لیے دہشت گرد ہوا کرتا ہے۔ اگر رومی دروازے پر کھڑے محافظوں کو ''دشمن'' جان کر مارنے میں حق بجانب تھا تو دوسری جانب کیا وہ لوگ ان ''عسکریت پسندوں'' کو مارنے میں حق بجانب نہ تھے جو ان کے وطن کو ٹکڑے کرنے کے درپے تھے؟

عقوبت خانوں میں تشدد بے شک قابل مذمت ہے لیکن اس کی جھلک پورے جنوبی ایشیاء میں دیکھنے کو ملتی ہے اور ۱۹۷۱ء میں برسر پیکار دونوں فریق اس میں ملوث تھے۔ تشدد کو معلومات حاصل کرنے کے ذریعے کے طور پر دنیا میں کہیں بھی پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ تاہم مارشل لاء کورٹ نے جو بھی ذرائع استعمال کیے ہوں ان کی تفتیش کا طریقہ کار معقول معلوم ہوتا ہے کیونکہ جہاں آراء اور الطاف محمود سمیت دیگر گھروں سے انھوں نے انھی افراد کو لیا جو واقعتاً پر تشدد کارروائیوں میں ملوث تھے۔ آزادی کے حق میں لکھی گئی تحریروں سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ان افراد کو زیر حراست نہیں رکھا جو کارروائیوں میں ملوث نہیں پائے گئے۔ بلکہ دوسری جانب انھوں نے غلطی سے ابوالبرق علوی کو بھی جانے دیا جو واقعتاً عسکریت پسند تھا۔

سبوتاژ و سرزنش

سبوتاژ سرگرمیوں اور لوگوں کو ہراساں کرنے کی کارروائیوں کے جواب میں فوجی حکومت کی طرف سے آنے والا ردعمل کئی لحاظ سے تضادات کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ ایک غیر روایتی جنگ کے زیرسایہ جس انداز سے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے چند افسران کے حوالے ایک وسیع و عریض رقبہ کر دیا گیا تھا وہ ان کی عمر اور تجربے کے لحاظ سے موزوں نہ تھا۔ انہیں کئی مواقع پر ایسے فیصلے کرنا پڑ جاتے تھے جن کی اجازت انھیں عام حالات میں روایتی طور پر کبھی بھی نہ دی جاتی۔ وہ لوگ اس صوبے کی زبان تک سے نا آشنا تھے۔ وہ لوگ، یکساں نظر آنے والے ان بنگالی افراد میں دوست اور دشمن کی تمیز تک کرنے کے قابل نہ تھے۔ وہ لوگ ان کی روایات اور ثقافت سے نابلد تھے۔ انھیں ہر وقت اپنے سر پر ایک تلوار لٹکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ان لوگون کا ردعمل مختلف انداز سے سامنے آیا کرتا تھا، جس کا انحصار کسی فرد واحد کی شخصیت اور رجحان پر تھا۔ اس طرح سے مختلف النوع ردعمل مجموعی تصویر کو بے ہنگم شکل میں پیش کرنے کے ذمہ دار تھے۔ کسی مربوط لائحہ عمل کی غیر موجودگی میں ایک منفرد قسم کی دہشت گردی وجود میں آچکی تھی۔ کسی بھی شخص کے ساتھ کسی بھی جگہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

سید پور کی جدا کہانی

ماضی کے دریچوں سے جنم لینے والے ''آزادی کے ادب'' سے متعلق بنگلہ دیش میں تقریباً تمام کہانیاں بنگالیوں نے سپردقلم کی ہیں۔ البتہ اس سلسلے میں ہمیں ایک تحریر ایسی بھی ملتی ہے جسے سید پور کے ایک مارواڑی بزنس مین، دوارکا پرساد سنگھانیا نے شائع کروایا، انھوں نے اپنی تحریر میں حکومت وقت کے خلاف لوٹ مار، جبری مشقت اور قتل عام کے الزامات عائد کیے ہیں۔[۱۷] اس سلسلے میں مجھے اس وقت کے سید پور کے کمانڈنگ آفیسر سے انٹرویو کرنے کا موقع بھی ملا۔ لہٰذا ہم مذکورہ انٹرویو اور سنگھانیا کی تحریر میں موازنہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

مبینہ لوٹ مار کا واقعہ ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو پیش آیا۔ سنگھانیا کے مطابق مختلف افراد — جن میں ایک آرمی کیپٹن، ایک ''حوالدار میجر''، بارہ سویلین افراد بشمول ''سیکریٹری برائے ریلیف کمیٹی''، میونسپلٹی کے چیئرمین اور وائس چیئرمین، سید پور کے سول ایڈمنسٹریٹر، ایک ڈاکٹر اور برماشیل کمپنی کے ایگزیکٹیو شامل تھے — ان کے گھر میں صبح پانچ بجے داخل ہوئے، انھیں مارا پیٹا، ۶۰ سے ۷۰ ہزار روپے لوٹ لیے اور ان کے والد ہری لال سنگھانیا کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ جتنی تعداد اور جتنے

مختلف لوگوں کا ذکر اس مبینہ واقعے میں ملتا ہے اس سے یہ تمام الزامات مشتبہ دکھائی دیتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شائع کرنے سے قبل ان الزامات کی چھان کر لینا ضروری تھا۔

دوسرا الزام یہ ہے کہ آرمی نے کئی بنگالیوں کو اور مارواڑیوں کو ٹاٹ گاؤں برج اور ائیر فیلڈ اور، بعد ازاں جون کے مہینے میں کینٹ کے علاقہ میں جبری مشقت پر مجبور کیا۔ سنگھانیا یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ بدتمیزی کی گئی اور دو آرمی اور دو سول افسران نے نہ صرف ان سے سادے کاغذ پر دستخط لینے کی کوشش کی بلکہ انھیں زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش بھی کی گئی۔

تیسرا اور سب سے سنسنی خیز الزام یہ ہے کہ ۱۳ جون ۱۹۷۱ء کو ۳۳۸ مارواڑی مردوں، عورتوں اور بچوں کو گولا گھاٹ ریل فیکٹری کے مقام پر ایک ٹرین میں قتل کر دیا گیا۔ سنگھانیا کے مطابق وہ خود اسی ٹرین میں تھا لیکن زندہ بچ گیا۔ سنگھانیا لکھتا ہے کہ مارواڑی خاندانوں سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انھیں بھارت بھیجا جا رہا تھا اور انھیں چیلا ہاتی (بھارتی سرحد) جانے والی ٹرین پر سوار کر دیا گیا، لیکن بجائے وہاں لے جانے کے ٹرین کو گولا گھاٹ کے مقام پر روک دیا گیا جہاں برچھی اور درانتی بردار افراد نے انھیں قتل عام کا نشانہ بنایا۔ وہ چند حملہ آوروں کے نام بھی بتاتا ہے جن میں چپڑاسی، پان والے اور درزی وغیرہ شامل تھے۔ سنگھانیا کے مطابق یہ حملہ آور ''بہاری'' تھے اور جس طرح سے وہ ان کے نام گنواتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقامی لوگ تھے اور سنگھانیا انھیں جانتا بھی تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ کچھ لوگ بھارت جانے میں کامیاب ہوگئے۔ گو کہ اس کے مطابق تمام حملہ آور مقامی افراد تھے لیکن وہ یہ الزام بھی لگاتا ہے کہ جب لوگ فرار ہونے لگے تو ''پولیس اور ملٹری'' نے ان پر گولیاں چلانا شروع کر دیں۔

میں نے ان تمام الزامات کو ۲۳ فیلڈ رجمنٹ کے اُس وقت کے کمانڈنگ آفیسر کرنل محمد شفیع کے سامنے رکھا جو اس وقت سید پور میں تعینات تھے۔[18] دھیمے لہجے لیکن پختہ نظریات کے حامل کرنل شفیع نے تعارف نہ ہونے کے باوجود بھی مجھ سے ملاقات کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی اور سنگھانیا کی جانب سے لگائے گئے تمام الزامات کے براہ راست جوابات دیے۔ جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے تو ان کے مطابق انھوں نے کبھی بھی ایسے کسی واقع کے بارے میں سنا تک نہ تھا۔ تاہم ۲۷ مارچ کے مبینہ واقع کے دن وہ سید پور میں موجود نہ تھے — انھیں ۲۵ مارچ کو رنگپور بلوا لیا گیا تھا اور اس رات انھیں بوگرہ جانے کے احکامات دیئے گئے تھے۔ ان کے پاس اس نام کا افسر تو موجود تھا جو نام سنگھانیا نے لیا تھا لیکن کرنل صاحب کا خیال تھا کہ اگر کسی آرمی افسر — اور دیگر بہت سے سویلین افسران — نے ایسی کوئی کارروائی کی ہوتی تو اس کے بارے میں انھیں کبھی نہ کبھی تو ضرور پتہ چل ہی جاتا۔

جہاں تک مبینہ جبری مشقت کا تعلق ہے تو کرنل شفیع کے ذہن میں ''ٹاٹ گاؤں برج'' کا کوئی حوالہ موجود نہ تھا۔ تاہم انھوں نے فضائی پٹی کی تعمیر کے بارے میں بہت کچھ بتایا — وہ سید پور میں اس فضائی پٹی کی تعمیر کو سید پور میں اپنے قیام کے دوران بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ اس وقت تک سید پور میں آرمی کو کینٹ کے علاقوں تک محدود رہنے کے احکامات دیے جا چکے تھے۔ ان دنوں باہر جانا خطرے سے خالی نہ تھا اور کسی قسم کی کوئی سروس موجود نہ تھی۔ یونٹ کو اس قدر تنہائی محسوس ہوئی کہ اپریل کے مہینے کے شروع میں کرنل شفیع نے سید پور میں رن وے بنانے کا فیصلہ کیا۔ نہ تو ان کے پاس اس سلسلے میں کوئی تکنیکی مہارت تھی اور نہ روایتی رن وے بنانے کے لیے کوئی فنڈ موجود تھے۔ اس لیے ان کے ذہن میں ایک اچھوتے خیال نے جنم لیا۔

جس جگہ کو رن وے کی تعمیر کے لیے منتخب کیا گیا وہاں ایک جنگل پھیلا ہوا تھا۔ کرنل شفیع نے یہ اعلان کر دیا کہ مقامی لوگ جنگل سے درخت کاٹ کر اس کی لکڑی اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جوق در جوق لوگ آئے اور ایک ہفتے میں جنگل صاف ہو گیا۔ اس بات کا امکان موجود ہے کیونکہ وہ قیمتی لکڑی تھی، اسے بیچ کر کافی پیسے حاصل کیے جا سکتے تھے۔ بہر حال رن وے کی تعمیر کی کہانی اپنی نوعیت میں منفرد ہے۔

جب کرنل شفیع نے دیکھا کہ مزدوروں کی اجرت دینے کے لیے پیسے موجود نہ تھے تو انھوں نے مقامی لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کریں۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ ائیر پورٹ کا یہ منصوبہ بہت اہم اور اس سے سید پور کی اہمیت بھی دو چند بڑھ جائے گی۔ انھوں نے لوگوں کو پینے کے پانی اور بیمار یا زخمی ہونے کی صورت میں مفت علاج کی پیشکش کی، اس کے علاوہ تفریح کے لیے لاؤڈ اسپیکر پر بھارتی فلموں کے گانے چلانے کی پیش کش بھی کی۔ کام کے لیے تین شفٹیں رکھی گئی تھیں — صبح ۶ سے دوپہر ۱۲ بجے، دوپہر ۱۲ سے شام ۶ بجے اور شام ۶ بجے سے آدھی رات تک — ہر شفٹ میں کئی ہزار افراد کام کیا کرتے تھے۔ چونکہ شہر میں لوگوں کی تعداد کافی نہ تھی اس لیے کرنل صاحب نے گاؤں کے لوگوں سے بھی اپیل کی تھی، انھیں ان کے قریبی اسٹیشنوں سے لانے اور واپس چھوڑنے کے لیے ٹرین سروس کی پیشکش بھی کی گئی تھی۔ انھوں نے مقامی نمائندوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ اپنے حلقوں سے ''رضا کاروں'' کو بھیجیں۔ کرنل صاحب کے مطابق تھیلیوں میں اپنے لیے چاول لیے ہزاروں لوگ کام کے لیے آتے تھے۔ وہ کام کے دوران لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہ بڑے فخریہ انداز سے ذکر کرتے ہیں کہ ساڑھے تین سے چار ماہ کے دوران ۳۰۰×۳۰۰۰ فٹ کا رن وے تیار ہو گیا۔

کرنل شفیع کہتے ہیں کہ انھیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ جتنی بڑی تعداد میں لوگ جنگل کاٹنے آئے تھے اتنی ہی بڑی تعداد میں لوگ ''عوامی بھلائی'' کی خاطر رن وے کی تعمیر کے لیے اپنی رضا کارانہ خدمات بھی پیش کریں گے۔

جب وہ کام کے دوران لوگوں سے ملتے تو کوئی انھیں شکایت نہ کرتا لیکن لوگ ایک مغربی پاکستانی افسر کو شکایت کرنے سے خائف بھی ہو سکتے ہیں، بالخصوص اس صورت میں جب انھیں علاقے کے با اثر افراد نے کام کے لیے بھیجا ہو۔ ہوسکتا ہے مقامی نمائندوں نے بھی کرنل شفیع کی جانب سے مانگے گئے رضا کاروں کو ''کوٹہ'' سمجھا ہو جسے پورا کرنا ان کے لیے ہر حال میں لازم تھا۔ دراصل مارشل لاء اور ایمرجنسی کی جس صورتحال کے دوران لوگوں سے رضا کارانہ طور پر یہ فضائی پٹی تعمیر کروائی گئی اس پر سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی بھی شخص تنقید کرسکتا ہے۔ سید پور کا یہ ائیر پورٹ ایک مستقبل اثاثہ ہوسکتا ہے لیکن یہاں کام کرنے والے افراد ہی درحقیقت یہ بتا سکتے ہیں کہ وہاں کتنی تعداد میں لوگ رضا کارانہ طور پر کام کررہے تھے۔

سب سے زیادہ سنگین الزام، یعنی ان خاندانوں جن سے بھارت لے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا، کے حوالے سے کرنل شفیع تصدیق کرتے ہیں کہ یہ قتل عام ہوا تھا لیکن فوج کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس ''سانحے'' کے رونما ہونے کے کچھ ہفتے بعد انھیں اس کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ ان کے مطابق، انھیں یہ بتایا گیا تھا کہ کچھ مقامی افراد نے باقی رہ جانے والے ہندو خاندانوں سے وعدہ کیا تھا کہ انھیں ریل کے ذریعے ہندوستان لے جایا جائے گا، لیکن اس کے بجائے، ان کے مردوں کو سرحد کے قریب پہنچ کر قتل کردیا گیا اور خواتین کو سرحد پار بھیج دیا گیا۔

گو کہ کہانی کا یہ رخ سنگھانیا کی کہانی سے مختلف ہے۔ کیونکہ سنگھانیا کے مطابق ایک ریل فیکٹری کے پاس ٹرین کو روکا گیا تھا اور عورتوں کو بھی قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ البتہ سنگھانیا کی کہانی کئی لحاظ سے اس کہانی سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ سنگھانیا مذکورہ قتل عام کے ضمن میں کسی پاکستانی فوجی افسران کا ذکر نہیں کرتا۔ بجائے اس کے سنگھانیا کے مطابق قاتل مقامی مسلمان تھے: خواہ بنگالی ہوں یا بہاری، حملہ آوروں نے ہاتھوں میں برچھیاں اور درانتیاں پکڑ رکھی تھیں جو کہ ان دنوں نسلی فسادات میں استعمال ہونے والے عام ہتھیار تھے۔ گمان ہوتا ہے کہ اس قتل عام کا محرک لوٹ مار تھی کیونکہ مارواڑی کاروباری لوگ تھے اور اگر وہ بھارت جارہے تھے تو اپنے ساتھ بہت سامال و متاع لے جارہے ہوں گے۔

ٹھاکر گاؤں کے ٹائیگرز

جب میں نے پہلی مرتبہ ۱۹۷۱ء کی یادداشتوں کے ایک مجموعے میں شامل ''باغر خانچے چھوئے بار'' (چھ مرتبہ شیر کے پنجرے میں) نامی تحریر پڑھی تو مجھے یوں لگا کہ مصنف چھ مرتبہ پاکستانی جیلوں میں رہنے کا ذکر کر رہا ہوگا۔ بنگالی قوم اپنی تحریروں میں مغربی پاکستانیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جانوروں کے نام استعمال کرتی ہے اور بعض تحریریں تو ڈرامائی انداز میں ملتی ہیں — لیکن محمد شفیق العالم چودھری اصل شیروں (ٹائیگرز) ہی کی بات کر رہے تھے۔[19]

شفیق العالم لکھتے ہیں کہ سلوانگہ اور پامولی نامی ''یونینوں'' میں وہ ''سنگرام پریشد'' نامی تنظیم کے نگران تھے اور بودا پولیس اسٹیشن سے حاصل کی گئی رائفلوں کی مدد سے نوجوانوں کو عسکری تربیت دینے پر مامور تھے۔ ان کے مطابق ستمبر ۱۹۷۱ء میں انھیں وفادار ''رضا کاروں'' نے گرفتار کرلیا۔ انھیں بودا پولیس اسٹیشن لے جایا گیا اور اس کے بعد ٹھاکر گاؤں کینٹ پہنچا دیا گیا۔ دیگر باتوں کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ جب پولیس اسٹیشن میں وہ ایک کرسی پر بیٹھے تھے تو ایک ''بہاری'' پولیس افسر نے انھیں لات مار کر کرسی سے گراتے ہوئے کہا کہ تم کرسی پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہو۔

شفیق العالم کے مطابق اگلے کئی دنوں تک ٹھاکر گاؤں کینٹ میں انھیں تفتیش کے دوران تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا وہ بے ہوش ہو جاتے، اور جب بھی ہوش میں آتے تو خود کو چار شیروں کے پنجرے میں پاتے۔ عالم لکھتے ہیں کہ شیر انہیں کچھ نہ کہتے تھے — بلکہ شیر کا ایک بچہ باقاعدگی سے اپنا سر ان کے پیروں پر رکھ کر سو جایا کرتا تھا! تاہم، ان کے مطابق ایک مرتبہ آرمی والوں نے پندرہ افراد کو شیروں کے پنجرے میں ڈال دیا اور شیروں نے ان میں سے ایک درجن افراد کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ زخموں سے نڈھال ان لوگوں کو باہر لے جا کر قتل کر دیا گیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسی انداز سے ٹھاکر گاؤں کینٹ میں لگ بھگ ۱۵۰ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

اسی دوران انھیں مبینہ طور پر ٹھاکر گاؤں جیل بھی لے جایا گیا اور جج کے سامنے پیش کیا گیا، جج نے ان کی ضمانت منظور کر لی، لیکن اس کے باوجود ایک مرتبہ پھر انھیں کینٹ لا کر (شیروں کے ساتھ) بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں انھیں ٹھاکر گاؤں پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا جہاں سے وہ فرار ہونے میں اس وقت کامیاب ہوگئے جب بھارتی آرمی اور مکتی باہنی کے کارکن اس علاقہ میں آگے بڑھ رہے تھے۔

شفیق العالم کی تحریر کئی لحاظ سے ابہام کا شکار ہے۔ واقعات کو تاریخوں کے ساتھ بیان نہیں کیا

گیا ماسوائے ۴ ستمبر کی تاریخ کے جب انھیں گرفتار کیا گیا تھا، لہٰذا واقعات کے تسلسل میں پائی جانے والی ترتیب بھی شفاف طور پر نظر نہیں آتی۔ اس بات پر یقین کرنا محال ہے کہ جن شیروں نے درجنوں افراد کو گھائل کر دیا وہ شفیق العالم کو کچھ نہ کہتے تھے۔ ماسوائے اس کے کہ ان کا بچہ ان کے پیروں پر سر رکھ کر سو جاتا تھا ــ اور ایسا ایک مرتبہ نہیں ہوا بلکہ انھیں چھ مرتبہ اسی طرح شیروں کے پنجرے میں بند کیا گیا۔ اس بات کی وضاحت بھی نہیں ملتی کہ جب آنے والے دیگر درجنوں افراد کو مبینہ طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو شفیق العالم کو کیوں نہ مارا گیا؟

شفیق العالم کے مطابق ''میجر رانا'' نامی افسر نے ان سے بیشتر مواقع پر تفتیش کی۔ وہ کسی ''کرنل'' کا ذکر بھی کرتے ہیں، جو ان سے پوچھا کرتے تھے کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟ کھانا مل رہا ہے؟ تمھاری تعلیم کیا ہے؟ کرنل صاحب شفیق العالم سے کہتے تھے کہ وہ اسے ایک اچھا مسلمان بنانا چاہتے ہیں اور چاہتے تھے کہ شفیق العالم سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ ۱۹۷۱ء سے متعلق بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے مرتب کی جانے والی دستاویزات میں بھی ایک ایسے قیدی کا ذکر ملتا ہے جسے ٹھاکر گاؤں میں شیروں کے ساتھ پنجرے میں بند کیا جاتا تھا ــ لیکن یہ کہانی ۱۹۷۲ء میں ایک بنگالی اخبار میں چھپنے والی تحریر سے لی گئی ہے۔ قیدی کا نام ''سراج الدولہ'' لکھا گیا ہے جو ٹھاکر گاؤں کا رہائشی تھا اور گرفتاری کا مہینہ جولائی بتایا گیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس تحریر میں بھی بعد از گرفتاری کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہ ملنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ البتہ اس کہانی میں شیروں کے علاوہ ایک بندر کا ذکر بھی ملتا ہے ــ جو آنے والے قیدیوں کی تواضع تھپڑوں سے کیا کرتا تھا۔ اس کہانی کے مطابق بھی قیدی کو کئی مرتبہ پنجرے میں ڈالا گیا، لیکن صرف ایک مرتبہ شیر نے اسے پنجہ مارا۔ اس کہانی کے مطابق کینٹ میں تفتیشی افسر کا نام ''میجر راجا'' تھا۔ اس کہانی میں بھی قیدی ایک ''کرنل'' کا ذکر کرتا ہے۔ (جس نے مجھے بہت سی اچھی نصیحتیں کیں اور پھر مجھے جانے دیا)۔[۲۰]

میری تحقیق کے مطابق ٹھاکر گاؤں میں تعینات یونٹ میں کوئی ''میجر رانا'' نہ تھے، البتہ 34 پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک افسر کا نام میجر حافظ راجہ ضرور تھا ــ جو اب انتقال کر چکے ہیں۔ اس وقت ٹھاکر گاؤں میں ۳۴ پنجاب سے تعلق رکھنے والے لیفٹیننٹ کرنل عامر محمد خان کمانڈنگ افسر کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ میں نے ان سے یہ سوال پوچھا کہ کیا وہ واقعتاً ٹھاکر گاؤں کینٹ میں بنگالی قیدیوں کو شیروں کے سامنے ڈال دیتے تھے؟[۲۱]

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) عامر محمد خان ایک زندہ دل اور حس مزاح رکھنے والے انسان ہیں۔ انھوں نے میرے سوالات خندہ پیشانی سے سنے اور بڑی صراحت کے ساتھ ان کے جوابات

دیے کہ اُس وقت وہ ٹھاکر گاؤں میں کس طرح اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ان کے مطابق وہ جولائی ۱۹۷۱ء کو ٹھاکر گاؤں پہنچے اور انھیں یونٹ کی جانب سے پالے جانے والے دو شیر اور شیر کے دو بچے ورثے میں ملے۔ کسی نے انھیں بتایا تھا کہ یہ شیر سرکس میں استعمال ہو رہے تھے۔ میرے سوال پر انھیں ذرا بھی حیرت نہ ہوئی کیونکہ جنگ کے بعد بھارتی اخبارات میں وہ بذات خود بھی پڑھ چکے تھے کہ ان پر بنگالیوں کو شیروں کے سامنے ڈالنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ انھوں نے ان الزامات کی یکسر تردید کی۔ ان کے مطابق واقعہ کچھ یوں ہے کہ ستمبر کے مہینے میں ایک بنگالی قیدی بول نہیں رہا تھا، اس لیے ایک موقع پر وہ خود اسے شیروں کے پنجرے کے پاس لے گئے اور اسے پنجرے میں پھینک دینے کی دھمکی دی۔ بہت کوششوں کے باوجود جب وہ نہ بولا، تو کرنل صاحب نے اسے جانے دیا۔

عامر محمد خان کے مطابق شیروں سے متعلق یہ واحد واقعہ تھا۔ انھوں نے قیدیوں کو شیروں کے پنجروں میں بند کرنے اور ان کے ذریعے زخمی کروانے کی سختی سے تردید کی۔ انھوں نے بتایا کہ جب تک وہ وہاں موجود رہے کینٹ میں کسی کے قتل کیے جانے کا بھی کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ تاہم بہت سے بنگالی جن میں وفادار تنظیم البدر کے کارکنان بھی شامل ہیں، اس وقت وہاں موجود تھے اور وہ مذاقاً لوگوں کو شیروں کے سامنے ڈالنے کے قصے بیان کرتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان مزاحیہ قصوں کو افواہوں کا حصہ بنا دیا گیا ہو۔ عامر نے اور بھی بہت سے کام کیے، جو محض ان کی شہرت میں اضافے کا باعث ہی بن سکتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کے علاقے کے لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں سستی سے کام لیتے تھے، اس لیے انھوں نے لوگوں کو اسکول میں جمع کیا اور انھیں نماز پڑھنے کو کہا۔ انھوں نے علاقے میں چالیس مندر دیکھے جنھیں ہندو چھوڑ کر جا چکے تھے، لیکن وہاں ایک بھی مسجد نہ تھی — اس لیے انھوں نے وہاں ایک مسجد تعمیر کروائی۔ انھیں سینئر بنگالی ایڈمنسٹریٹروں کے گھر مدعو کیا جاتا تھا جہاں یہ دیکھ کر انھیں صدمہ پہنچا کہ ان کی خواتین دوپٹہ تک نہ لیتی تھیں، اس پر انھوں نے ایک مناسب (ڈریس کوڈ) لباس لازمی قرار دے دیا۔ اور آخر میں ایک بنگالی کے گھر میں دعوت کے بعد انھیں بتایا گیا کہ میزبان کی بیٹی رقص و موسیقی پیش کرے گی۔ اب تو حد ہی ہوگئی تھی — انھوں نے ایسا کچھ نہ ہونے دیا!

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) عامر نے بتایا کہ دیگر افسران نے انھیں یہ سمجھانے کی پوری کوشش کی کہ مغربی پاکستانی اور بنگالی روایات میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنی طبیعت کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی سختی کا مظاہرہ کر رہے تھے، تاکہ نظم و ضبط قائم کرنے میں

مدد مل سکے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں انھیں ''ٹھاکر گاؤں کا اورنگزیب'' کے نام سے ریکارڈ کر رہی ہوں اور یہ کہ اگر انھوں نے بنگالیوں کو گانے بجانے اور ناچنے سے روک رکھا تھا تو اس بات میں تو لوگ ان سے نہایت ہی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوں گے۔ عامر ایس ایس جی کے افسر تھے، انھوں نے میری اس بات کو سراہنے میں اپنی بہترین حِس مزاح کا مظاہرہ کیا۔

بریگیڈیئر عامر نے ایک سنجیدہ واقعہ بھی میرے سامنے بیان کیا۔ جب وہ ٹھاکر گاؤں پہنچے تو وہ ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (EPCAF) کے مقامی سربراہ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ افسر اور ان کے سیکنڈ ان کمانڈ 2IC دونوں ہی مغربی پاکستان سے تھے۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی مخالف سمت میں دیوار پر انھوں نے دھبے دیکھے۔ پوچھنے پر انھیں بتایا گیا کہ مارچ کے مہینے میں ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز (EPCAF) کے بنگالی اہلکاروں نے حملہ کر کے میجر محمد حسین، ان کی اہلیہ اور بیٹے کو نہایت ہی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ ان کی چھوٹی بچی کو بھی چاقو سے زخمی کر کے سڑک پر پھینک دیا گیا تھا اور اس کے بعد سے وہ لاپتہ ہو گئی تھی۔ جبکہ دوسری بیٹی نوکرانی کے پاس گھر سے دور تھی اس لیے محفوظ رہی۔ 2IC ان کی بیوی اور ایک بنگالی افسر جو انھیں بچانے کی کوشش کر رہا تھا، کو بھی مار دیا گیا۔ ایک مقامی پارلیمانی رکن نے کرنل عامر کو بتایا کہ لسانی فسادات میں بنگالیوں نے ۳ سے ۴ ہزار بہاری خاندانوں کے سروں سے باپ کا سایہ چھین لیا تھا۔ انہوں نے لٹے ہوئے خاندانوں کے لیے کیمپ لگائے اور ان کی بحالی کے لیے چندہ جمع کیا۔ کرنل عامر نے بتایا کہ انھوں نے EPCAF کے متوفی سربراہ کی گمشدہ بیٹی کو بازیاب کرنے کی کوشش بھی کی۔ معلوم ہوا کہ سڑک سے گزرنے والے ایک شخص نے اسے اٹھا لیا تھا؛ اس کی حالت بہت خراب تھی، لیکن اسے تلاش کر لیا گیا۔ جب چھوٹی بچی نے بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) عامر کو دیکھا، تو ''ابو'' کہہ کر پکار اٹھی۔ انھیں بتایا گیا کہ ان کی شکل وصورت اس بچی کے مرحوم والد سے مشابہ تھی۔

انجانے جرم کی اجتماعی سزا

میمن سنگھ ڈسٹرکٹ میں کشور گنج کے نزدیک بوروئی ٹولہ نامی ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو اس مقام پر لوگوں کو قطار میں کھڑا کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں میری گفتگو محمد علی اکبر سے ہوئی جو ایک مقامی دیہاتی ہے، اور اس مذکورہ واقعے میں اس کے خاندان کے چار افراد مارے گئے تھے لیکن وہ خود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک ریلوے لائن کھیتوں کو چیرتی ہوئی وہاں سے گزرتی ہے۔ اس پٹری کے اردگرد کئی دیہات آباد ہیں، انہی

دیہاتوں میں سے ایک دیہات دمپاڑا ہے جہاں سے محمد علی اکبر کا تعلق ہے۔[۲۲]

محمد علی اکبر دبلے پتلے جسم اور دراز قد کا مالک ہے۔ اس کے مطابق ۱۹۷۱ء میں اس کی عمر لگ بھگ ۴۰ برس تھی۔ ہلکے زرد رنگ کے لباس میں ملبوس اور سر پر رومال باندھے یہ شخص جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا، اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈرامہ سے بھی شغف رکھتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شاعری کرتا تھا اور اسے جادو کے چند کرتب بھی آتے تھے۔ جوئے نال عابدین بھی اسی گاؤں سے ہیں، لیکن ان دنوں مکتی جودھا (حریت پسندوں) کے طور پر کسی اور جگہ کارروائیوں میں مصروف تھے۔ عابدین کے مطابق اس دن بوروئی ٹولہ میں آس پاس کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے کئی دیہاتی لوگ جمع تھے — ان میں دمپاڑہ، گووندہ پور، کالی کباری، تلک ناتھ پور اور چکنر چور وغیرہ شامل ہیں۔

گاؤں والوں کے مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو بوروئی ٹولہ میں آرمی بذریعہ ٹرین پہنچی تھی، ٹرین کھیتوں میں اسی جگہ آکر رکی تھی جہاں ہم لوگ کھڑے تھے۔ آرمی والوں کے ساتھ مقامی ''رضا کار'' بھی تھے، انہوں نے اردگرد کے تمام مردوں کو ریلوے لائن کے قریب بلوایا۔ محمد علی اکبر نے بتایا کہ ''رضا کاروں'' نے ان سے کہا کہ کمانڈر ان سے کوئی ضروری بات کرنا چاہ رہا ہے۔ بیشتر گاؤں والے سمجھے کہ شناختی کارڈ کا معاملہ ہے، اور ان کے پاس تو پہلے ہی شناختی کارڈ موجود ہیں۔

میں نے پوچھا کیا آرمی پہلے بھی ان کے گاؤں اس طرح لوگوں سے بات چیت کرتی آئی تھی؛ اس پر محمد علی نے ''نفی'' میں جواب دیا۔ اکبر کے مطابق جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے تو ایک قریبی گاؤں کے مولانا حافظ نے آفیسر انچارج سے اردو میں بات کی۔ اس کے بعد اس گاؤں کے لوگ ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے مولانا صاحب کے ساتھ لوٹ گئے۔

محمد علی اکبر کہتے ہیں کہ انھیں کبھی بھی وہ باتیں سمجھ نہ آسکیں۔ گاؤں والوں کے مطابق، پھر اچانک ہی جیسے آرمی والے پاگل ہو گئے ہوں۔ یہ بات واضح نہیں ہے ایسا کیوں ہوا۔ بظاہر ایک مقامی ''رضا کار'' ہاشم آیا اور اس نے آرمی والوں کو کچھ کہا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے عسکریت پسندوں کے ہاتھوں اپنے بھائی کے مارے جانے کی شکایت کی تھی یا پھر یہ کہ بیماری کی حالت میں وہ لوگ اسے ساتھ لے گئے تھے، اور ان سے مدد طلب کی۔ یہ بات بھی سننے کو ملی تھی کہ آرمی والوں کو باغیوں کے ہاتھوں ایک فوجی کے مارے جانے کی اطلاع موصول ہوئی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آرمی والے بنگالی ''رضا کار'' کی بات کو سمجھ ہی نہ سکے ہوں۔ بظاہر ہاشم ایک یا دو فوجیوں کے ساتھ واپس گاؤں کی جانب چلا گیا۔ باقی ماندہ فوجیوں نے وہاں کھڑے تمام افراد کو فائرنگ کر کے مارنا شروع کر دیا۔

مارنے کا طریقہ کار بہت ہی امتیازی تھا۔ اکبر کے مطابق سپاہیوں نے انہیں آگے پیچھے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا، ہر شخص سامنے والے شخص کے کاندھے پر سیدھا ہاتھ رکھے کھڑا تھا — اکبر نے مظاہرہ کر کے دکھایا کہ کیسے کھڑا کیا گیا تھا۔ ہر قطار کے سامنے ایک گن رکھی گئی، تاکہ پوری قطار کے اندر کھڑے ہر شخص کو مارا جا سکے۔ اقبال جو ایک سابق عسکریت پسند تھا اور ڈھاکہ سے میرے ساتھ آیا تھا میں اس کے بیان سے اندازہ لگانے لگی کہ انہوں نے لائٹ مشین گن (ایل ایم جی) استعمال کی ہوگی، جسے اسٹینڈ کے اوپر نصب کیا گیا تھا۔

اکبر نے بتایا کہ اس نے ایک آواز سنی اور فوراً زمین پر گر پڑا — اس نے زمین پر گر کر دکھانے کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ قطار میں کھڑے تمام افراد گر پڑے اور چند افراد تو اس کے اوپر بھی گرے۔ انھیں مارنے کے بعد فوجی ٹرین میں سوار ہوئے اور چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اکبر نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ زخمی نہ تھا۔ اس نے بتایا کہ، چاروں طرف انسانی جسم پڑے تھے، اور ان میں سے زیادہ تر مر چکے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق اس واقعے میں دس یا بارہ لوگ بچ گئے تھے۔ اس کا چاچا، دو کزن اور بھتیجا مارے گئے تھے۔ مجمعے میں موجود ایک اور عسکریت پسند نے مجھے بتایا کہ اس واقعے میں اس نے اپنے خاندان کے تین افراد کو کھویا تھا۔ کل کتنے افراد مارے گئے یہ بات واضح نہ ہو سکی تھی۔[۲۳]

کسی بھی شخص کے پاس اس بات کا جواز موجود نہ تھا کہ آرمی والے بوروئی ٹولہ میں کیوں آئے تھے اور انہوں نے تمام مردوں کو قطار میں کھڑا کر کے کیوں مار ڈالا تھا۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ملٹری والوں کو باغیوں کی تلاش تھی کیونکہ قریب ہی ایک پُل کو ایک دن پہلے تباہ کر دیا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح نہیں کہ ملٹری والے قتل عام کے ارادے سے آئے تھے یا یہ سب اچانک ہی ہو گیا۔ اس علاقے میں سید نذر الاسلام کا گاؤں بھی ہے جو بھارت میں جلاوطنی کے دوران بنگلہ دیش حکومت کے پہلے صدر بنے۔ ان کے بیٹے جو پارلیمنٹ کے رکن بھی ہیں، انھوں نے وہاں ایک یادگار بھی تیار کروائی ہے۔

جوئے نال عابدین، عسکریت پسند جو قتل عام کے وقت وہاں موجود نہیں تھا، نے بتایا کہ ۱۳ اکتوبر کو ہونے والے قتل عام کے مقام پر حال (۲۰۰۴ء) میں ایک تقریب منعقد کرنے کے بعد اسے ایک گمنام خط موصول ہوا جس میں یادگار کو اُڑانے اور عابدین کو قتل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس نے بتایا کے اس طرح کا دھمکی آمیز خط اسے پہلی بار موصول ہوا تھا۔ عابدین اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا — وہ اس بات سے خوفزدہ دکھائی نہ دیتا تھا، وہ ایسی مزید تقریبات منعقد

کرنے کے بارے میں پرعزم دکھائی دے رہا تھا۔

میری ملاقات ان پاکستانی افسران سے نہ ہوسکی جنھوں نے کشورگنج میں خدمات سرانجام دی تھیں۔ تاہم، بوروئی ٹولہ میں کیے جانے والے قتل عام کے بارے میں، جب میں نے دیگر پاکستانی افسران سے گفتگو کی، تو انہیں یہ حرکت بہت بری لگی۔ ایک طرف تو یہ افسران اس قتل عام کی وجوہات بتانے سے قاصر تھے، تو دوسری جانب انھیں اس انداز میں قطاریں بنوانے میں بھی تعجب تھا کیونکہ اس انداز سے قطار بنوا کر مارنا کوئی مؤثر اقدام نہ تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مقصد مارنا نہ تھا۔ بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ افسر کے ذہن میں کچھ ملا جلا سا رجحان تھا، اور اس نے ناکردہ گناہوں کی سزا تمام لوگوں کو اجتماعی طور پر دی۔[۲۴]

حریت پسندوں کے مقدمات و مصائب

ایس ایم راقب علی نے ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو کھلنہ میں واقع کریسنٹ جوٹ مل سے تین دن کی چھٹی لی۔ اس کے بعد وہ واپس نہ آیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے دیواروں پر تحریریں پڑھی تھیں اور وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کھلنہ میں ہی موجود تھا اور پلاٹینیم جوٹ مل میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔[۲۵]

ایس ایم راقب علی بھارت چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سفر کرتا ہوا جل پیگوری اور باگ ڈوگرہ پہنچ گیا جو بنگال کے شمال میں واقع ہے اور پھر وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز سہارنپور چلا گیا جہاں ٹریننگ کیمپ تھا، بالآخر وہ دہرہ دون پہنچا، جہاں انڈین ملٹری اکیڈمی کے قریب بھارتیوں نے ٹریننگ کیمپ لگا رکھا تھا۔

اپنی تربیت مکمل کرنے کے بعد، راقب علی نے مشرقی پاکستان میں تین کارروائیوں میں حصہ لیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں اپنی چوتھی کارروائی کے دوران وہ پکڑا گیا، اس کارروائی میں وہ انیس افراد کے ساتھ جیسور کینٹ سے چند میل کے فاصلے پر واقع پاکستان آرمی اور رینجرز کے کیمپ پر حملہ کرنے جا رہا تھا۔ ان کا ایک گروپ مارا گیا اور باقی ماندہ افراد کا محاصرہ کر کے انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں جیسور کینٹ میں لے جایا گیا۔

راقب علی کے مطابق اس وقت کے مشرقی کمانڈر جنرل نیازی نے احکامات دے رکھے تھے کہ عسکریت پسندوں کو مارا نہ جائے بلکہ ان پر مقدمات چلائے جائیں۔ راقب علی کے مطابق ایسا اس لیے کیا گیا کہ بین الاقوامی میڈیا سے یہ رپورٹیں آرہی تھیں کہ قیدیوں کو قتل کیا جا رہا ہے جس

سے آرمی کے خلاف ایک منفی تاثر ابھر رہا تھا۔[۲۶]

وجہ کچھ بھی ہو، راقب علی کی جان جنرل نیازی کے احکامات، کہ باغیوں کو قتل نہ کیا جائے بلکہ ان پر مقدمات چلائے جائیں، کی وجہ سے ہی بچ گئی۔ ان کے گروپ کے اٹھارہ قیدیوں کو جیسور کینٹ میں رکھا گیا اور اسی دوران ایک ملٹری عدالت میں ان پر مقدمہ چلا۔ اس کے مطابق دوران تفتیش اسے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ سوئٹزر لینڈ سے تعلق رکھنے والے چند صحافیوں کو ان کا انٹرویو لینے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن آرمی کی موجودگی کی وجہ سے انہیں انٹرویو لینے سے انکار کر دیا۔ جوں جوں آرمی والوں کے لیے جنگ مشکل ہوتی گئی راقب اور اس کے ساتھیوں کو جیسور سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ مقدمے میں کافی وقت لگا اور آخری فیصلہ ــــ سزائے موت ــــ آنے تک نومبر کا مہینہ آچکا تھا۔ تاہم، سزا پر عمل درآمد سے قبل ہی بھارت کے ساتھ ایک باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا۔ جیسور میں ۶ سے ۷ دسمبر تک جنگ بندی ہو چکی تھی؛ بھارتی آرمی نے راقب علی اور اس کے ساتھیوں کو جیل سے رہائی دلوا دی۔

کم از کم راقب علی کا تعلق تو واقعتاً ان لوگوں سے تھا جو بھارت گئے اور عسکری تربیت حاصل کی اور اس کے بعد عملاً اپنے ملک کی آزادی کی جنگ لڑی۔ کریسنٹ جوٹ مل میں بطور اسپنر کام کرنے والے عبدالرب سردار نے بھارت میں تین ماہ تربیت حاصل کی، لیکن اسے واپس آکر عملاً جنگ لڑنے کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ ایک دن اس نے اور اس کے ساتھیوں نے یہ خبر سنی کہ پاکستان آرمی ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال رہی ہے۔ ان کے کیمپ بند کر دیئے گئے اور وہ مل ایریا کھلنہ میں واپس آگیا ــــ لیکن اسے تعجب ہوا کہ ــــ کھلنہ میں اب بھی لڑائی جاری تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ سینکڑوں پاکستانی فوجی اس علاقے میں مورچہ بند تھے اور ان کا دفاع بہت مضبوط تھا؛ بھارتی آرمی اب تک وہاں سے آگے بڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ یہ ڈھاکہ میں ہتھیار ڈالنے کے بعد کا دِن تھا۔[۲۷]

آزادی کے بعد کے حالات سے باغی عسکریت پسند بہت تلخ دکھائی دیتے تھے۔ برسنگدی کے پریس کلب میں میری ملاقات سابقہ باغی عسکریت پسند، کبیر میاں سے ہوئی جو مل میں کام کیا کرتا تھا۔[۲۸] جب ۱۹۷۱ء میں ''حالات خراب'' ہوئے تھے تو مل بند ہو گئی۔ میاں اس وقت سے بے روزگار تھا۔ اس نے مکتی باہنی میں شمولیت اختیار کر لی، جب اسے بتایا گیا کہ ''پنجابی، لوگ اسے مار ڈالیں گے''، لیکن وہ سخت نالاں تھا کہ وہ اور اس جیسے کئی افراد جو باقاعدہ لڑائی کا حصہ تھے انھیں آزاد بنگلہ دیش میں کچھ نہ ملا جبکہ ان کے مخالفین کو خوب نوازا گیا۔

لڑائی کے دوران باغی عسکریت پسندوں کے ''کارناموں'' کو ان کے طاقتور اتحادی، بھارتیوں کے جانب سے پیش کی جانی والی کہانیوں سے گھن لگ جاتا ہے۔ میجر جنرل سخونت سنگھ لکھتے ہیں کہ ''یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگالی اہلکاروں پر حب الوطنی کے نام پر عوامی لیگ کا کنٹرول، شیخ مجیب کی کرشماتی شخصیت اور کرنل عثمانی کے پیشہ ورانہ روابط کے باوجود، منتظمین کو مربوط منصوبہ بنانے اور اس پرعمل درآمد کرانے میں کامیاب نہیں رہے...... کیونکہ بغاوت کی جڑیں عوام میں بہت زیادہ گہری نہیں تھیں۔ ابتدائی طور پر بھارتی بارڈر سیکیورٹی فورس (بی ایس ایف) نے باغیوں کی کارروائیوں میں ان کی مدد کی۔ لیکن ''بدقسمتی سے اقدامات کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکے''۔ میجر جنرل سنگھ لکھتے ہیں کہ ''بغاوت کی ناکامی اور باغیوں کی جانب سے کی جانے والی کارروائیوں کے خراب نتائج کے بعد بھارتی سرحد عبور کرنے کے بعد اپریل کے آخری ہفتے میں بھارتی حکومت نے صورتحال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ 30 اپریل کو بھارتی آرمی کو گوریلا جنگ کی تمام حکمت عملی اپنے ہاتھ میں لینے کی ہدایت کی گئی......''۔[۲۹]

کچھ اس قسم کا تجزیہ میجر جنرل لچھمن سنگھ بھی پیش کرتے ہیں: ''مکتی باہنی کے عسکریت پسند سچے گوریلا نہ تھے...... عوامی لیگ کے رہنما ان کے ساتھ مل کر کام کرنے اور عسکریت پسندی کے نتائج سے خائف نظر آتے تھے۔ گوریلوں کے پاس اپنی کارروائیوں کے لیے مشرقی پاکستان کے اندر کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں تھا، البتہ بھارتی سرحدوں کے آر پار وہ آسانی سے کارروائیاں کر سکتے تھے''۔ سنگھ کے مطابق ''جولائی کے مہینے تک یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ مکتی باہنی دیہاتیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے''۔ تاہم یہ لوگ بھاری جانی نقصان کے پیشِ نظر پاکستان آرمی سے دو بدو لڑنے سے بھی کتراتے تھے۔ ''پروپیگنڈہ مشین نے موٴثر کارکردگی دکھائی۔ لنگی میں ملبوس اور ہاتھوں میں بندوق تھامے مکتی باہنی کے گوریلا دیکھتے ہی دیکھتے ہیرو بن گئے ...... خبروں کے بھوکے پریس نے کامیابیوں کی فرضی داستانوں کو بھی ہضم کر لیا جن پر ہر خاص و عام یقین کرنے لگا''۔[۳۰]

اکتوبر اور نومبر کے وسط تک بھی مسائل موجود تھے جب: بھارتی آرٹلری کو بڑے پیمانے پر مشرقی پاکستان میں باغیوں کی کارررائیوں میں مدد دینے کے لیے استعمال کیا گیا اور بعض اوقات مکتی باہنی کو مدد فراہم کرنے کی غرض سے بھارتی عسکری قوت بشمول ٹینک اور فضائی قوت کو بھی استعمال کیا گیا۔ جب معاملات مکتی باہنی کے کنٹرول میں آجاتے تو اپنے اہداف حاصل کرنے کے بعد بھارتی آرمی واپس سرحد پار چلی جایا کرتی تھی۔۔۔ گو ایسا کرنا کبھی کبھی عارضی ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ بھارتیوں کی امیدوں کے برعکس جب پاکستان آرمی جوابی حملہ کرتی تو مکتی باہنی کے قدم اکھڑ جاتے۔[۳۱]

لیفٹیننٹ جنرل جے ایف آر جیکب کے تجزیئے کے مطابق، ''گوریلوں میں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ کبھی کبھی اپنے آپریشن کے لیے انھیں بھارتی فوجیوں کا انتظار کرنا پڑتا تھا وہ اپنے آپریشن کے لیے ہمہ وقت تیار نہ ہوتے تھے''۔ جنرل جیکب کے مطابق اتنی قلیل تربیت کے ساتھ اتنی بڑی مکتی باہنی قائم کرنا، ایک بہت بڑی غلطی تھی، باالفاظ دیگر یہ لوگ مؤثر کارروائیوں کے اہل نہ تھے۔[۳۲] میجر جنرل لچھمن سنگھ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ: ''مکتی باہنی کی افادیت اور کارکرگی سے متعلق نظریات میں بڑی حد تک تفاوت پایا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نیم تربیت یافتہ، بے عزم اور بے قیادت رضا کاروں کو مسلح کرنا ایک غلطی تھی خصوصاً جنگ کے بعد انھوں نے قانون شکنی جیسے مسائل پیدا کیے''۔[۳۳] دلچسپ بات یہ ہے کہ بھارتیوں کے برعکس مکتی باہنی کے مخالف ''پاکستانی آرمی افسران'' نے ان رضا کاروں سے متعلق زیادہ مثبت تجزیات پیش کیے ہیں: ان میں سے کئی ایک نے مجھے بتایا کہ اگرچہ ان رضا کاروں میں ''فرار'' کا رجحان غالب تھا، لیکن دو بدو لڑائی میں بہت سے رضا کار سیاسی طور پر پُرعزم اور اپنے مقصد سے مخلص نظر آتے تھے۔

''بڑے بڑے آپریشن ہمیشہ بھارتی ہی کیا کرتے تھے......ہم میں سے کچھ لوگ اندر جاتے اور چند دیسی دستی بم پھینک آتے۔ لیکن جہاں تک پلوں کو اُڑانے یا ٹرین کو پٹری سے نیچے اتارنے جیسے معاملات تھے، تو بھارتی یہ کام بذاتِ خود کیا کرتے تھے، اور ہمیں صرف بطور رہنما اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اور پھر بھی وہ اسے مکتی فوج کی ''فتح'' کہتے ہیں۔ یہ باتیں بنگالی افراد نے برطانوی صحافی ستھی براتا سے ایسے مایوس بنگالیوں نے کیں جو بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، مذکورہ صحافی نے مسلمان دیہاتی کے بھیس میں تری پورہ، بھارت کے باغی تربیتی کیمپ کا دورہ کیا اور پھر مکتی باہنی اور بھارتی اہلکاروں کو دھوکا دے کر کومیلا کی جانب رخت سفر باندھا اور ایک بار پھر واپس بھی آ گئے۔ ستھی براتا کو اگست ۱۹۷۱ء میں ہی مشرقی پاکستان میں بھارت کی جانب سے غیر معمول دخل اندازی کا علم ہو چکا تھا۔ جہاں تک باغی جنگجوؤں کا تعلق ہے تو اس کی رپورٹ کے مطابق ......

''تقریباً ۲۰۰ سے زائد رضا کاروں میں سے صرف چھ نے مکمل تربیت حاصل کی اور صرف تین نے مکمل طور پر آپریشن میں حصّہ لیا تھا''۔[۳۴]

باب ہشتم:

برادر کشی

جنگ کے اختتام پر ڈیتھ اسکواڈ

گڈ ڈاکٹر کی مثال

شیامولی نسرین چودھری اس قسم کے لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں میری دادی کہا کرتی تھیں کہ یہ ''اللہ والے'' لوگ ہیں — ایک ایسی شخصیت جس سے مل کر آپ کو بذات خود اس کی ذات میں موجود نیکی کا ادراک ہونے لگتا ہے اور ان سے ملے بغیر اس بات کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ان کے شوہر ڈاکٹر علیم چودھری کے ساتھ بنگلہ دیش کی آزادی کے لمحات کے قریب دسمبر ۱۹۷۱ میں کیا کیا گیا تھا!

۱۹۷۱ میں ڈاکٹر علیم اور ان کی اہلیہ پرانا پلٹن ڈھاکہ میں واقع ایک تین منزلہ مکان میں رہائش پذیر تھے۔ ڈاکٹر چودھری ماہر امراض چشم تھے۔ انھوں نے مکان کی نچلی منزل پر اپنا کلینک قائم کر رکھا تھا اور بالائی دو منزلوں پر ان کے گھر والے رہائش پذیر تھے۔ ان کے گھر والے بنگلہ دیش کی آزادی کے بڑے حامیوں میں سے تھے۔ ۲۵۔۲۶ مارچ کی رات کو جب ڈھاکہ میں آرمی آپریشن شروع ہوا تو بھارت میں جلا وطنی گزارنے والے نذرالاسلام کو — جو کہ بعد میں بنگلہ دیشی صدر بھی بنے — ان کے گھر میں لایا گیا۔ اس سے قبل وہ ڈاکٹر چودھری کی بہن کے گھر میں قیام پذیر تھے۔ انھیں ۲۹ مارچ تک گھر کی دوسری منزل پر چھپا کر رکھا گیا تھا، بعد ازاں مستقبل کے صدر کو ساڑھی اور برقعہ پہنا کر ایک دوسری کمین گاہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں سے وہ بھارت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنے سیاسی عزائم کے پیش نظر چودھری خاندان کے لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ انھوں

نے عوامی لیگ اور تحریک آزادیٔ بنگلہ دیش کے ایک اہم سیاسی رہنما کو پناہ دی— تعجب کی بات یہ تھی کہ وہ پاکستان آرمی کی جانب سے بنائے جانے والے نیم فوجی رضا کار دستے البدر گروپ — جو باغیوں کو کچلنے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا— کے لیے بھی اتنے ہی مہمان نواز ثابت ہوئے۔

جولائی ۱۹۷۱ء میں چودھری صاحب کے پڑوسی متین صاحب ایک اجنبی شخص کے ساتھ ڈاکٹر چودھری کے پاس آئے۔ انھوں نے بتایا کہ لوگوں نے ان کے گھر کو آگ لگادی تھی اور اب اپنے خاندان سمیت وہ بے گھر تھے۔ انھوں نے چودھری صاحب سے درخواست کی کہ اس اجنبی شخص کو اپنے گھر میں پناہ فراہم کردیں۔ چودھری صاحب کی اہلیہ کہتی ہیں کہ انھوں نے اس بات سے اتفاق نہ کیا لیکن چودھری صاحب ان کی منت سماجت کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ وہ شخص اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ گراؤنڈ فلور پر رہنے آگیا۔ ڈاکٹر چودھری کو اپنا آئی کلینک پہلی منزل کے ڈرائنگ روم میں منتقل کرنا پڑا۔

چودھری صاحب کے نئے مہمان کا نام مولانا عبدالمنان تھا۔ آزاد بنگلہ دیش کے حامیوں کے مطابق یہ شخص پاکستان آرمی کی جانب سے مقامی طور پر بنائی گئی نیم فوجی رضا کار تنظیم البدر کا اہم کارکن تھا۔ اس گروپ کی تشکیل کے بارے میں جنرل نیازی، ایسٹرن کمانڈر رقم طراز ہیں:

> گو کہ ان لوگوں کی بھرتی پہلے ہی شروع کی جاچکی تھی لیکن اس فورس (رضا کاروں) کی باقاعدہ تشکیل کی منظوری اگست ۱۹۷۱ء کے اواخر میں دی گئی...... دو علیحدہ علیحدہ گروپ بنام البدر اور الشمس منظم کیے گئے تھے۔ اسکول اور مدارس سے تعلیم یافتہ اور باقاعدہ باہمت طالب علموں کو البدر میں رکھا گیا، جہاں انھیں ''خصوصی آپریشن'' کرنے کی تربیت بھی دی گئی، جبکہ باقی ماندہ افراد کو الشمس نامی گروپ میں شامل کیا گیا جن کی ذمہ داریوں میں پلوں، اہم مقامات اور دیگر جگہوں کی حفاظت کرنا شامل تھا۔[۲]

جنرل نیازی لکھتے ہیں کہ یہ رضا کار (وفادار) باغیوں کے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ نہ تھے اور نہ ہی ان کے پاس باغیوں کی طرح خودکار ہتھیار موجود تھے، نیز باقاعدہ جنگ شروع ہوتے ہی ان کے قدم اکھڑ جاتے تھے۔ انھیں اور ان کے گھر والوں کو باغیوں کی جانب سے ڈرایا دھمکایا جاتا تھا اور آرمی اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں اور قلیل تعداد کے پیش نظر انھیں صحیح انداز سے تربیت دینے سے قاصر تھی۔ رضا کاروں کا انتخاب وفادار بنگالیوں میں سے کیا جاتا تھا، لیکن ''انھیں کنٹرول میں رکھنے کی غرض سے اور صحیح طریقے سے کام میں لانے کے لیے مغربی پاکستانی پولیس اور غیر بنگالیوں کے ساتھ شامل کرکے استعمال میں لایا جاتا تھا''۔

مسز چودھری آنے والے مہینوں کے دوران جس طرح کی روزمرہ زندگی کا ذکر کرتی ہیں وہ

بہت غیر معمولی معلوم ہوتی ہے۔ نچلی منزل میں ہر وقت پاکستانی فوجی مولانا سے ملنے آتے رہتے تھے اور اکثر رات گئے تک وہیں ٹھہرے رہتے تھے۔ البدر کے جوان چودھری صاحب کے گھر کے دونوں دروازوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ بالائی منزل پر روزانہ باغی جنگجوؤں کی آمدورفت رہتی تھی جہاں ان کا مفت علاج کیا جاتا تھا اور بعدازاں انھیں کار میں ڈال کر محفوظ مقامات پر بھی پہنچایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر چودھری باغیوں کے لیے فنڈ اور ادویات بھی اکٹھی کرتے تھے اور، وہ اور ان کے ساتھ ماہر امراض قلب ڈاکٹر فضل ربی اور دیگر ڈاکٹر حضرات خفیہ ہسپتالوں میں جا جا کر باغیوں کا علاج بھی کرتے رہے۔

مسز چودھری نے مجھے بتایا کہ بنگلہ دیش کے آزاد ہونے کے بعد، صدر ابو سعید چودھری، نے انھیں بلوایا اور ان سے پوچھا کہ آپ کے خیال میں آپ کے گھر میں زمینی منزل پر البدر اور بالائی منزلوں پر مکتی جودھا کے کارکنوں کے ساتھ کیا کیا جارہا تھا۔ مسز چودھری کے پاس نہ تو اس وقت ان کے لیے کوئی جواب تھا اور نہ مجھے وہ اس کا کوئی جواز پیش کر پائیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مولانا کو ان کے گھر لانے والے پڑوسی کی نیت صاف تھی یا وہ البدر کی ان سرگرمیوں سے آگاہ تھے۔ مسز چودھری وثوق سے کچھ نہ بتا سکیں— کیونکہ ان کے تعلقات پڑوسیوں سے اچھے تھے اور مستقبل کے صدر نذر الاسلام کو مارچ میں فرار کرانے کے لیے انہی کی اہلیہ کا برقع مانگا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہو پائی کہ چودھری صاحب نے اپنے بن بلائے مہمان کو کہیں اور جانے کے لیے کیوں نہ کہا یا اپنی باغی حامی سرگرمیاں کسی اور مقام پر منتقل کیوں نہ کیں؟ جب بھارت اور پاکستان میں باقاعدہ جنگ چھڑنے والی تھی اس دوران انھوں نے اس بات کا قصد کیا کہ کسی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائیں لیکن انھیں اس بات کا موقع ہی نہ مل پایا۔ اس بھولے پن اور سادگی کا اندازہ آپ کو اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک آپ مسز چودھری سے خود ملاقات نہ کرلیں۔ اگر ان کے شوہر بھی ایسے ہی تھے تو مذکورہ حالات ذرہ بھر تعجب خیز نہ تھے۔

مولانا عبدالمنان، ڈاکٹر چودھری سے ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور مصیبت میں کام آنے پر تہہ دل سے ان کے مشکور تھے، اور کہتے تھے کہ اگر انھیں کوئی پریشانی ہوئی تو وہ ان کی مدد کے لیے آجائیں گے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب تک وہ وہاں ہیں اس نیک بخت ڈاکٹر پر کوئی پریشانی نہ آنے دیں گے۔

مسز چودھری بتاتی ہیں کہ ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کی دوپہر، ڈھاکہ بھارتی طیاروں کی شدید بمباری کی زد میں تھا۔ ایک چھوٹی سی بس مولانا کے گھر کے دروازے پر آکر رکی۔ ان کے گھر اکثر

گاڑیاں آیا جایا کرتی تھیں اس لیے چودھری صاحب کو اس بات سے کوئی پریشانی لاحق نہ تھی۔ لیکن اس مرتبہ البدر کے دو مسلح رضا کاروں نے گھر میں داخل ہونا چاہا۔ ڈاکٹر چودھری نے کئی مرتبہ مولانا کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن مولانا دروازہ کھولتے ہی نہ تھے۔ وہ اندر ہی اندر سے کہتے، ''آپ جائیں میں ہوں نا''۔ وہ دونوں رضا کار ڈاکٹر صاحب کو اس چھوٹی سی بس میں لے کر چلے گئے۔ وہ گھر میں عموماً پہنی جانے والی شرٹ اور لنگی[۲] میں ملبوس تھے۔ مسز چودھری کہتی ہیں کہ انھوں نے مولانا سے اپیل کی کہ وہ دخل اندازی کریں، لیکن مولانا نے کچھ نہ کیا۔ مولانا نے کہا کہ وہ جوان ان کے طالب علم تھے اور وہ ڈاکٹر چودھری، ڈاکٹر فضل ربی اور دیگر ڈاکٹروں کو علاج معالجے کے لیے لے کر جا رہے تھے۔ ڈاکٹر چودھری اس رات گھر لوٹ کر نہ آئے۔ مسز ربی کو فون کرنے پر معلوم ہوا کہ اسی انداز سے اُسی وقت ڈاکٹر ربی کو بھی لے جایا گیا تھا۔

اگلے دن، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان آرمی نے بھارتی آرمی کے سامنے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیے۔ جنگ ختم ہوئی اور بنگلہ دیش آزاد ہو گیا۔ گلیاں بنگال کی فتح کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ مسز چودھری نے اپنے ہاں کام کرنے والے دو لڑکوں کو دوڑایا کہ ان کے دیور حافظ کو ڈھونڈ کر لائیں۔ فون کام نہیں کر رہا تھا۔ لڑکے دوڑتے ہوئے واپس آ گئے کیونکہ گلیوں میں جگہ جگہ فائرنگ ہو رہی تھی۔

مسز چودھری بتاتی ہیں کہ تھوڑی ہی دیر میں مولانا منان ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی لیے بالائی منزل پہ آ گئے اور ایک مرتبہ پھر پناہ مانگنے لگے — انھوں نے کہا ''وہ'' (بنگالی حریت پسند) انھیں مار ڈالیں گے۔ مسز چودھری نے انھیں ڈائننگ روم میں جانے کو کہا جہاں وہ ڈائننگ ٹیبل کے نیچے جا چھپے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مسلح مکتی جودھا آیا اور پوچھنے لگا، ''کہاں ہے وہ ذلیل جس نے علیم بھائی کو مارا تھا؟'' مسز چودھری خاموش کھڑی تھیں۔ مولانا وہاں نہ ملے — وہ آنکھ بچا کر وہاں سے نکل چکے تھے۔

ڈاکٹر چودھری کے بھائی حافظ بالآخر ۱۷ دسمبر کو گھر آ پہنچے۔ یہ سب لوگ ڈاکٹر چودھری کی تلاش میں نکل پڑے لیکن ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بالآخر ۱۸ دسمبر کو اینٹوں کے ایک بھٹے پر راجر بازار میں ان کی لاش بہت سے دیگر مشہور دانشوروں کی لاشوں کے ساتھ پڑی ملی جنھیں تحریک آزادی کی حمایت کی پاداش میں موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ ان سب کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے گئے تھے اور ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں ۱۶-۱۵ دسمبر کی رات ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ باقی متاثرین کے خاندانوں نے بھی یہی بتایا کہ ان کے گھروں پر البدر نامی تنظیم کے لوگ

مٹی میں لت پت ایک گاڑی میں آئے تھے اور ان کے مردوں کو اس طرح اٹھا کر لے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کی لاشیں تو کبھی بھی نہ مل سکیں۔

مسز چودھری بیان کرتی ہیں کہ ڈاکٹر علیم چودھری کے سینے پر گولیوں کے کئی نشانات تھے، اور ان کی کن پٹی اور پیٹ کے نیچے کئی زخم تھے گویا انھیں بندوق پر لگے خنجر سے زخم لگائے گئے ہوں۔ انھوں نے اب تک وہ لنگی، شرٹ اور واسکٹ پہن رکھی تھی جس میں انھیں اٹھایا گیا تھا۔ مسز چودھری نے دیکھا کہ ان کا چہرہ عجیب انداز میں کالا پڑ چکا تھا — شاید اس لیے کہ ان کی لاش پانی کے ایک تالاب میں دو دن تک منہ کے بل اوندھی پڑی رہی تھی۔ تولیے کے ایک کپڑے کو ان کی آنکھیں باندھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور وہی کپڑا ان کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

دسمبر میں قتل عام

ڈیتھ اسکواڈ کی طرز پر آزادی کے حامی دانشوروں اور پیشہ ورانہ افراد کا جنگ کے آخری لمحات میں قتل عام ۱۹۷۱ء کے تصادم کا ایک تاریک ترین باب ہے۔[۴] بہت سے سوالات کہ یہ سب کچھ کس نے کروایا اور کیوں؟ اور یہ کہ اس انداز سے کتنے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا؟ تشنہ ہی رہ گئے۔ بنگلہ دیش میں بھی اس سلسلے میں سرکاری سطح پر کوئی تفتیش نہیں ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر علیم چودھری اور دیگر مغوی افراد کی کارروائیوں میں پائی جانے والی مماثلت اور ایسی کارروائیوں سے واحد زندہ بچ جانے والے شخص کے بیانات سے کافی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں۔

تمام متاثرین کو دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ان کے گھروں سے اغوا کیا گیا اور اکثریت کا اغوا ۱۴-۱۵ دسمبر کو عمل میں آیا، ان بنگالی خاندانوں کے مطابق اغواء کار مسلح بنگالی نوجوان تھے جو البدر نام تنظیم سے منسلک تھے اور ایک چھوٹی سی بس میں آتے تھے۔ اغواء ہونے والوں میں سے کئی افراد کی لاشیں تین چار دن بعد راجر بازار میں اینٹوں کے بھٹے پر پڑی ملیں۔ تمام لاشوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھے گئے تھے۔ چند افراد کی لاشیں لاپتہ رہیں یا ان کی شناخت نہ ہو سکی۔

دسمبر میں یہ قتلِ عام کس نے اور کیوں کیا؟ بنگلہ دیش میں بہت سے لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دسمبر میں آزادی کے حامی ان دانشوروں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ پاکستان آرمی کے میجر جنرل راؤ فرمان علی نے بنایا تھا۔ ایسا بنیادی طور پر اس لیے تھا کہ آزادی کے بعد بنگلہ دیش حکومت کو مبینہ طور پر ان دانشوروں کی ایک فہرست ملی تھی جو میجر جنرل راؤ فرمان علی نے بنائی تھی۔

میجر جنرل راؤ فرمان علی ۱۹۷۱ء کے آپریشن کرنے والے افراد میں سب سے زیادہ متنازع شخصیت تھے جو کہ نہ صرف مشرقی پاکستان میں سول مارشل لاء ایڈمنسٹریشن کے انچارج تھے بلکہ اس تمام عرصے کے دوران مشرقی پاکستان کے گورنروں کے مشیر بھی رہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے دوران انھوں نے اپنا ایک علیحدہ مواصلاتی نظام بنا رکھا تھا جس سے وہ ہیڈ کوارٹر رابطہ کیا کرتے تھے، اور انھوں نے وقت سے پہلے ہی بھارتی آرمی کو ہتھیار ڈالنے کی اطلاع بھی دے دی تھی، جبکہ یہ بات مشرقی کمانڈر جنرل نیازی کے علم میں بھی نہ تھی۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی نے ایسا کیوں کیاں تھا؟ آزادی کے حامی بنگلہ دیشی لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان آرمی کے افسران اور پاکستان کے بنگالی حامیوں نے اس بات کا تہیہ کر رکھا تھا کہ بنگلہ دیش کی نومولود ریاست کو ناکارہ بنانے کی غرض سے اسے دانشوروں سے محروم کر دیا جائے۔

جنگ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کی جانب سے بنائے جانے والے حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ میں اس بات کا ذکر ہے کہ میجر جنرل فرمان علی، لیفٹیننٹ جنرل نیازی اور ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل جمشید سے ان دانشوروں کے مبینہ قتل عام کی بابت تفتیش کی گئی تھی۔ ان تینوں کے بیان کے مطابق تقریباً ۹-۱۰ دسمبر کے لگ بھگ ایک میٹنگ کی گئی تھی جس میں مختلف ایجنسیوں کی جانب سے تیار کی گئی ایک فہرست کے مطابق چند افراد کی گرفتاری عمل میں لائی جانی تھی، اس دوران ڈھاکہ میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی کسی بھی گرفتاری کے حق میں نہ تھے؛ لیفٹیننٹ جنرل نیازی کے مطابق ان کے پاس آنے والی فہرست باغی رہنماؤں کی تھی نہ کہ دانشوروں کی اور یہ فہرست مقامی کمانڈروں نے تیار کی تھی؛ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان کے مطابق یہ قابلِ عمل منصوبہ نہ تھا اس لیے وہ اس کے خلاف تھے۔ ان تینوں کے بیانات کے مطابق جنگ کے آخری دنوں میں مارے جانے والے دانشوروں کے اغواء اور قتل سے آرمی کا کوئی تعلق نہ تھا۔[۵]

اگر میجر جنرل فرمان علی کے ہاتھ کی تحریر کردہ ان افراد کی فہرست مل بھی جاتی ہے جو "آزادی کے حامیوں" میں سے تھے تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فہرست کا اس طرح مل جانا اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ میجر جنرل فرمان علی ہی اس منصوبے کے ماسٹر مائنڈ تھے یا وہ کچھ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دسمبر کے دوسرے ہفتے میں پاک فوج جنگ میں مصروف تھی، اور اسے شکست ہو رہی تھی، بھارت کے ساتھ بھی محاذ کھلا ہوا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آرمی کی جانب سے بنائے گئے رضا کار گروپ البدر جنگ کے ان آخری دنوں میں اپنے طور پر ہی اس قسم کی کارروائیوں میں ملوث رہے

ہوں۔ انھیں کسی فہرست تک رسائی حاصل ہوگئی ہوگی یا پھر انھوں نے اپنی ہی کوئی فہرست بنالی ہوگی، آخر کار یہ لوگ ہی تو باغیوں کے خلاف مختلف ایجنسیوں کو معلومات فراہم کیا کرتے تھے۔ اس بارے میں صحیح معلومات کا اندازہ اس وقت ہوسکتا ہے جب یہ پتہ لگایا جاسکے کہ ان کارروائیوں میں کون ملوث تھا اور ان کا تعاون حاصل ہوسکے۔ اس سلسلے میں عدالتی کارروائی ہی مناسب ہوسکتی ہے اور اس تعاون کے بدلے ان لوگوں کو نہ صرف سیکیورٹی فراہم کی جائے بلکہ انھیں یہ بھی یقین دلایا جائے کہ ان پر کسی قسم کی سزا کا اطلاق نہیں ہوگا۔

اغواء کیے جانے والے افراد کے گھر والے ایک ہی بات کرتے ہیں — اغواء کار البدر کے کارکن تھے، ان کے چہرے رومال سے آدھے ڈھکے ہوتے تھے اور مٹی سے لت پت ایک چھوٹی بس میں وہ لوگوں کو اغواء کر کے لے جایا کرتے تھے۔ متاثرہ خاندانوں سے یہ بات بھی پتہ لگتی ہے کہ اغواء کار بذات خود بھی بنگالی ہی تھے۔[6] اس طرح راجر بازار میں زندہ بچ جانے والے واحد شخص کے بیان کے مطابق بھی بنگالی دانشوروں اور پیشہ وروں کو اغوا اور قتل کرنے والے تمام افراد بنگالی ہی تھے۔[7]

ڈاکٹر علیم چودھری کے گھر والے مولانا عبدالمنان کو ان کے قتل کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مولانا عبدالمنان جنگ کے بعد روپوش ہوگئے اور حکومت کی جانب سے ان کی تصویر کے ساتھ ''مطلوب ہے'' کے پوسٹر پورے بنگلہ دیش میں بانٹے گئے۔ اسے تلاش کرلیا گیا اور رہائی سے قبل کچھ عرصہ تحویل میں رکھا گیا۔ چودھری صاحب کے گھر والے بتاتے ہیں کہ محض قتل کے الزام میں ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا تھا کیونکہ انھوں نے نہ تو ذاتی طور پر ڈاکٹر صاحب کو اغوا کیا تھا اور نہ ہی قتل کیا تھا — نیز ان سارے واقعات کے دوران وہ بذات خود چودھری صاحب کے گھر پر ہی موجود تھے۔ سیاسی مخالفین کو موت کے گھاٹ اتارنے کے اس منصوبے کو صرف جوڈیشل انکوائری کے ذریعے ہی بے نقاب کیا جانا ممکن ہے۔ مولانا پر زیادہ سے زیادہ یہ الزام عائد کیا جاسکتا ہے کہ اپنے دعوے کے باوجود وہ اس شخص ڈاکٹر چودھری کو بچانے میں ناکام رہے جس نے مشکل وقت میں اسے جائے پناہ فراہم کی تھی۔

مولانا عبدالمنان نے ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی آزادی کی مخالفت کی تھی، لیکن آزاد بنگلہ دیش میں بہت خوش حال نظر آتے ہیں۔ ڈھاکہ میں گھومتے ہوئے میں نے کئی اشتہاری بورڈوں پر ایک اخبار کا نام دیکھا — معلوم ہوا کہ اس اخبار کے مالک مولانا عبدالمنان ہیں۔ وہ ایک بھرپور سیاسی اور عوامی زندگی گزار رہے تھے اور بنگلہ دیش حکومت میں وفاقی وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔ شیامولی

نسرین چودھری مسلسل یہ مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ ان کے شوہر کے قاتل کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے — ان کے نرم خو اعصاب دراصل فولادی قوت کے حامل ہیں۔ مسز چودھری نے کئی مرتبہ علی الاعلان اس بات کا اظہار کیا کہ مولانا ہی اس کے شوہر کے قاتل ہیں لیکن انھوں نے مجھے بتایا کہ مولانا نے انھیں اور ان کی بیٹی کو ایسا کرنے کے بدلے میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔[8]

لوگوں کو اغواء کیے جانے اور ان کی لاشیں منظر عام پر آنے کے درمیانی عرصہ میں کیا ہوتا رہا؟ جن افراد کو بس میں اغوا کیا گیا ان پر کیا گزری اس کا ایک اکاؤنٹنٹ دلاور حسین کے بیان سے پتہ چلتا ہے جو کہ راجر بازار قتل عام میں زندہ بچنے والا واحد شخص ہے۔ حسین اغواء کیے جانے والے دیگر افراد کی طرح ممتاز دانشور نہ تھا اور اس بات کا بھی صحیح طرح علم نہ ہو سکا کہ آخر اسے کیوں اغوا کیا گیا۔ حسین لکھتے ہیں کہ ۱۴ دسمبر کی صبح انھیں ان کے گھر شانتی باغ سے اغواء کر کے ایک بس میں بیٹھا دیا گیا جس میں پڑوس میں واقع ہاسٹل سے اغواء کیے گئے ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ کر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ بس کئی مرتبہ رکی اور کئی لوگوں کو اس میں اغواء کیا گیا۔

منزل مقصود پر پہنچ کر بس رکی — حسین کی آنکھوں پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی — انھیں سہارا دے کر سیڑھیوں پر چڑھایا گیا اور اوپر لے جا کر ایک کمرے میں دھکیل دیا گیا جہاں وہ پہلے سے موجود کئی دیگر افراد پر جا گرے۔ وہ زاروقطار رو رہے تھے کہ کسی نے ان کی آنکھوں سے پٹی کھولی اور ان کے ہاتھوں کو آزاد کیا۔ حسین کے مطابق جس شخص نے اس کے ہاتھ کھولے وہ آٹھ یا نو سال کا لڑکا تھا۔ بچے کے ہاتھوں پر زخموں کے نشانات تھے اور اس کے ہاتھ سوجے ہوئے بھی تھے۔ فرش پر خون اور خون آلود کپڑے پڑے ہوئے تھے کمرے میں موجود تمام افراد زخمی تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان تمام لوگوں پر تشدد کیا گیا تھا۔ حسین کے مطابق اس لڑکے نے اس کے ہاتھ ذرا ڈھیلے کر کے دوبارہ باندھ دیئے اور اس کی آنکھوں کی پٹی ایسے باندھی کہ وہ اس میں سے دیکھ سکے۔

شام کے وقت مزید افراد کو اغواء کر کے لایا گیا اور تین چار اغواء کار وہاں آ کر لوگوں سے سوالات پوچھنے لگے۔ حسین کو یوں لگا کہ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسروں، ڈاکٹروں اور صحافیوں جیسی شخصیتوں کے درمیان موجود ہے۔ تمام گفتگو بنگالی زبان میں ہی ہوتی رہی — اس دوران اغوا کار مار پیٹ اور گالم گلوچ بھی کرتے رہے۔ پھر اغوا کار چلے گئے۔ بعد ازاں رات کو تمام مغویان کو ایک مرتبہ پھر سہارا دیکر سیڑھیوں سے نیچے لے جایا گیا اور انھیں تین بسوں میں سوار کر دیا گیا۔ بس

ایک مقام پر جاکر رک گئی اور ان سب کو کسی مقام کی جانب پیدل روانہ کیا گیا۔ حسین نے دیکھا کہ قریب ہی برگد کا ایک درخت اور جھیل تھی اور تقریباً ۱۴۰-۱۳۰ قیدی پہلے ہی وہاں موجود تھے۔[۹]

حسین کے مطابق البدر کے کارکنوں نے قیدیوں کے ہاتھ رسیوں سے باندھنا شروع کر دیئے۔ حسین کی واسکٹ کو پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص کی واسکٹ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ ایک قیدی پیچھے سے چلا کر بولا کہ ''تم بنگالی ہو پھر بھی ہمیں مار رہے ہو!'' قاتلوں نے گروپوں کی صورت میں قیدیوں کو ایک خالی مقام پر پہنچا کر بندوقوں پر لگی سنگینوں اور گولیوں سے مارنا شروع کر دیا۔ حسین لکھتے ہیں کہ جس دوران وہ لوگوں کو قتل کرنے میں مصروف تھے انھوں نے واسکٹ کی گرہ کھولی اور اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹا کر جان بچانے کے لیے دوڑ لگادی۔ حسین نے دوڑتے ہوئے سنا کہ وہ لوگ چلا رہے تھے اور فائرنگ کی آواز بھی آئی لیکن وہ کیچڑ اور پانی میں گرتے پڑتے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ باقی ماندہ رات حسین نے دریا کے کنارے ایک جگہ پر چھپ کر گزاری۔ صبح ہوتے ہی وہ ایک گاؤں کی جانب چلنا شروع ہوگیا۔ اس کے بیان کردہ منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مقام راجر بازار کا گھاٹ تھا۔ دلاور حسین کے بیان کی تصدیق کے لیے ہمارے پاس کوئی تحریر یا ذریعہ موجود نہیں ہے۔

قتل عام کے متعلق جھوٹی رپورٹیں۔ یہ قتل عام جتنا وحشت ناک تھا، اسے بنگلہ دیش میں شائع ہونے والی اور پھیلائی جانے والی کچھ رپورٹوں نے مزید بھیانک بنا دیا تھا، جن کی وجہ سے نشانہ بننے والے افراد کے خاندانوں کو مزید صدمہ پہنچا۔ اس کے علاوہ تیار کی جانے والی دستاویزات میں بھی حقائق سے روگردانی ہوئی۔ لبریشن وار میوزیم ڈھاکہ کے ڈائریکٹر نے رپورٹس کے مطابق مقتولین پر کیے جانے والے ظلم وستم کے مخصوص اور سنگین طریقے میرے سامنے بیان کیے — ماہر امراض چشم ڈاکٹر چودھری کی آنکھیں نکال دی گئیں اور امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر فضل ربی کا دل سینے سے نکال دیا گیا، وغیرہ وغیرہ — اخبارات میں ایسی کئی رپورٹیں شائع کی گئیں اور ان موضوعات پر بنگلہ دیش میں کتابیں بھی لکھی گئیں — لبریشن اور میوزیم کے ڈائریکٹر نے مجھے بھی ایسی ہی ایک کتاب کی ایک کاپی فراہم کی۔

میں پہلے ہی مسز چودھری سے ملاقات کر چکی تھی لیکن انھوں نے ڈاکٹر چودھری کی آنکھوں پر ایسے کسی زخم کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ان سے دوبارہ پوچھا تھا کہ وہ ذہن پر زور ڈال کر یہ بتائیں کہ ان کے جسم پر زخموں کے کیسے نشانات تھے اور یہ پوچھنے پر میں نے ان سے معذرت بھی کی تھی۔ مسز چودھری نے کہا کہ انھوں نے برا نہیں مانا اور انھوں نے بڑے ہی مثبت انداز میں

زخموں کی تمام روداد دہرا دی جو کہ ان کی تحریروں میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ڈاکٹر چودھری کی آنکھوں پر زخموں کے کوئی نشانات نہ تھے۔ راجر بازار سے ہی ملنے والی ڈاکٹر فضل ربی کی لاش کے بارے میں مسز ربی تحریر کرتی ہیں: "بائیں گال اور ماتھے پر بائیں جانب گولیوں کے نشانات تھے۔ سینے پر گولیوں کے کئی نشانات تھے — میں نے گنے نہیں تھے کہ نشانات کتنے تھے۔ لیکن یہ جھوٹ ہے کہ ان کا سینہ چیرا گیا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے چھو کر ان کا سینہ دیکھا تھا"[10] ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مسز ربی کو ان جھوٹی خبروں کے بارے میں علم تھا اور انھوں نے اخبارات میں شائع ہونے والی جھوٹی کہانیوں کی تردید اپنی تحریریوں کے ذریعے کئی سال پہلے ہی کردی تھی۔ اس کے باوجود بھی ڈھاکہ کے ذمہ دار حلقوں میں اس قسم کی جھوٹی کہانیاں بلا ضرورت پندرہ سال بعد تک گردش کرتی رہیں۔[11]

دسمبر ۱۹۷۱ میں کیا جانے والا دیگر قتل عام۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں کیے جانے والے بہت سے حملے اور بہت سا قتل عام "آزادی" کے لٹریچر میں موجود نہیں ہے۔ ان میں سے ایسی ہی ایک رپورٹ تصاویر کے ساتھ بین الاقوامی اخبارات میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ یہ رپورٹ مکتی باہنی کے کمانڈر ٹنگیل سے تعلق رکھنے والے قادر (ٹائیگر) صدیقی ٹنگیلی اور اس کے مکتی جودھا گروپ کی جانب سے ڈھاکہ کے مرکز میں عام شہریوں کو چاقو مارنے سے متعلق ہے۔

"پاکستان آرمی کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کے بعد پہلی عوامی ریلی میں بنگالیوں کے ایک ہجوم کے سامنے سرعام چار سو بلین افراد کو مارا پیٹا گیا اور ان کو چاقو مار مار کر آہستہ آہستہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا"، یہ خبر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو شائع ہونے والے ڈیلی ٹیلیگراف کے صفحہ اول پر شائع کی گئی۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا کہ "ہفتے کے روز ریلی میں شامل مکتی فوج کے رہنماؤں میں سے کوئی بھی شخص ان چاروں کے خلاف واضح الزامات نہ بتا سکا۔ یہ تمام لوگ بنگالی تھے اور ان پر 'انصاف کے ساتھ مقدمہ' چلانے کا وعدہ کیا گیا تھا"۔ جس کے ساتھ موجود تصویر کے نیچے یہ الفاظ درج تھے "ڈھاکہ میں چھٹی کے دن ایک قیدی کو چاقوؤں کے وار سے مارنے سے پہلے اسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور گوریلے اس کو دیکھ کر قہقہے لگا رہے ہیں"۔

اُسی دن دی ٹائمز کی رپورٹ ان الفاظ کے ساتھ شائع ہوئی "نماز کے بعد مکتی باہنی کے کارکن قیدیوں کو چاقو مارتے ہوئے۔" اس واقعے کے حوالے سے تصاویر اور تحریریں اوریانا فالیسی کے شیخ مجیب الرحمٰن سے متعلق فیچر مشمولہ L' Europeo کے ۲۴ فروری ۱۹۷۴ کے شمارے میں موجود ہیں۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں شامل چند تصاویر میں یہ مناظر بھی دکھائے گئے کہ مکتی باہنی

کے کارکن قیدیوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے سے قبل ان کی آنکھوں کو سگریٹ سے داغ رہے ہیں۔اس قتل عام کو دیکھنے کے لیے ایک بڑا ہجوم موجود ہے اور ان میں سے چندلوگ مسکرار ہے ہیں۔دیکھنے والوں میں بچے بھی شامل ہیں اور متاثرین میں ایک نوجوان لڑکا بھی ہے۔[۱۲] اس واقعہ کی رپورٹ کے بعد بھارتی آرمی نے صدیقی کو''گرفتار'' کرلیا۔[۱۳]

۱۹۷۱ء کی جنگ پر شائع ہونے والی دو جلدوں پر مشتمل سوانح میں قادر صدیقی نے اس قتل عام کی وضاحت پیش کی ہے۔اس کے دعوے کے مطابق جب وہ عوامی ریلی کے ساتھ راستے سے گزر رہا تھا تو اس نے اور اس کے آدمیوں نے ''غیر بنگالی نوجوان خواتین ان کے ضعیف والد اور ۵۰۰۰ روپے بچائے تھے جن کو انھی کی گاڑی میں ۴ افراد ''اغوا'' کر کے لے جا رہے تھے''۔ اغوا کاروں کی گاڑی سے ۵۹۰۰۰ روپے نقد بھی برآمد ہوئے تھے ۔انھوں نے ان چاروں اغواء کاروں کو باندھ کر ریلی کے سامنے لانے کا حکم دیا۔اس ریلی میں شیخ مجیب کا بیٹا جمال بھی اسٹیج پر قادر صدیقی کے ساتھ موجود تھا۔قادر صدیقی کا کہنا ہے کہ ریلی کے اختتام پر اس نے عوام سے پوچھا کہ پکڑے جانے والے چاروں افراد کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔اس پر پورے مجمعے نے چیخ چیخ کر کہا کہ انھیں ماردیا جائے۔اس لیے وہ مجبور تھا اور لوگوں کے مجمع اور بین الاقوامی پریس کے سامنے ان لوگوں کو سنگینیں اور گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔صدیقی لکھتے ہیں کہ ''خواتین کو لوٹنے اوراغواء کرنے والوں'' کو سرعام چاقوؤں کے وار کر کے ہلاک کرنے پر اس کے خلاف بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کی تنقید ناجائز تھی۔اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ لوگوں کو اس طرح پُرتشدد طریقے سے ماورائے عدالت قتل کر دینا، بالکل درست تھا۔[۱۴]

ڈھاکہ میں دانشوروں کو اغواء کے بعد قتل کیے جانے والوں میں سے زندہ بچ جانے والے ایک شخص کی کہانی کچھ اس انداز سے شروع ہوتی ہے کہ ''میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ میری بیوی اور میرے کزن سے بحث کررہے تھے اور اوپر آنے کی کوشش کررہے تھے...... ان میں سے ایک شخص مجھے کالر سے پکڑ کر سیڑھیوں سے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے گیا ...... نیچے کھڑی ایک جیپ میں ڈال دیا......''۔اغواء کاروں نے منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد ''مجھے دوسری منزل پر ایک بڑے سے کمرے میں ڈال دیا...... جو نوجوان مجھے کالر سے پکڑ کر لے جارہا تھا اس نے اچانک پوری قوت سے میرے گال پر تھپڑ رسید کر دیا...... میری جیکٹ، شرٹ، بنیان اور گھڑی اُتار لی گئی اور میرا چشمہ بھی چھین لیا گیا۔انھوں نے میرے ہی رومال سے میری آنکھوں کے اوپر پٹی باندھ دی اور میرے دونوں ہاتھ میری کمر کے پیچھے باندھ دیئے۔اس کے بعد چمڑے کی ایک بیلٹ سے مجھے مارنے لگے،اس کے

ساتھ ساتھ وہ کسی سخت چیز سے میری انگلیوں کے جوڑوں پر بھی چوٹ مارتے تھے۔''

اسی حالت میں رات گزارنے کے بعد قیدی کو علی الصبح جیپ کے پیچھے چھپا کر کسی نامعلوم مقام پر لے جایا گیا۔ ہاتھ پیر بندھے، منہ میں کپڑا لگا اور آنکھوں پر پٹی بندھی حالت میں انھیں سینے پر تین بار چاقو مارا گیا اور اس کے بعد ریڑھ کی ہڈی پر ایسی کاری ضرب لگائی گئی کہ وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا۔ ان کو مردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن معجزاتی طور پر ان کی جان بچ گئی۔ جب ایک راہگیر ان کی مدد کرنے کے لیے وہاں آیا تو اس نے دیکھا کہ ان کی یونیورسٹی کے ایک ساتھی بھی قریب ہی زخمی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہ واقعہ پُر اسرار طور پر ۱۴-۱۵ دسمبر کے دوران دانشوروں کو اغواء کر کے قتل کرنے کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے لیکن یہ بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ۱۹-۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیش آیا۔ اس واقعہ میں بال بال بچ جانے والے شخص سید سجاد حسین تھے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور انگریزی کے پروفیسر تھے۔ نیز وہ راج شاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے تھے۔ ان کے ساتھ ملنے والے دوسرے پروفیسر صاحب ڈاکٹر حسن زمان تھے۔ اس مرتبہ حملہ آور پاکستان کے حامی ''البدر'' کے کارکنان نہیں تھے کیونکہ وہ تو خود چھپتے پھر رہے تھے، بلکہ ڈاکٹر حسین کے مطابق یہ لوگ آزادی کے حامی مکتی جودھا تھے، جن میں سے بیشتر ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالبعلم تھے۔

ڈاکٹر حسین ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بننے سے قبل ۱۹۶۹ سے ۱۹۷۱ کے وسط تک راج شاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے، اور متحدہ پاکستان کے مضبوط حامیوں میں سے تھے۔ ان کو قتل کرنے کی کوشش کرنے والے بنگالی نوجوان تھے اور البدر کے کارکن کی طرح یہ بھی ان کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کا طریقہ کار سیاسی مخالفین کے خلاف بعینہٖ وہی تھا جو البدر نے اپنا رکھا تھا۔ جیسے البدر والے آزادی کے حامیوں کو — پاکستان کا — غدار قرار دیتے تھے، اسی طرح یہ لوگ بھی متحدہ پاکستان کے حامی ڈاکٹر حسین جیسے دانشوروں کو غدار قرار دیتے تھے: اس معاملے میں، انھیں بنگلہ دیش کی آزادی کے خلاف غدار کہا جاتا تھا۔ ان کے مطابق ''حملہ آور طلبہ نے ان سے کہا کہ تم ناقابل معافی سور ہو اور تم نے توبہ نہیں کی''۔ اس لیے تم اس لائق ہو کہ تم جیسے غدار کو گولی ماردی جائے''۔ ''اس کے علاوہ انھوں نے یہ الزامات بھی لگائے کہ میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کی موت کا ذمہ دار ہوں اور ولیمز ہال سے فوجیوں کو لڑکیاں فراہم کرتا ہوں۔ یہ سن کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں تو بے شک ماردیں لیکن ان کے الزامات سراسر بے بنیاد ہیں اور یہ کہ میں ہر قسم کے مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے تیار

ہوں''۔لیکن وہ نوجوان جمہوریت، آزاد معاشرہ اور انصاف کے تقاضوں پر ذرہ بھر بھی یقین نہ رکھتے تھے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ البدر اور مکتی جودھا کے کارکن پڑھے لکھے بنگالی نوجوان تھے۔جس جگہ ڈاکٹر حسین کو قید میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا، وہ یونیورسٹی کیمپس کی سائنس انیکسی بلڈنگ تھی۔ انھیں جناح ایونیو پر گلستان سنیما کے سامنے مرنے کے لیے پھینک دیا گیا تھا۔[15]

گھاتک حملے اور قتل وغارت کی کارروائیاں۔ معروف بنگالی فلم ساز ظاہر ریحان کے اغواء کی کہانی بھی بڑی عجیب وغریب ہے۔ان کے ''لاپتہ'' ہونے اور مبینہ طور پر قتل ہونے کے بارے میں ہمیں بنگلہ دیش کی ''آزادی'' سے متعلق لٹریچر میں بھی حوالہ ملتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ریحان ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو لاپتہ ہوگیا تھا۔ان کی گمشدگی کا مدعا پاکستان آرمی پر نہیں ڈالا جاسکتا کیونکہ اس وقت پاکستان آرمی کے اہل کار بھارت میں جنگی قیدی کے طور پر موجود تھے اور نہ ہی اس کا الزام البدر پر لگایا جاسکتا ہے جو بذات خود زیرِ عتاب تھی۔جس وقت ریحان لاپتہ ہوئے، شیخ مجیب الرحمان وزیر اعظم بنگلہ دیش بن کر ایک ہیرو کی حیثیت سے واپس آچکے تھے۔

ریحان کے بھائی شہید اللہ قیصر بھی ۱۴-۱۵ دسمبر کو قتل ہونے والے آزادی کے حامی دانشوروں میں شامل تھے، پیشے کے اعتبار سے وہ ایک صحافی تھے۔ دونوں بھائی بائیں بازو کی سیاست سے وابستہ تھے۔شہید اللہ کو البدر کے کارکنوں نے دیگر افراد کی طرح ۱۴ دسمبر کو اغواء کرلیا تھا۔ان کی لاش ان کے گھر والوں تک نہیں پہنچ سکی۔ظاہر ریحان اپنے بھائی کی تلاش میں بھارت گیا، ۱۷ دسمبر کو واپس ڈھاکہ پہنچا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس کے بھائی کے ساتھ کیا ہوا۔اس نے ایک تفتیشی کمیٹی بھی تشکیل دی جس کا کام آزادی کے حامی دانشوروں اور پیشہ ور افراد کے قتل عام کا سراغ لگانا تھا۔ابھی یہ تفتیش جاری تھی کہ وہ خود بھی ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو لاپتہ ہوگئے۔[16]

بنگالیوں کے ہاتھوں ایک بار پھر بہاریوں کا قتل عام۔ کھلنہ جوٹ مل میں بنگالیوں کے ہاتھوں بہاری عورتوں، مردوں اور بچوں کے قتل عام کے ایک سال بعد شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے آزاد بنگلہ دیش میں ایک مرتبہ پھر بہاریوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔[17]

زندہ بچ جانے والے بہاریوں کے مطابق، ۱۰ مارچ ۱۹۷۲ کو صبح ۱۱ بجے سے دن ۱ بجے کے دوران نیو ٹاؤن کالونی کھلنہ میں جوٹ مل کے بہاری کارکنوں اور ان کے گھر والوں کا بنگالیوں نے محاصرہ کرلیا، اس کے بعد بنگالیوں نے بہاری مردوں،عورتوں اور بچوں کو ذبح کرنا شروع کردیا۔بہاریوں کے مطابق اس دن ملک کے کئی علاقوں میں غیر بنگالیوں پر اسی قسم کے حملے کیے گئے۔جوٹ مل میں کام کرنے والے بنگالی کارکنوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ اس دن

''سینکڑوں'' بہاریوں کو قتل کیا گیا، جبکہ زندہ بچ جانے والے بہاریوں سے بات کرنے کے بعد معلوم یہ ہوا کہ قتل کیے جانے والے افراد کی کل تعداد ۲۰ سے ۲۵ ہزار تھی۔ لہذا ایک محتاط اندازے کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس دن کئی ہزار بہاری مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔

دلچسپ طور پر بنگالی کارکنوں نے اولڈ ٹاؤن کالونی کے واقعات کا نیو ٹاؤن کالونی کے واقعات سے موزانہ کر کے بیان کرنا شروع کر دیا۔ ان کے مطابق اولڈ ٹاؤن کالونی میں منیجر ''رحمن صاحب'' بہاریوں کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے حالانکہ وہ خود بنگالی اور عوامی لیگ کے حامی تھے۔ جبکہ نیو ٹاؤن کالونی میں ''منیجر شاہد'' نے مکتی جودھا کو چند گھنٹوں کے لیے بہاریوں کے قتل عام کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور اس کے بعد حالات کو سنبھالنا شروع کیا۔

بعد ازاں جب بنگلہ دیش کی آرمی وہاں پہنچی تو زندہ بچ جانے افراد کو مہاجر کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ بہاریوں کے مطابق ریڈ کراس والے بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور انھوں نے قتل عام کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی صحافی بھی ان واقعات کی تفصیلات جاننے کے لیے وہاں پہنچنا شروع ہو گئے۔ جس دن کھلنہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، اسی دن پناہ گزین بہاریوں کے لیڈروں نے ڈھاکہ میں بھوک ہڑتال کی ہوئی تھی، جنھیں اب تک نہ تو پاکستان نے قبول کیا تھا اور نہ ہی بنگلہ دیش نے۔ میں نے جن دو کیمپوں کا دورہ کیا وہاں ہزاروں بہاری کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے اور کوئی ان کا پرسان حال نہ تھا۔ یہ لوگ ۱۹۷۱ کی جنگ میں اپنی دونوں قومیتیں کھو بیٹھے تھے۔

جنوبی ایشیاء میں سرحد بندیوں اور ایک بار پھر مزید سرحد بندیوں نے کھلنہ کے ان باسیوں کو ایک عجیب موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ ایک بہاری پرویز عالم خان آرمی میں تھے اور انھوں نے مکتی باہنی کے خلاف ۱۹۷۱ کی جنگ بھی لڑی تھی، لیکن وہ اب تک کھلنہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے افراد کی طرح پرویز عالم بھی پاکستان آرمی سے سخت نالاں ہیں، کیونکہ جنگ بندی کے بعد انھیں جنگی قیدیوں کے ساتھ نہیں لے جایا گیا بلکہ بنگلہ دیش ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے دیناج جیل پور کی جیل میں دو سال گزارے اور ان کی خوش قسمتی ہے کہ وہ زندہ سلامت رہے۔ انھوں نے کہا کہ جیل میں ان جیسے ۲۷ بہاری موجود تھے۔ پرویز عالم ایک ذہین انسان ہیں اور بطور مقامی رہنما کچھ کر دکھانے کا عزم رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کا ایک رشتہ دار بھارتی آرمی میں تھا جو جنگ کے اختتام پر کھلنہ میں تعینات تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو بھارت لے گیا۔ اس لیے ۱۰ مارچ ۱۹۷۲ء کو نیو ٹاؤن میں ہونے والے قتل عام سے اس کے خاندان والے محفوظ رہے۔ اس نے مزید کہا کہ اس کے والد برطانوی فوج میں ملازم تھے اور ۱۹۴۷ میں پاکستان بننے کے بعد انھوں

نے مشرقی پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔

اُس وقت پاکستان کا قیام جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی سرزمین کے طور پر عمل میں آیا تھا۔ امید یہ تھی کہ برصغیر کے مشرقی علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے یہاں آجائیں گے۔ لیکن ۲۰ سال کے اندر یہ علاقہ لسانی تقسیم کا شکار ہوگیا۔ ۱۹۷۱ کے اختتام پر اس علاقے میں تین قومیں آباد تھیں لیکن مشرقی پاکستان کے بہاریوں کے لیے کوئی جائے پناہ میسر نہ آسکی۔

باب نہم:

الفاظ وتعداد

یادیں اور دل دہلا دینے والے قصے

"آپ کو یاد ہے جب انھوں نے کہا تھا کہ ۱۰۰۰ لاشیں ہیں اور ان کی قبریں بھی لیکن ہمیں ۲۰ بھی نہ ملیں"۔

—ہنری کسنجر۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ، ولیم راجرز سے بات کرتے ہوئے[1]

"دونوں جانب سے قوم پرست سیاست دانوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے ذاتی اختلافات کو دل دہلا دینے والی کہانیوں کے روپ میں پیش کیا تاکہ وہ خود کو معصوم ومظلوم اور مخالف کو نسل کش قاتل ثابت کر سکیں"۔

—مائیکل اگناتیف، Blood and Belonging۔[2]

الفاظ

بنگلہ دیش کی آزادی سے متعلق لٹریچر میں پاکستان آرمی کے لیے ایک اصطلاح "خان سینا" استعمال کی گئی ہے۔ "سینا" کا مطلب "فوج" یا "فوجی" ہے۔ جبکہ "خان" مسلمانوں میں استعمال ہونے والا ایک لقب ہے جو مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں ہی ملکوں میں مستعمل ہوسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کئی صدیوں قبل میرے ہی چند آباء واجداد اس لقب کو اپنا چکے ہیں۔[3] تاہم بنگلہ دیش کے لٹریچر میں "خان سینا" کی اصطلاح کو منفی معنویت کے ساتھ محض پاکستان آرمی کے لیے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اپنی تحقیق کے دوران میری ملاقات جتنے بھی پاکستان آرمی کے افسران سے

ہوئی وہ اس بات سے بے خبر نظر آئے کہ ۱۹۷۱ کے واقعات کے تناظر میں بنگلہ دیشی لوگ انھیں مجموعی طور پر ''خان سینا'' کی اصلاح سے موسوم کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کو بنگالی محض آپس میں اپنی ذاتی گفتگو میں استعمال کیا کرتے تھے۔

جبکہ دوسری جانب، تقریباً تمام مغربی پاکستانی افسران نے یہ بھی بتایا کہ بنگالی مجموعی طور پر انھیں شالا پنجابی کہہ کر پکارتے تھے خواہ ان میں سے کسی کا تعلق پنجاب سے ہو یا نہ ہو۔ اس کا غیر رسمی ترجمہ ''پنجابی کمینے'' کیا جا سکتا ہے۔[۲] البتہ ۱۹۷۱ کے تصادم سے متعلق شائع کردہ بنگالی لٹریچر میں پاکستانی فوجی اہلکاروں کو مختلف جانوروں سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ عموماً فوجیوں کو ''پنجابی کوکر'' ''پنجابی کتے'' کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس اصطلاح میں دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک جانب تو تمام فوجیوں کو ''پنجابی'' گردانا گیا ہے چاہے ان کا تعلق پنجاب سے ہو یا نہیں اور دوسری طرف کتے سے تشبیہ دے کر اپنی سخت نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔

دیگر القاب میں ''بور بور'' (وحشی)، ''دوشیو'' (ڈکیت)، ''نورو پیشاچ'' (بھوت)، ''نورو پوشو'' (جانور لوگ)، ''ہائینا'' شواپد'' (شیر)، وغیرہ ان ناموں کے ساتھ عموماً صفات کو استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ ''ہنکسر و ہائینا'' (درندہ ہائینا)۔ بنگالیوں پر ظلم ڈھاتے ہوئے مغربی پاکستانی فوجیوں کو ''خوشی مناتے'' اور ''کھلکھلا کر ہنستے ہوئے'' بھی بتایا گیا ہے تا کہ ولن کا ایک تاثر اُبھر سکے جیسا کہ بنگالی لوک ورثہ تھیٹر، ''جاترا''، میں دکھایا جاتا ہے۔ جو کہ انگریزی ادب میں پینٹومائم (Pantomime) سے قریب تر ہے جبکہ مغربی پاکستانی تحریروں میں بنگالیوں کے لیے ''شرپسند'' مکتی یا زیادہ سے زیادہ ''عوامی لیگی ٹھگ'' جیسے الفاظ ملتے ہیں۔

بنگلہ دیشی اور ہندوستانی تحریروں میں ۱۹۷۱ کی لڑائی کو ''مکتی جودھا'' یعنی ''حریت پسندوں'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض بنگالیوں کو ''خانہ جنگی'' کی اصطلاح سے سخت چڑ ہے ــ حالانکہ یہ اصطلاح حقیقت کے مطابق ہے اور بہت سے غیر ملکی دانشور اس اصطلاح کو استعمال بھی کرتے ہیں ــ اعتراض کرنے والوں کو غلط فہمی ہے کہ شاید اس اصطلاح کو استعمال کرنے سے ان کی ''جنگ آزادی'' کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ بالکل درست ہے کیونکہ چند لوگ پاکستان سے آزادی حاصل کرنے بنگلہ دیش کی آزاد ریاست قائم کرنے کے لیے ''خانہ جنگی'' میں مصروف تھے، جو پاکستان اور بھارت کے مابین ایک بین الاقوامی جنگ پر ختم ہوئی۔ اسی قسم کے اعتراضات ''مشرقی پاکستان'' اور ''بنگلہ دیش'' کے ناموں کو استعمال کرتے وقت بھی سامنے آتے ہیں۔ سال کے آخر میں جب تک بنگلہ دیش بننے کا باقاعدہ سرکاری طور پر اعلان کر نہ دیا گیا، اس وقت تک یہ

خطہ پاکستان کا ایک صوبہ ہی تھا۔

بنگالی باغیوں (حریت پسندوں) کو بنگالی تحریروں میں ''بہادر''، ''ہیرو''، ''بنگال کے ہلچل مچا دینے والے جوان'' اور پیار سے ''چھوٹے بدمعاش'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حکومتِ وقت کے حامی بنگالیوں کو ''رضا کار'' کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس نقطہ کی منفیت کو اس شدت سے استعمال کیا گیا کہ شیخ مجیب کو، جو کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ سے مغربی پاکستان میں بطور قیدی موجود تھے، بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وزیراعظم بننے کے لیے بنگلہ دیش جاتے ہوئے ؏ انتہائی جھنجھلاہٹ کے عالم میں پوچھنا پڑا، یہ ''رضا کار کیا ہے؟''، اس کے علاوہ پاکستان کے حامی بنگالیوں کو ''قاتلوں کا ساتھی'' اور ''دلال'' کہہ کر بھی پکارا جاتا تھا۔[6]

بنگلہ دیشی ادب میں پاکستانی فوج کو ''قابض فوج'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ بات حقیقت کے منافی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش پاکستان کا ایک صوبہ تھا، ایک ایسا ملک جو برصغیر کے مسلمانوں کا گھر تھا اور جس کے قیام کی خاطر خود مشرقی بنگال والوں نے بڑی قربانیاں دی تھیں۔ اس ملک کے دیگر حصوں کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی پاکستانی فوج تعینات تھی اور بذات خود بنگالی اس فوج میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں بنگالیوں نے خصوصی طور پر بنائی جانے والی بنگال رجمنٹ میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ جیسا کہ مغربی پاکستانی افسران مشرقی پاکستان میں تعینات رہے تھے بالکل اسی طرح بنگالی اہلکار بھی مغربی پاکستان میں تعینات رہتے تھے۔

وہ بنگالی جو مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے خواہش مند تھے پاکستان آرمی کو دشمن فوج بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن قابض فوج کی اصطلاح سے ایسا تاثر ملتا ہے گویا کسی غیر ممالک سے اچانک ہی فوج وہاں آکر بیٹھ گئی ہو اس قسم کے اقدامات سے تاریخ کے ریکارڈ میں بھی تحریف ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس بہت سے بنگالی ایسے بھی تھے جو کہ متحدہ پاکستان کے حامی تھے اور بہت سے بنگالی اہلکار پاکستانی فوج میں آخر تک نہ صرف خدمات سرانجام دیتے رہے بلکہ پاکستان کا دفاع کرتے رہے۔ ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان پر حملہ آور ہونے والی ایک ہی قوت تھی۔ یعنی بھارت۔

دشمن بطور بھوت

بنگالیوں کی جانب سے بنگلہ دیش کی آزادی کے تناظر میں حکومتی اہلکاروں کو بطور ''ولن'' پیش کرنے کے لیے بڑے دلچسپ انداز اپنائے گئے۔ ان میں سے ایک بصری آرٹ (visual art) بھی ہے۔

اسی دور میں جنرل یحییٰ خان کا کارٹون اسکیچ بہت یادگار ہے: گھورتی ہوئی آنکھوں اور ڈریکولا جیسے دانتوں کے ساتھ موصوف کو ایک بھیانک بلا کے بطور پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ بطور سیاسی کارٹون یہ خاکہ بہت خوب بنایا گیا تھا۔ بطور سیاہ پروپیگنڈہ یہ تکنیک کافی کارگر بھی ثابت ہوئی کیونکہ اسکی مدد سے جنرل یحییٰ خان، ان کی حکومت اور پوری آرمی کو بطور بھوت اور بلا عوام کے ذہنوں میں نقش کر دیا گیا۔

چونکہ جنرل یحییٰ خان فوجی حکومت کے سربراہ تھے اور بنگالیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے فوجی آپریشن کا فیصلہ بھی انھوں نے ہی کیا تھا اس لیے اس پروپیگنڈہ کی توپوں کا رخ بھی انہی کی جانب رہا۔ البتہ جیسا کہ پچھلے ابواب میں بھی ذکر کیا جاچکا ہے کہ ذاتی طور پر جنرل یحییٰ خان بنگالیوں سے کسی قسم کا بغض یا عناد نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ انھوں نے بنگالیوں کے ساتھ کئی لحاظ سے ہمدردی دکھائی۔ انھوں نے بنگالیوں کے ساتھ ناروا معاشی سلوک کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ اس کا مداوا کرنے کے لیے کوششیں بھی کیں، آرمی اور سول سروسز میں بنگالیوں کا کوٹہ بڑھایا اور انتخابات میں برابری کے اصول کو ختم کر کے فی کس فی ووٹ کا اصول لاگو کیا جس سے بنگالیوں کو انتخابات میں بہت فائدہ ہوا، انھوں نے نہ صرف شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کرنے پر رضامندی ظاہر کی بلکہ علی الاعلان انھیں ''مستقبل کا پاکستانی وزیر اعظم'' کہہ کر بھی پکارا۔

آزادی کے حامیوں کی طرف سے پاکستان آرمی کو بطور ظالم پیش کرنے کے لیے جو دیگر طریقے اپنائے گئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بلا ثبوت آرمی کے ظلم وتشدد کے قصے عام کیے گئے۔ آرمی کے کردار کو داغ دار کرنے کے لیے سویلین کو بلا امتیاز قتل کرنے، خواتین کی آبروریزی اور بالخصوص عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے جیسے الزامات کی بھرمار کر دی گئی۔ ہم گزشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ کئی مواقع پر آرمی کی جانب سے نہتے افراد کو قتل کیا بھی گیا جیسا کہ — ۲۶-۲۵ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں طلباء اور اسٹاف کا قتل عام، ۲۶ مارچ کو شنکھاری پارہ کا واقعہ، ۱۳ اپریل کو تھانہ پاڑہ، ۲۰ مئی کو چکنگر اور ۱۳ اکتوبر بوروئی ٹولہ کی مثالیں۔ ان تمام مثالوں میں آرمی کی جانب سی کی گئی کارروائی ایک ہی طرز عمل پر تھی کہ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر محض نوجوانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ ان مثالوں میں ماری جانے والی خواتین حادثاتی طور پر جاں بحق ہوئیں، جیسا کہ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں آکر ایک خاتون ہلاک ہوگئی۔

ان تمام واقعات میں دراصل آرمی کا ایک مخصوص گروپ پوری آرمی اور حکومت وقت کے لیے باعث شرم ثابت ہوا۔ تاہم، آرمی کو بطور ظالم پیش کرنے میں حقائق سے روگردانی کی گئی ہے۔

مرنے والوں کی تعداد میں مبالغہ آرائی سے کام لینے کے علاوہ حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ بعض اوقات اصل واقعات کو مسخ کر کے پیش کیا گیا تو بعض مثالوں میں من گھڑت کہانیاں ہمارے سامنے آئی ہیں جبکہ کئی مرتبہ آزادی کے حامیوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے ظلم وستم کا مدعا بھی دوسری جانب ڈال دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹ مارچ کو جوئے دیو پور میں پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بنگلہ دیشی لٹریچر میں کہا گیا کہ آرمی نے بلا اشتعال اور بلا امتیاز غیر مسلم سویلین کو نشانہ بنایا حالانکہ یہ واقعہ مسلح افراد کی جانب سے آرمی کو اشتعال دلائے جانے کے بعد رونما ہوا؛ ۲۵-۲۶ مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی آپریشن کے دوران آرمی کی جانب سے طالبات کے ہاسٹل پر حملہ آور ہونے کی جھوٹی کہانیاں لوگوں تک پہنچائی گئیں؛ اور یکم اپریل کو جیسور میں آزادی کے حامی بنگالیوں کی جانب سے مغربی پاکستانی سویلین افراد کو قتل کیے جانے والے واقعہ کو بین الاقوامی میڈیا میں اس طرح سے ظاہر کیا گیا کہ آرمی نے بنگالی سویلین کا قتل عام کیا تھا۔[۷]

ڈھاکہ کے یتیم مقتولین- جب میں بنگلہ دیش میں موجود تھی تو ایک کہانی مجھ تک یہ بھی پہنچی کہ جنگ کے آخری دنوں میں دسمبر کے مہینے میں آرمی نے ڈھاکہ کے مرکز میں واقع یتیم خانے کو بمباری کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں سینکڑوں یتیم بچے ہلاک ہوگئے۔ یہ الزام بہت ہی عجیب ہے کیونکہ ۱۹۷۱ء کے متعلق تمام تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر بھارتی طیاروں کی بمباری کی وجہ سے ۶ دسمبر کے بعد سے پاکستان کی فضائیہ کو گراؤنڈ کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد سے مشرقی پاکستان کی فضاؤں میں صرف بھارتی طیارے اڑتے رہے۔ جب میں نے اس بات کا ذکر کیا تو بنگلہ دیشی لوگوں نے جواب دیا کہ انھوں نے ایک جہاز کی آواز سنی تھی، انھوں نے کہا کہ انھیں پکا یقین تھا کہ وہ پاکستانی ہیلی کاپٹر تھا جس نے یتیم خانے کو بموں سے نشانہ بنایا۔[۸] آخر کار ایک ایسے وقت میں جب پاکستان آرمی بھارت کے خلاف خود ڈھاکہ کے دفاع میں مصروف تھی اور ان کی کمر دیوار سے لگی تھی وہ لوگ یتیم خانے کو نشانہ کیوں بناتے۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ جس حد تک ممکن ہو پاکستان آرمی کو "ظالم" بنا کر پیش کیا جائے۔[۹]

۱۹۷۱ سے متعلق بنگلہ دیشی حکومت کی جانب سے مرتب کی گئی "دستاویزات" میں بہت سی غیر ملکی میڈیا رپورٹس بھی ملتی ہیں۔ ان رپورٹوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یتیم خانے کو دراصل بھارتی طیاروں نے نشانہ بنایا تھا جو کہ اپنے اصل ہدف سے ہٹ گئے تھے۔ دی آبزرور ۱۲ دسمبر کی اشاعت میں اپنی "ڈھاکہ ڈائری" برائے ۹ دسمبر بروز جمعرات رپورٹ پیش کرتا ہے:

جنگ کے باعث بدترین تباہ کاری اسلامک یتیم خانے میں پیش آنے والا ہولناک واقعہ ہے جس میں بھارتی

طیاروں نے آج صبح ۴ بجے یتیم خانے کو بموں کا نشانہ بنایا۔ اس وقت تین سو کے قریب بچے اور بچیاں وہاں سو رہے تھے۔ میں نے صبح ہوتے ہی اس جگہ کا دورہ کیا۔ بموں نے ہر فرد کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر مر چکے تھے۔ رات کے وقت کی جانے والی بمباری کے ہولناک نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اس جگہ بمباری بلا جواز تھی۔ ان بموں کا اصل ہدف ایئر پورٹ کا رن وے تھا جسے بھارتی دن کے وقت گزشتہ پانچ دنوں سے نشانہ بنا رہے تھے۔ صرف آج دوپہر کے وقت ہی یہ ممکن ہوسکا کہ ایک پائلٹ نے ٹھیک جگہ پر بم گرایا۔ لیکن اُس وقت تک بھی ہم ایک آسٹریلوی نامہ نگار کے اس تبصرے سے اتفاق کر رہے تھے کہ: بھارتی اب تک بیل کو نکیل ڈالنے میں ناکام رہے تھے۔[10]

دی ٹائمز کی ۱۳ دسمبر کی رپورٹ کے مطابق غیر ملکیوں کے ایک گروپ کو کئی ناکامیوں کے بعد بالآخر ڈھاکہ سے کلکتہ کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کیا گیا کیونکہ اس دوران ڈھاکہ بھارتی طیاروں کے حملوں کی زد میں تھا۔ ''انھوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ چند دن پہلے ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ پونڈ پانچ بم یتیم خانے پر جا گرے جن کا اصل ہدف ۱۵۰ گز کے فاصلے پر واقع ریلوے یارڈ تھا۔۔ اس واقعے میں پاکستانی حکام کے مطابق ۳۰۰ بچے مارے گئے تھے۔ ایک جرمن ٹیلی ویژن کے کیمرہ مین کے مطابق اس نے ۲۰ لاشیں دیکھی تھیں اور اسے یقین تھا کہ کئی لاشیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں''۔[11]

اس کے علاوہ بھی کئی رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھارتی طیاروں نے اپنے اصل اہداف کی بجائے سویلین آبادی کو نشانہ بنا ڈالا۔ دی آبزرور کی ''ڈھاکہ ڈائری'' نارائن گنج کے بارے میں رپورٹ پیش کرتی ہے: ''رات کے وقت بمباری کرتے ہوئے بھارتی ہوابازوں نے آدھ میل دور واقع پاور اسٹیشن کے بجائے ایک غریب رہائشی بستی کو نشانہ بنا ڈالا۔ چار سے پانچ سو سویلین ہلاک ہو گئے جبکہ ۱۵۰ سویلین ہسپتال پہنچا دیے گئے تھے''۔[12] جہاں آراء امام کے جرنل میں بھی ہمیں ۱۴ دسمبر کو شدید بمباری کا ذکر ملتا ہے، اس دن ان کے شوہر کی تدفین ہوئی تھی اور پڑوس میں چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔[13]

لسانی نفرت پر مبنی قوم پرستی۔ دشمن کو ''ظالم'' ثابت کرنے کے لیے ایک یہ تکنیک بھی اپنائی گئی کہ اپنی جانب سے ڈھائے گئے ظلم وستم کو کم از کم کر کے بتایا جائے۔ ۱۹۷۱ کی جنگ کے تناظر میں اب تک پاکستان آرمی کی تصویر بحیثیت ''ظالم'' آزادی کے حامی ''معصوم بنگالیوں'' کے ساتھ ایک بہترین امتزاج پیش کرتی ہے۔ اسکی وجہ سے بذات خود بنگالیوں کی جانب سے ڈھائے گئے مظالم کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ بات اس کتاب میں ہمارے پیش نظر رہی ہے کہ آزادی کے حامی قوم پرست بنگالی

مشرقی پاکستان میں واضح طور پر مسلح تھے اور انھوں نے غیر بنگالیوں، مغربی پاکستانیوں، بہاریوں اور غیر ملکیوں کو کھل کر تشدد کا نشانہ بھی بنایا۔ بھارت سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہونے والے بہاری والے ان واقعات میں سب سے زیادہ متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔ بنگالی قوم پرستی کے نام پر شروع ہونے والے ان بے لگام فسادات میں بڑی تعداد میں غیر بنگالی مرد، عورتیں اور بچے ذبح کر دیے گئے۔ اس کی مثالیں ہمیں چٹاگانگ، کرنافلی ملز، کھلنہ میں جوٹ مل کی کالونیوں، ریلوے ٹاؤن سانتا ہار جیسور میں مغربی پاکستانی کاروباری لوگوں کا قتل عام، باغی مشرقی پاکستانی بنگالی رجمنٹ کے ہاتھوں مغربی پاکستانی اہلکاروں کو غیر مسلح کرنے اور انھیں اور ان کے خاندانوں کو قتل کیے جانے کے واقعات میں ملتی ہیں۔ غیر بنگالیوں کا قتل عام تو بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد تک جاری رہا جس کی مثال کھلنہ میں واقع جوٹ مل کالونیاں ہیں۔ اس تحقیق سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر ایک واقعے میں مرنے والے غیر بنگالیوں کی تعداد سینکڑوں یا ہزاروں میں تھی ـــ اس تعداد سے جرائم کی سنگینی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لسانی تعصب کی بھینٹ کئی مردوں، عورتوں اور بچوں کو چڑھا دیا گیا اور قتل عام کے لیے وحشیانہ طریقے اپنائے گئے۔ خود بنگالیوں میں بھی آپس میں ہمیں کہیں کہیں شدید درندگی نظر آتی ہے ـــ ان لوگوں کے درمیان جو متحدہ پاکستان کے حامی تھے اور ان لوگوں کے جو بنگلہ دیش کو آزاد کروانا چاہتے تھے۔ جنگ کے اواخر میں آزادی کے حامی پیشہ ور افراد کا قتل عام اس جنگ کے بدترین جرائم میں سے ایک ہے۔

سیاسی مخالفین کو تشدد کا نشانہ بنانا اور سرے سے مٹا دینا جیسا طرزِ عمل بنگالی قوم پرست سیاست کی اہم علامت کے طور پر سامنے آیا جیسا کہ ہمیں اس سال کے بعد کے عرصے کے دوران رونما ہونے والے واقعات میں بھی نظر آتا ہے۔ کئی لوگ لسانی اور سیاسی قتل کے نام پر اس شیطانی چکر میں جانیں کھو بیٹھے۔ مشرقی پاکستان کے شمالی علاقوں میں، جہاں بہاریوں کی ایک بڑی تعداد نے بنگالیوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم کی گواہی دی، خدمات سرانجام دینے والے ایک مغربی پاکستانی افسر کے مطابق بہاریوں نے بھی بنگالیوں کے خلاف کچھ کم ظلم نہیں کیے۔ عموماً ہم دیکھتے ہیں کہ اپریل کے مہینے تک آزادی کے حامی بنگالی افراد کو غلبہ حاصل رہا اور اس کے بعد سے سال کے اختتام تک بہاری اور پاکستان کے حامی بنگالی بدلے لیتے رہے۔ بالآخر پاک ـــ بھارت جنگ کے بعد ایک مرتبہ پھر قوم پرست بنگالیوں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ اس سارے کھیل کے دوران کسی بھی شخص کو انصاف کے کٹہرے میں نہ لایا گیا اور بنگلہ دیشی سیاست پر تشدد کا رجحان غالب رہا۔

بنگال میں رحم دل "بلوچی"

۱۹۷۱ کی بغاوت نے بنگالی لسانیت اور قوم پرستی کی بنیاد پر ایک نئے بنگال کو متعارف کروایا اور مسلم قومیت کا نظریہ اس کی رو میں کہیں دور بہہ گیا جو قیام پاکستان کی بنیاد تھا۔ گمان ہوتا ہے کہ قوم پرست بنگالیوں کی جانب سے یہ جنگ مکمل طور پر نسل پرستانہ تھی۔ متحدہ پاکستان کے دفاع کرنے والوں اور آزاد بنگلہ دیش کے لیے لڑنے والوں کے مدنظر اب مغربی اور مشرقی پاکستان تھے بلکہ اس سے نیچے کی سطح پر آکر اب یہ جنگ "پنجابی" اور "بنگالی" عناصر کے درمیان تصادم کا روپ دھار چکی تھی۔ بنگالیوں کے متحدہ پاکستان کے حامیوں کی طرف یا کم از کم علیحدگی سے قبل غیر جانبدار ہونے کا امکان، اس صورتحال میں بہت کم ہے۔ ماسوائے اس کے کہ وہ "شریک کاروں" کا کردار تسلیم کریں۔ بنگلہ دیشی لٹریچر میں جغرافیائی محلِ وقوع سے قطع نظر تمام مغربی پاکستانیوں کو پنجابی کہہ کر گالی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جبکہ شمالی ہندوستان سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان میں آباد ہونے والے مسلمان بہاریوں کو "دشمن" اور ان پنجابیوں کا اتحادی گردانا جاتا ہے۔

میری تحقیق کے دوران ایک اور لسانی گروہ "بلوچی" کی نشاندہی ہوئی۔ بلوچیوں کے بارے میں بنگالیوں کا خیال تھا کہ یہ لوگ مغربی پاکستانی آرمی میں زیادہ "انسان دوست" لوگ ثابت ہوئے ہیں۔ بلوچ مغربی پاکستان کے علاقے بلوچستان کے باشندوں کو کہا جاتا ہے۔ اس قوم کی تاریخ بھی مختلف بغاوتوں پر مبنی ہے۔۔۔ مختلف لوگوں سے انٹرویو کے دوران میں نے دیکھا کہ مختلف علاقوں، دیہاتوں، شہروں اور اضلاع سے تعلق رکھنے والے بنگالی مردوں اور عورتوں نے ایک ہی بات کی کہ انہوں نے مغربی پاکستان میں بلوچوں کو دیگر لوگوں سے بہتر پایا اور مختلف عسکری کارروائیوں میں بلوچوں نے انسان دوست رویے کا مظاہرہ کیا۔ بنگالیوں نے چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی "بلوچوں" سے منسوب کر دیا۔ ۱۹۷۱ سے متعلق اشاعت شدہ بنگالی تحریروں میں بھی بلوچی افسران اور جوانوں کے اچھے رویے اور فیاضی کی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

جب ۱۳ اپریل کو راج شاہی کے علاقہ تھانہ پاڑہ میں دریا کے کنارے بچوں اور عورتوں کو مردوں سے الگ کیا گیا تو اس وقت محمودہ بیگم کم سن نوجوان لڑکی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان پر پہرہ دینے والے چند فوجی پریشان دکھائی دے رہے تھے اور عورتوں کے ساتھ وہ فوجی بھی رو رہے تھے۔ عورتوں اور بچوں کو واپس گاؤں بھیج دیا گیا۔۔۔ اس کے بعد وہاں بیٹھے مردوں کو قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ اس حوصلہ شکن واقعے کے باوجود محمودہ بیگم کو یاد ہے کے پاکستان آرمی کے تمام اہلکار برے

انسان نہیں تھے بلکہ ان کے مطابق — ''بلوچی'' اہلکار دل کے بہت اچھے تھے۔[۱۴]

محمودہ بیگم کا شوہر ریحان علی جو اس وقت ۱۲ برس کا لڑکا تھا، بعد میں پیش آنے والے ایک واقعہ کو یاد کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ دو سپاہی ایک مرتبہ اسے گھر سے اٹھا کر سارداپولیس اکیڈمی لے گئے اور ''بنکر'' کے تعمیراتی کام پر لگا دیا۔ ایک افسر — جو کہ اس کے مطابق ''بلوچی'' تھا — آیا اور اس نے ریحان سے پوچھا کہ اسے کون وہاں لایا تھا۔ جب ریحان نے ان دونوں سپاہیوں کی جانب اشارہ کیا تو اس افسر نے دونوں سپاہیوں کو خوب ڈانٹ پلائی۔ اس افسر نے ریحان کو اپنی جیب سے کچھ پیسے بھی دیے اور پھر گھر جانے کو کہا۔[۱۵]

جب ابوالبرق علوی اور اس کے ڈھاکہ کے گوریلا گروپ کے ساتھی قیدیوں سے ڈھاکہ میں واقع ایم پی ہاسٹل کے مارشل لاء کورٹس میں تشدد اور تفتیش کی جا رہی تھی تو انھیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا گیا تھا حتیٰ کے ایک معمر فوجی ان کے لیے ایک رات کچھ روٹی لے کر آیا۔ علوی نے سوچا کہ فوجی لازماً ''بلوچی'' ہوگا۔[۱۶]

چٹاگانگ میں واقع فلاحی تنظیم پرابارتک سانگھا کے جلادھر سین گپتا لکھتے ہیں کہ ۲۰ مئی کو جب پانچ پاکستانی فوجی وہاں آئے تو ان کے سینٹر میں چھپ کر چند لوگوں نے جان بچائی جن میں وہ بھی شامل ہیں۔ سین گپتا کے مطابق انھیں اور دیگر چار افراد کو اسکول کے میدان میں بٹھا دیا گیا۔ ''تین بلوچی فوجیوں نے میدان چھوڑ دیا اور چلے گئے۔ انہوں نے کہا، ''ہم نہتے ضعیف لوگوں کو نہیں ماریں گے''۔ جبکہ باقی کھڑے دو پنجابیوں میں سے ایک نے ہم پر گولی چلا دی''۔[۱۷]

پرتیتی دیوی ایک ہولناک کہانی سناتی ہیں کہ ۲۹ مارچ کو کومیلا میں واقع ان کے مکان پر فوجیوں نے دھاوا بول دیا اور ان کے ضعیف سسر دھریندرہ ناتھ دتا، چونکہ سیاست دان اور پارلیمانی رکن تھے، اور دیور، دلیپ کو ساتھ لے گئے — دونوں میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا۔ انھیں اور ان کی بیٹی کو آپریشن کے دوران ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا گیا اس دوران انھوں نے کئی بار کوشش کی کہ دیکھیں کہ ان کے گھر میں کیا ہو رہا تھا لیکن ایک ''نوجوان بلوچی کیپٹن''، جس نے ہاتھ میں ٹارچ پکڑ رکھی تھی، انھیں روکتا رہا۔ پرتیتی دیوی کے مطابق ''وہ نوجوان بلوچی افسر اس وقت تک ان کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا جب تک آخری فوجی گھر سے نکل نہ گیا۔ بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ اس نوجوان افسر کی بدولت ہی اروما اور میں اس دن زندہ بچ گئے''۔[۱۸]

مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ کے دوران پاکستان آرمی میں اتنے سارے ''بلوچوں'' کا سامنے آنا بڑی عجیب بات ہے کیونکہ ہمیں تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بلوچوں کی شرح پاکستان آرمی میں

ہمیشہ بہت کم رہی ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ محض حلیے سے اس بات کا اندازہ لگائیں کہ کون لوگ بلوچی تھے اور کون پنجابی۔ بے شک مشرقی پاکستان میں اس وقت ''بلوچ'' رجمنٹ تعینات تھی لیکن بلوچ رجمنٹ صرف بلوچوں پر ہی مشتمل نہ تھی بلکہ اس میں بہت سے پنجابی اور پٹھان بھی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ درحقیقت جتنے بھی پاکستان آرمی کے افسران سے میری بات ہوئی جو اُس وقت مشرقی پاکستان میں تعینات تھے، ان کے مطابق مشرقی صوبے میں ۱۹۷۱ کے دوران کوئی بلوچی اہلکار تعینات نہ تھا۔

چند افسران — بالخصوص جن کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے تھا— حیران ہوئے کہ پوری بلوچ رجمنٹ کو بنگالیوں کی جانب سے خوش اخلاقی کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا تھا، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بنگلہ دیش کے لوگ لفظ ''بلوچی'' کو لسانی تناظر میں مختلف یونٹوں میں پائے جانے والے رحمدل اہلکاروں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرا لسانی گروہ جسے بنگالی ہمدرد اور انسان دوست سمجھتے تھے وہ ''پٹھان'' ہیں۔

بلاشبہ، اس وقت پشتو بولنے والے کئی فوجی افسران اور جوان واقعتاً وہاں فرائض منصبی سرانجام دے رہے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان، جنھیں بنگالیوں نے بطور بھوت پیش کیا بذات خود فارسی بولنے والے پٹھان تھے۔ مشرقی کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی بھی پنجاب میں پیدا ہونے والے ایک پٹھان ہی تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل (بریگیڈیر) جہانزیب ارباب بھی جو ۵۷ بریگیڈ کی کمان کر رہے تھے اور ڈھاکہ اور راج شاہی میں آپریشن کے مکمل ذمہ دار تھے، پٹھان ہی تھے۔ اس کے برعکس بھارت کی جانب سے مشرقی کمانڈر اور بنگالی قوم پرستوں کے ہیرو لیفٹیننٹ جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ ایک پنجابی تھے اور بھارتی آرمی کے کئی افسران اور جوان پنجاب سے ہی تعلق رکھتے تھے!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مشرقی پاکستان میں بلوچی تعینات نہ تھے تو پراسرار انداز سے اتنے سارے ''بلوچی'' پیدا کیسے ہو گئے جنھوں نے بزور قوت بنگالیوں کو دی جانے والی عسکری تحریک پر اچھائی کے ان گنت نقوش چھوڑ دیے؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ قوم پرست بنگالیوں کی ذہنی اختراع نے اس لسانی گروہ کو جنم دیا۔ ۱۹۷۱ء کی مشرقی پاکستان کی جنگ درحقیقت ایک سیاسی جنگ تھی جسے بعد میں بنگالی قوم پرستوں نے لسانی رنگ دے دیا تھا۔ اس کے برعکس مغربی پاکستانی ذرائع اس پورے مسئلے کو سیاسی تناظر میں دیکھتے ہیں — یعنی کہ متحدہ پاکستان کا دفاع اور علیحدگی پسندوں کی جانب سے ملک کو توڑنے کی سازش— جبکہ بنگالی قوم پرست مسئلے کو خالصتاً لسانی نقطہ نظر

سے جانچتے ہیں، یعنی (حریت و جمہوریت پسند) بنگالی بمقابلہ (استعماری، جابر) پنجابی — لسانیت کی بنیاد پر اس تنظیم نو نے جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے گھر پاکستان میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ تنازع کی اصل وجوہات جیسا کہ امتیازی سلوک، نمائندگی، وفاقیت اور خودمختاری جیسے مسائل جنگ کے دوران پس پشت ڈال کر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان اور پھر اس سے نچلی سطح پر ''پنجابی'' کو ''بنگالی'' سے برسر پیکار کر دیا گیا۔

مسئلے کو سیاسی تناظر کے بجائے لسانی تناظر میں دیکھنے کی وجہ سے ظالم اور اچھے انسانوں کی تمیز بھی ایک خاص مسئلے کی جانب نشاندہی کرتی ہے۔ بنگالی قوم پرست اس طرح سے بھی تصویر کشی کر سکتے تھے کہ ''سالا پنجابی'' لوگوں میں چند اچھے انسان بھی ہیں، لیکن اس کے برعکس انھوں نے اپنے تخیلات میں ایک منفرد لسانی گروہ کو جنم دینا شروع کر دیا۔ بلوچی کی اصطلاح کو استعمال کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کیونکہ مارچ ۱۹۷۱ میں بطور گورنر ایسٹ پاکستان بھیجے جانے والے جنرل ٹکا خان کو بلوچستان میں بغاوت کچلنے کے بعد ''قصاب بلوچستان'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

یہ بات غیر واضح ہے کہ بلوچوں کا یہ ان دیکھا ٹولہ نہ جانے کس طرح قومی سطح پر زیر بحث آ گیا، لیکن بنگالیوں کی جانب سے پیدا کی جانے والی افواہوں نے بہت تیزی سے کام دکھایا۔ باغیوں نے اس لسانی پروپیگنڈے کو اس موثر طریقے سے استعمال کیا کہ اس کے اثرات دیہاتوں تک دیکھنے کو ملتے ہیں: ۱۳ اپریل کے دن تھانہ پاڑہ راج شاہی میں مردوں کے قتل عام کو یاد کرتے ہوئے گاؤں والوں نے مجھے بتایا کہ وہاں قتل عام کرنے والا افسر ''پنجابی'' تھا۔ جبکہ اسی ڈسٹرکٹ کے ایک اور گاؤں میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس میں افسر نے کسی کو قتل نہیں کیا، بلا جواز گاؤں والوں نے مجھے بتایا کہ وہ اچھا افسر ''پٹھان'' تھا۔

تحقیق کے دوران مجھے صرف ایک مثال ایسے فوجی افسر کی ملی جو واقعتاً صوبہ بلوچستان کا رہائشی تھا یہ ۲۷ بلوچ رجمنٹ کے کیپٹن صمد علی تھے جنھیں اپنی کمپنی کے ہمراہ ۲۶-۲۵ مارچ کو کشٹیا بھیجا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ عطاء اللہ شاہ نے جوان کے ساتھ کشٹیا میں ڈیوٹی دے رہے تھے مجھے بتایا کہ کیپٹن صمد علی بلوچستان کی ''ہزارہ'' برادری کے تھے۔ اس بات کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ لیفٹیننٹ عطاء اللہ ان گیارہ افراد میں سے تھے جو کہ ۲۹ مارچ کو جیسور جاتے ہوئے کشٹیا میں باغیوں کے حملے میں ۱۵۵ افسروں اور جوانوں میں سے زندہ بچے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب بلوچستان کا حقیقی رہائشی افسر باغیوں کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ عینی شاہد لیفٹیننٹ عطاء اللہ کے مطابق باغیوں نے کیپٹن صمد علی کو گرفتار کر لیا تھا اور انھیں دریا کے پاس نیچے لٹا کر ذبح کر دیا۔[۱۹]

تعداد

علیحدگی کے حق میں عوامی حمایت۔ 1970 کے عام انتخابات کے نتائج کو عموماً ''بنگلہ دیش'' کے قیام کے حق میں ناقابل تردید ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمٰن کی سربراہی میں مشرقی پاکستان میں ۷۵ فیصد ووٹ حاصل کیے اور صوبے میں موجود ۱۶۲ میں سے ۱۶۰ نشستیں عوامی لیگ نے جیتیں۔[۲] ان نتائج کو اتمام حجت سمجھا گیا۔

عوامی لیگ کو حاصل ہونے والی عوامی حمایت اور ووٹوں اور نشستوں کی شرح فیصد نے کئی دیگر اہم اعداد وشمار اور تشریحات کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر انتخابات جو پورے ملک کے پہلے آزاد اور شفاف انتخابات تھے۔۔ اس اہم آئینی مسئلے پر ہوتے کہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کیا جانا ہے تو مشرقی پاکستان میں ووٹوں کی شرح اس سے بھی زائد ہوسکتی تھی۔ جبکہ عجیب بات ہے کہ مشرقی پاکستان میں ڈالے گیے ووٹوں کی شرح فیصد محض ۵۶ فیصد تھی جو پنجاب (۶۶%) اور سندھ (۵۸%) میں ڈالے گئے ووٹوں کی شرح سے بھی کم تھی۔ گو کہ یہ شرح صوبہ سرحد (۴۷%) اور صوبہ بلوچستان (۳۹%) میں ڈالے گیے ووٹوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ووٹروں کا ۴۴% مشرقی پاکستان میں انتخابات میں دلچسپی ہی نہیں رکھتا تھا یا یوں کہہ لیں کہ انتخابات میں ان کے پیش نظر کوئی ایسا اہم مسئلہ تھا ہی نہیں جس کے لیے وہ لوگ ووٹ ڈالنے کے لیے جاتے۔

مشرقی پاکستان میں باقی ماندہ ووٹروں میں سے تین چوتھائی نے عوامی لیگ کے حق میں ووٹ دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انتخابات والے دن عوامی لیگ بھر پور انداز سے ووٹ لینے میں کامیاب ہوئی۔ چونکہ کل ووٹروں کے صرف ۵۶ فیصد نے حق رائے دہی کا استعمال کیا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل ووٹ بینک کا ۴۲ فیصد عوامی لیگ کے حق میں رہا۔ تاہم اس ۴۲ فیصد ووٹوں کے بارے میں بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ تمام ووٹ علیحدگی کے حق میں تھے کیونکہ ڈالے گئے ووٹوں کی شرح بذات خود اس بات پر شاھد ہے کہ ووٹروں کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ یہ الیکشن کسی ایسے اہم مسئلے کے لیے ریفرینڈم یا حق رائے دہی ثابت ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ شیخ مجیب کے حق میں ووٹ ڈالنے والے موجودہ حکومت سے نفرت کا اظہار کر رہے ہوں، تبدیلی چاہتے ہوں یا امتیازی سلوک اور ارتکاز اختیار کا خاتمہ چاہتے ہوں۔ ان میں سے صرف جزوی تعداد ہی ایسی ہوسکتی ہے جن کے ذہنوں میں اس وقت بھی آزادی کا خیال راسخ ہو۔

بالکل اسی طرح، باقی ماندہ ۵۸ فیصد ووٹروں جنھوں نے گھر بیٹھ کر یا کسی اور پارٹی کو ووٹ

دے کر عوامی لیگ سے لاتعلقی کا اظہار کیا، ان کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ موجودہ نظام سے مطمئن تھے۔ ان میں سے بہت سے ووٹروں نے سوچا ہوگا کہ ان کے مسائل کا اصل حل عوامی لیگ کے پاس ہے ہی نہیں۔

بنگلہ دیش کی آزادی سے متعلق لٹریچر میں ''رضا کار'' کی اصطلاح کا استعمال بہت واضح انداز سے اور بڑے پیمانے پر ملتا ہے — یہ دراصل وہ بنگالی تھے جو پاکستان کو متحد رکھنے کے مسئلے پر حکومت وقت سے اتفاق رکھتے تھے۔ سمرتی ۱۹۷۱ء (یادیں ۱۹۷۱ء کی) تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف بنگالی افراد کی یادداشتیں قلم بند کی گئی ہیں اور اس کے علاوہ آزادی کے حق میں لکھا گیا۔ بنگالی لٹریچر اس بات پر شاہد ہے کہ بہت سے بنگالی بھی پاکستان کو متحد رکھنے کے معاملے میں حکومت وقت کے حامی تھے۔ ایسے بنگالی جو آزادی کے حامی نہ تھے، علیحدگی پسندوں کو پکڑتے اور آرمی کے حوالے کرتے، انھیں مار دیتے ان کو آزادی کی تحریروں میں بہت ہی منفی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے کردار کہیں نہ کہیں سے ہر کہانی، ہر گاؤں اور ہر پڑوس میں نظر آ ہی جاتے ہیں۔

جس طرح آزادی کے حق میں لڑنے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی لیکن عوام میں ان کے حامی بڑی تعداد میں موجود تھے بالکل اسی طرح ہو سکتا ہے کہ سیاسی طور پر متحرک ''رضا کار'' اقلیت میں ہوں لیکن ان کے افکار کے حامی عوام میں بڑی تعداد میں موجود تھے۔ نیز عوام کی ایک بڑی تعداد دونوں اطراف میں سے کسی بھی ایک جانب جھکتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ آزادی کے حق میں شائع ہونے والی تحریروں میں اس بات کی جا بجا شکایت کی گئی ہے کہ دشمن کا ساتھ دینے والے عناصر کو نہ صرف بنگلہ دیش میں فوراً آباد کر لیا گیا بلکہ یہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے اختیار و اقتدار کے بام عروج پر بھی پہنچ گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنگلہ دیش کی آزادی کی حمایت میں کھل کر سامنے نہ آنا یا ۱۹۷۱ میں پاکستان کی جانب ہو کر علیحدگی کی تحریک کی کھل کر مخالفت کرنا کوئی ایسے جرائم نہ تھے کہ ان کی پاداش میں لوگوں کو ''لٹکا'' دیا جاتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت سے نالاں لوگ بھی اس بات کے حق میں نہ ہوتے کہ محض بیس برس پہلے حاصل کیے جانے والے ملک کو دولخت کر دیا جائے۔

جنگ کی تواریخ۔ ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ باقاعدگی کے ساتھ کب شروع ہوئی یہ ایک متنازع مسئلہ ہے۔ عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ جنگ ۳ دسمبر کو شروع ہوئی اور یہی اعلان بھارت کی جانب سے بھی کیا گیا۔ لیکن یہ محض وہ تاریخ ہے جب مغربی حصہ بھی اس جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ عملی طور پر تو بھارت نے مارچ کے مہینے سے ہی جنگ شروع کر دی تھی اور جہاں تک صوبے میں سیاسی دخل اندازی کا تعلق ہے وہ تو اس سے بھی پہلے شروع ہو چکی تھی۔ بہت سے

آزادی کے حامی بنگالی اپنی تحریروں میں مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع ہونے سے بہت عرصہ قبل ہی سے بھارت کے ساتھ روابط اور تعاون کا ذکر بڑے ہی واضح انداز سے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پورے سال کے دوران بھارتی دخل اندازی اور جانی نقصانات کا ذکر بھی ہمیں ان تحریروں میں بصراحت ملتا ہے۔ پاکستان میں بھی جن فوجی افسران سے میری بات ہوئی انھوں نے بڑے پیمانے پر بھارتی دخل اندازی کے بارے میں بتایا۔ ایک بنگالی کو رپورٹ کرتے ہوئے اپنی 18 ستمبر ۱۹۷۱ کی اشاعت میں دی گارجین لکھتا ہے کہ ''بڑے آپریشن ہمیشہ بھارت کے ذریعے کروائے جاتے ہیں''۔ یہ وہ بنگالی شخص ہے جو مقامی آبادی کے ساتھ گھل مل گیا تھا اور اُسے کسی مترجم کی ضرورت نہ تھی، اس نے بھارت میں مکتی باہنی کے کئی کیمپوں کا دورہ کیا اور اپنے گائیڈ کے ساتھ واپس مشرقی پاکستان بھی آیا۔ سینکڑوں بنگالی، ''رضا کار''، جو سرحد پار موجود تھے اور جن سے اس کی ملاقات ہوئی ان میں سے صرف چھ ہی ایسے تھے جنھیں باقاعدہ تربیت دی گئی اور ان میں سے بھی صرف تین نے عملی طور پر آپریشن میں حصہ لیا تھا۔[۲۱]

مشرقی پاکستان میں کھلے عام جنگ شروع ہونے کی تاریخ بہر حال ۳ دسمبر نہیں ہو سکتی۔ پاکستان آرمی کے ایسٹرن کمانڈر جنرل نیازی بھارت کی جانب سے کیے جانے والے دعوے ''Lightning Campaign'' سے اس قدر نالاں تھے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں پورا ایک باب جنگ کی تاریخ ''The Date of the War'' کے عنوان سے قائم کیا:

''۲۰/۲۱ کی نومبر کی درمیانی رات بھارت نے مشرقی پاکستان پر چاروں اطراف سے حملہ کر دیا''۔[۲۲] جنرل نیازی اس بحث میں اہم رکن کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے موقف کی تصدیق امریکی مصنفین سیزن اور روز کی تصنیف سے بھی ہوتی ہے۔ ان کے مطابق بالآخر اپریل ۱۹۷۱ء تک بھارت نے براہِ راست فوجی مداخلت کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے مرحلہ وار حکمت عملی تیار کی۔ ''امریکی حکومت کا تجزیہ بالکل ٹھیک تھا کہ بھارت مشرقی پاکستان میں ملٹری آپریشن کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا، مسز گاندھی نومبر کے اوائل میں واشنگٹن آئیں اور وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ جیسے اب بھی مسئلے کا پر امن حل چاہتی ہوں''۔

تاہم، ابتدائی مرحلے میں بھارتی فوجی مداخلت اس تناظر میں ناکام ہوگئی کہ ان کی حمایت یافتہ مکتی باہنی پاک — بھارت سرحدی علاقے میں واقع شہری مراکز میں پاکستان آرمی کو اپنی عملداری قائم کرنے سے باز رکھنے میں بری طرح ناکام ہوگئی۔ یہی نہیں بلکہ پاک آرمی جس گاؤں میں چاہتی آ جا سکتی تھی۔ اگلے مرحلے میں مکتی باہنی کے کارکنان کو مزید سخت تربیت دینا اور ان کے ساتھ

مل کر بھارتی اہلکاروں کا براہِ راست مشرقی پاکستان میں کارروائیاں کرنے جیسے اقدامات شامل تھے۔ یہ مرحلہ جولائی سے اکتوبر کے وسط تک کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ مکتی باہنی کے کارکنان اور ان کے بھیس میں بھارتی اہلکاروں نے دفاعی نقطۂ نظر سے اہم اہداف کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اس ضمن میں انھیں بھارتی آرٹلری کی مدد حاصل رہی۔

سیزن اور روز کے مطابق اگلے مرحلے میں یعنی اکتوبر کے وسط سے ۲۰ نومبر تک بھارتی فوج کا بھرپور استعمال کیا گیا اور آرٹلری کے ساتھ ساتھ فضائیہ بھی اس آپریشن میں شریک ہوگئی۔ ''ایک مرتبہ جب اہداف مکتی باہنی کے کنٹرول میں آجاتے تو بھارتی یونٹس واپس اپنے علاقوں میں چلی جاتیں۔۔ لیکن کبھی کبھی یہ صورتحال عارضی ثابت ہوتی کیونکہ بھارتی اس بات سے سخت نالاں تھے کہ جب پاک آرمی جوابی کارروائی شروع کرتی تو مکتی باہنی کے باغیوں کے قدم اکھڑ جاتے''۔
''تاہم ۲۱ نومبر کی رات کے بعد حکمت عملی میں ایک واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔۔ بھارتی فوج واپس نہیں جایا کرتی تھی۔ ۲۱ سے ۲۵ نومبر کے دوران بھارتی آرمی کے کئی ڈویژن چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں منقسم ہوگئے اور مشرقی پاکستان کے اہم سرحدی علاقوں میں کارروائیاں کرنے لگے۔ یہ کارروائیاں تمام اطراف سے کی جارہی تھیں انھیں توپ خانے اور فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی''۔[۲۳]

جہاں ۳ دسمبر کی تاریخ کا تعلق ہے اس کے بارے میں سیزن اور روز لکھتے ہیں کہ ''بھارتی حکومت نے اس وقت سکھ کا سانس لیا اور ان کے لیے یہ خوشگوار لمحات تھے جب پاکستان نے مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت کو کم و بیش دو ہفتے برداشت کرنے کے بعد مغربی پاکستان میں پاک فضائیہ کو 3 دسمبر کو شمال مغربی بھارت میں موجود اہم تنصیبات کو نشانہ بنانے کا حکم دے دیا''۔[۲۴] دو ہفتے تک اس قسم کی کارروائی سے گریز نے پاکستان کے دفاعی نظریہ کو، کہ مشرق کا دفاع مغرب میں ہے، متضاد بنا دیا تھا۔ جبکہ ۳ دسمبر کو مغربی سیکٹر کی جانب سے اٹھایا جانے والا یہ قدم بھی بعید از قیاس تھا اور جیسا کہ بعد میں جنرل نیازی نے خود بھی اس بات کی توثیق کی کہ مشرقی پاکستان میں برسرپیکار ایسٹرن کمانڈ کو نہ تو اس فیصلے کے سلسلے میں اعتماد میں لیا گیا اور نہ ہی انھیں اس کے بارے میں مطلع کیا گیا۔

جنگی قیدی۔ جہاں تک 1971 سے متعلق اعداد و شمار کا تعلق ہے اس میں سب سے زیادہ قابل غور پاکستانی فوجی اہلکاروں کی تعداد ہے جنھیں جنگ کے اختتام پر جنگی قیدی بنایا گیا۔ عام دعوے یہی رہے کہ ''۹۳۰۰۰ پاکستانی فوجی اہلکاروں'' کو ہندوستان نے جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدی

بنا لیا تھا۔ اس تعداد کو مختلف ذرائع ابلاغ میں بار بار پیش کیا گیا لیکن کسی نے اسے چیلنج نہ کیا۔ جنگی قیدیوں کی تعداد وثوق کے ساتھ بتانا کوئی مشکل کام نہیں اس سلسلے میں بھارت نے اعداد وشمار تو رکھے ہی ہوں گے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ ۹۳۰۰۰ کی تعداد میں پاکستانی اہلکاروں کو جنگی قیدی نہیں بنایا گیا تھا۔

مارچ ۱۹۷۱ء میں اطلاعات کے مطابق مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوجی اہلکاروں کی تعداد ۱۲۰۰۰ تھی۔[۲۵] اس کے بعد بحران سے نمٹنے کے لیے مزید نفری منگوائی گئی اپریل تا دسمبر ۱۹۷۱ء کے دوران مشرقی کمانڈر، جنرل اے کے نیازی لکھتے ہیں: ''لڑنے والے فوجیوں کی ۴۵۰۰۰ کی نفری دستیاب تھی ـــ ۳۴۰۰۰ آرمی سے اور ۱۱۰۰۰ سی اے ایف اور ویسٹ پاکستان سویلین پولیس اور غیور لڑاکا مسلح افراد تھے''۔ ۳۴۰۰۰ ریگولر فوجیوں میں سے ۲۴۰۰۰ کا تعلق انفنٹری سے تھا جبکہ باقی ماندہ آرمر، آرٹلری، انجینئرز، سگنلز اور دوسری ماتحت یونٹوں سے تھے۔[۲۶]

پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ۳۴۰۰۰ فوجی اہلکار اور ۱۱۰۰۰ سویلین پولیس و دیگر مسلح اہلکار جن کی مجموعی تعداد ۴۵۰۰۰ بنتی ہے اس سے دوگنا تعداد ''۹۳۰۰۰ فوجیوں'' کو بھارت نے دسمبر میں جنگی قیدی بنا لیا ہو؟ جنرل نیازی کے مطابق:

> پاکستان آرمی کی تعداد ۳۴۰۰۰ فوجیوں پر مشتمل تھی؛ رینجرز، اسکاؤٹس، ملیشیا، سول پولیس مجموعی طور پر ۱۱۰۰۰ کے لگ بھگ تھے۔ اس طرح سے کل مجموعی تعداد ۴۵۰۰۰ تھی۔ اگر ہم بحریہ اور فضائیہ کی قوت کو شامل کرلیں اور ان سب افراد کو بھی جو کہ یونیفارم میں تھے اور مفت راشن حاصل کر سکتے تھے، جیسا کہ ایچ کیو، ایم ایل اے، ڈپو، تربیتی ادارے، ورکشاپس، فیکٹریاں، نرسیں، لیڈی ڈاکٹر اور غیر لڑاکا افراد جیسے نائی، موچی، باورچی اور خاکروب تب بھی یہ تعداد ۵۵۰۰۰ تک پہنچتی ہے نہ کہ ۹۶۰۰۰ یا ۱۰۰،۰۰۰ تک۔ باقی ماندہ افراد میں سول افسران، سرکاری ملازمین، عورتیں اور بچے شامل تھے۔[۲۷]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بھارتی تحویل میں موجود کُل قیدیوں کی تعداد ۹۳۰۰۰ تھی، '' ۹۳۰۰۰ فوجی اہلکاروں'' کا قیدی ہونا حرف غلط ہے، بلکہ اس سے مشرقی پاکستان میں پاکستان کی فوجی قوت کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح قیدیوں سے متعلق دیگر اعداد وشمار بھی ہیں جن پر اکثر دھیان نہیں دیا گیا ـــ یعنی ۱۹۷۱ء کے اوائل سے بھارت کی تحویل میں موجود پاکستانی جنگی قیدیوں کی تعداد۔ لیفٹیننٹ عطاء اللہ شاہ جن کا تعلق ۲۷ بلوچ سے تھا، انھیں کشٹیا میں گرفتار کرنے کے بعد اپریل کے اوائل میں بھارت کے حوالے کر دیا گیا تھا، انھوں نے مجھے بتایا کہ جب انھیں پناہ گڑھ منتقل کیا گیا تو انھوں نے دیکھا

کہ ۶۰ سے ۸۰ کے لگ بھگ مغربی پاکستانی افسران و دیگر اہلکار پہلے ہی وہاں بطور قیدی موجود تھے۔ مارچ کے مہینے میں جو لوگ قید میں موجود تھے ان میں 4 ایسٹ بنگال رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر، لیفٹیننٹ کرنل خضر حیات اور اسی یونٹ کے وہ دیگر افسران شامل تھے جنہیں باغی بنگالی 2IC میجر خالد مشرف نے قتل نہیں کیا تھا بلکہ گرفتار کر کے بھارت کی تحویل میں دے دیا۔ تھانہ پاڑہ کے دیہاتیوں کے مطابق، مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ۲۵ زیر تربیت اہلکاروں کو راج شاہی میں سارد ا پولیس اکیڈمی سے پکڑ کر انڈین بارڈر سیکیورٹی فورس کی تحویل میں ۱۱ اپریل کو دیا گیا تھا۔[۲۸]

''تین ملین افراد کی نسل کشی'' : قوم پرست بنگالیوں کی جانب سے پیش کیے جانے والے سب سے گمراہ کن اعداد و شمار ان لوگوں کے بارے میں تھے جو اس سارے قصے کے دوران اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان اعداد و شمار پر نہ صرف بیرونی دنیا بشمول بھارت نے من و عن یقین کر لیا بلکہ پاکستان میں بھی کئی لوگ ان اعداد و شمار کو درست سمجھتے ہیں۔ بنگالی قوم پرستوں کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۷۱ میں رونما ہونے والے واقعات کے دوران پاک آرمی نے تین ملین بنگالیوں کو نسل کشی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ الزامات کی اس جنگ میں پوری پاکستان آرمی کو مغربی پاکستان کے اہلکاروں پر مشتمل تصور کیا گیا جبکہ تمام مظلوموں کو قوم پرست بنگالی تصور کیا گیا۔

''تین ملین معصوم بنگالیوں'' کو مبینہ طور پر قتل کیے جانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بنگالی لڑائی میں شریک نہ تھے اور انہیں صرف لسانیت کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

میری تحقیق کا آغاز بھی اسی نقطے سے ہوتا ہے، اور کلکتہ میں بچپن سے یہی نکتہ کہانیوں کے ذریعے میرے ذہن میں بھی واضح ہو چکا تھا۔ میرا گمان تھا کہ ''تین ملین'' کے اعداد و شمار اندازاً تھے لیکن حقیقت سے قریب تر۔ نیز میرا خیال تھا کہ ان اعداد و شمار تک پہنچنے کے لیے زمینی حقائق کا جائزہ بھی لیا گیا ہوگا۔

انگریزی اور بنگالی دونوں زبانوں میں ۱۹۷۱ کے حوالے سے دستیاب مواد کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا کہ کتابوں، اخباروں، کالموں، فلموں اور ویب سائٹس پر ظاہر کیے جانے والے ''تین ملین'' افراد کی نسل کشی کے اعداد و شمار خود ساختہ ہیں نہ کہ حقائق پر مبنی۔ سیزن اور روز کے مطابق یہ اعداد و شمار بھارت کی جانب سے دیئے گئے ہیں جبکہ بعض بنگالیوں کے مطابق ان اعداد و شمار کا اعلان خود شیخ مجیب الرحمٰن نے کیا، انھیں نو ماہ مغربی پاکستان میں قید گزار کر واپس آنے کے بعد یہ بات بتائی گئی تھی۔ یہ بات بھی واضح نہیں کہ کس نے کس بنیاد پر شیخ مجیب کو یہ تعداد بتائی۔ بہر حال شیخ مجیب کی جانب سے اعلان کردہ ''تین ملین'' بنگالیوں کے قتل عام کو ہی میڈیا نے رپورٹ کیا۔ مثلاً

۱۱ جنوری ۱۹۷۲ کو دی ٹائمز کے پیٹر ہیزل ہرسٹ ڈھاکہ میں شیخ مجیب کی واپسی پر والہانہ استقبال کے موقع پر لکھتے ہیں کہ: آزاد بنگلہ دیش میں عوامی ریلی سے اپنے پہلے خطاب میں شیخ مجیب نے کہا'' مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے میرے تین ملین لوگوں کو مار ڈالا''۔[۲۹]

اس بارے میں بھی اطلاعات موجود ہیں کہ ایک عوامی جلسے میں عوام کو یہ بتایا گیا تھا کہ تین ملین بنگالیوں کا قتل عام کیا گیا ہے— صرف اس بنیاد پر کہ شیخ مجیب کو رہائی کے بعد یہ بتایا گیا تھا۔ شیخ مجیب نے اس حوالے سے ضروری ثبوت حاصل کرنے کے لیے جنوری ۱۹۷۲ء میں ایک انکوائری کمیٹی قائم کردی۔[۳۰] اس انکوائری کمیٹی کی مزید کارروائی یا کمیٹی کے ذریعے سامنے آنے والے حقائق کے بارے میں کوئی معلومات دستیاب نہیں۔ کسی بھی سرکاری دستاویز سے مبینہ طور پر فوج کی طرف سے ''تین ملین' بنگالیوں کو مارنے کی تصدیق نہیں ہوتی یہ محض عوامی جلسے میں کیا جانے والا ایک دعویٰ تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود جنوبی ایشیائی اور مغربی میڈیا میں اور علمی حلقوں ''تین ملین'' کی تعداد کو دہائیوں تک بلا تصدیق استعمال کیا جاتا رہا۔ سقوط ڈھاکہ سے متعلق اپنی تحقیق میں رونق جہاں'' پاک آرمی کی جانب سے وحشیانہ نسل کشی' کے بارے لکھتی ہیں کہ'' نو ماہ کی اس جدوجہد کے دوران مبینہ طور پر ایک سے تین ملین کے درمیان لوگ لقمہ اجل بنے''۔[۳۱] البتہ اس دعوے کے حق میں کسی ذریعے کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ تیس سال بعد ۱۹۷۱ کے واقعات پر مبنی Pulitzer Prize یافتہ کتاب A Problem from Hell: America and the Age of Genocide میں سمنتھا پاور دعویٰ کرتی ہیں:

'' مارچ ۱۹۷۱ میں شروع ہونے والے ...... پاکستان کی افواج نے ایک سے دو ملین کے درمیان بنگالیوں کو قتل کیا اور لگ بھگ ۲۰۰،۰۰۰ لڑکیوں اور عورتوں کو زیادتیوں کا نشانہ بنایا''۔ اس دعوے کو کسی ذریعے یا حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔[۳۲] جیسا کہ سیزن اور روز کہتے ہیں کہ'' بلاشبہ مشرقی پاکستان میں پاکستانیوں کی جانب سے ڈھائے گئے مظالم کی وجہ سے بھارت بہتر پوزیشن میں تھا اور اس نے محسوس کیا کہ غیر ملکی میڈیا بلا تصدیق مبالغہ آرائی پر مبنی ہر کہانی کو قبول کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا جس میں ڈھاکہ میں ڈھائے جانے والے مظالم کو پیش کیا گیا ہو''۔[۳۳]

گو کئی حلقوں کی جانب سے بلا جواز'' تین ملین' کے اعداد و شمار کو دہرایا جاتا رہا لیکن دعوؤں اور حقائق کے مابین پایا جانے والا فرق مبصرین کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا۔

۶ جون ۱۹۷۲ء کو دی گارجین میں'' لاکھوں لاپتہ''، ''The Missing Millions'' کے

نام سے شائع ہونے والی رپورٹ میں ولیم ڈرمنڈ رقم طراز ہیں، ”شیخ مجیب نے جنوری کے اوائل میں بنگلہ دیش آنے کے بعد تین ملین افراد کے مارے جانے کا ذکر بار بار دہرانے سے بعض فی نفسد ان میں جواز پیدا ہو جاتا ہے اور پھر کسی قسم کے حوالوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ میں نے بنگلہ دیش کے کئی دورے کیے ہیں اور گاؤں کی سطح سے لے کر حکومتی اہلکاروں تک سے میں نے اس سلسلے میں بات کی ہے۔ اپنی ساری کاوششوں کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ تین ملین اموات کا دعویٰ اس قدر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے کہ یہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے“۔[۳۴]

اپریل ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں کہ جانب سے ہزاروں لاشوں اور قبروں کے دعووں کے برعکس ہنری کسنجر کے مطابق محض بیس کے لگ بھگ لاشیں مل پائیں، اس واقعے سے متعلق جون ۱۹۷۲ میں ڈرمنڈ لکھتے ہیں کہ، ” اس بات میں کوئی شبہ نہیں کے بنگلہ دیش کے طول و عرض میں ”اجتماعی قبریں“ موجود ہوں گی۔ لیکن کوئی شخص بھی حتیٰ کہ پاکستان کا شدید ترین مخالف شخص بھی اب تک یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ ان تمام قبروں میں ایک ہزار سے زائد مقتولین کو دفن کیا گیا ہے۔ مزید برآں کسی شخص کے محض اجتماعی قبر میں موجود ہونے کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا ہے کہ اسے پاک آرمی کے اہلکاروں نے ہی قتل کیا ہوگا“۔

جیسا کہ شروع کے ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ بنگلہ دیش میں میرا اپنا تجربہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے، بہت سے واقعات میں مرنے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ بتائی گئی ہے جو حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتی ہے۔ ”قتل گاہوں“ اور ”اجتماعی قبروں“ کا ذکر تو ہر جگہ سننے کو ملا، لیکن کسی نے جدید سائنسی انداز سے ان شواہد کی شفاف انداز سے تحقیق کروانے کی زحمت گوارا نہ کی، حتیٰ کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں موجود قبروں کے بارے میں بھی کسی قسم کی تفتیش عمل میں نہ لائی گئی۔ مزید برآں جیسا کہ ۱۹۷۲ء میں ڈرمنڈ لکھتے بھی ہیں کہ محض لوگوں کی باقیات سے حقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس بات کا یقین کرنے کے لیے، کہ مرنے والا شخص بنگالی تھا یا غیر بنگالی، عسکریت پسند تھا یا غیر عسکریت پسند، کیا اس کی موت ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران ہوئی یا اسے پاکستانی فوج کے اہلکاروں نے قتل کیا یا کسی اور نے، ایک جامع تحقیقی و تفتیشی عمل کی ضرورت ہے۔ ڈرمنڈ یہ لکھتے ہیں کہ پاکستان آرمی نے واقعتاً لوگوں کو قتل کیا تھا لیکن جس انداز سے بنگلہ دیشیوں کی طرف سے کہانیاں بیان کی گئی ہیں اس سے اصل واقعات کی حقانیت بھی معدوم پڑنے لگتی ہے۔ ڈرمنڈ کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۲ء میں بنگلہ دیشی وزارت داخلہ کی طرف سے کی جانے والی فیلڈ تفتیش کے دوران یہ بات ان کے سامنے آئی کہ پاکستان آرمی کی جانب سے قتل کیے جانے والے افراد کے ضمن میں

۲،۰۰۰ شکایات درج کرائی گئیں۔

حالات و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''تین ملین'' کے اعداد و شمار کی حیثیت ایک افواہ عظیم سے زیادہ نہیں۔ جب تک ان اعداد و شمار کی مناسب جانچ پڑتال نہ کرلی جائے دانشوروں اور اسکالروں کو چاہیے کہ انھیں دُہرانے سے گریز کریں۔ نیز جب تک شفاف انداز سے تخمینہ لگانے کے بعد متعلقہ حکومتوں کی جانب سے سرکاری اعداد و شمار جاری نہ کردیے جائیں دیگر ذرائع کی جانب سے اموات کی بابت اعداد و شمار کو قبول نہ کیا جائے۔

دوسری جانب پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی نئی بننے والی حکومت کی جانب سے جنگ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی شکست سے متعلق تفتیش کے لیے بنائے جانے والے حمودالرحمان کمیشن نے ایک رپورٹ پیش کی ہے جس کے چند اقتباسات کو پاکستان میں شائع بھی کیا جاچکا ہے۔ حمودالرحمان کمیشن رپورٹ میں ''تین ملین'' اموات سے متعلق کچھ یوں لکھا گیا ہے: ''بنگلہ دیشی حکام کی جانب سے پاکستان آرمی کو تین ملین بنگالیوں کو قتل کرنے اور ۲۰۰،۰۰۰ مشرقی پاکستانی خواتین کی آبروریزی کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پیش کیے جانے والے یہ اعداد و شمار انتہائی مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔

''اتنا نقصان تو اُس وقت بنگلہ دیش میں موجود پاکستان آرمی کی پوری نفری اس صورت میں بھی نہیں پہنچا سکتی تھی کہ وہ تمام کام چھوڑ کر صرف یہی کام کرتے رہتے''۔[۳۵]

ڈھاکہ کی جانب سے پیش کیے گئے اعداد و شمار کو ''یکسر خیالی اور غیر حقیقی'' قرار دینے کے بعد کمیشن نے ازخود اموات سے متعلق اعداد و شمار پیش کیے: ''...... جی ایچ کیو کی جانب سے ہمیں مہیا کی جانے والی تازہ ترین معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان آرمی کی جانب سے لیے گئے فوجی ایکشن میں تقریباً ۲۶۰۰۰ افراد قتل ہوئے۔ یہ تعداد ان رپورٹوں پر مبنی ہے جو حالات و واقعات کے پیش نظر مشرقی کمانڈر نے وقتاً فوقتاً جی ایچ کیو کو ارسال کی تھیں''۔

حمود الرحمان کمیشن کے خیال میں ۲۶۰۰۰ ہلاکتوں کے اعداد و شمار میں جانبداری کا پہلو ہو سکتا ہے، لیکن یہ جانبداری بھی تعداد کو زیادہ دکھانے میں ہو سکتی ہے نہ کہ کم دکھانے میں: ''اس بات کا امکان موجود ہے کہ ان اعداد و شمار میں بھی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہو۔ کیونکہ کم تعداد بتانے میں خدشات لاحق تھے کہ بغاوت سے نمٹنے کے ضمن میں ان کی اپنی کمزوریاں ظاہر ہو جائیں''۔ کمیشن نے دیگر قابل بھروسہ ذرائع کی عدم موجودگی میں مشرقی کمانڈر کی جانب سے جی ایچ کیو کو بھیجی جانے والی رپورٹ کی بنیاد پر ۲۶۰۰۰ کے اعداد و شمار کو مقبول قرار دیا۔ اس بات کو بھی کمیشن

نے مدنظر رکھا کہ مذکورہ رپورٹیں جی ایچ کیو کو ارسال کرتے وقت مشرقی پاکستان میں موجود فوجی افسران کے ذہن میں یہ شائبہ موجود نہ تھا کہ انھیں اس حوالے سے احتساب کا سامنا کرنا ہوگا''۔[۳۶]

اس طرح ہم پاک آرمی کی کمیونیکیشن کی بنیاد پر حمودالرحمان کمیشن رپورٹ کے مطابق ۲۶۰۰۰ اموات اور بنگلہ دیش اور بھارت کی جانب سے بے بنیاد طور پر پیش کیے جانے والے تین ملین کے اعداد و شمار کے مابین کھڑے ہیں۔

سیزن اور روز نے تحقیق کے سائنسی قواعد و ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مارے جانے والے افراد کی تعداد کا پتہ لگانے کی کوشش بھی کی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

بھارت نے پاکستان کی جانب سے ظلم و جبر کا نشانہ بنائے جانے والے افراد کی تعداد تین ملین مقرر کی ہے، اور اب تک عموماً انہی اعداد و شمار کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ ہم نے دو ایسے بھارتی اہلکاروں کا انٹرویو کیا جو ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے مسئلے پر اہم ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ جب ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش میں ہونے والی اصل ہلاکتوں کے بارے میں ایک سے سوال پوچھا گیا تو اس نے ''۳۰۰,۰۰۰'' کے لگ بھگ کہا۔ اس پر اس کے ساتھی نے اشارۃً اس سے اختلاف کیا تو اس نے ۳۰۰,۰۰۰ کو ۵۰۰,۰۰۰ کر دیا۔[۳۷]

اس گفتگو سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بھارتی اہلکار اب تک ایسے بے بنیاد اعداد و شمار پیش کر رہے تھے جو خود ان کے سروں پر سے گزر رہے تھے۔ البتہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد بتانے کے خواہاں تھے۔ گو کہ اس افسر کی طرف سے بتائی جانے والی ۳۰۰,۰۰۰ کی تعداد بھی حقائق کے منافی تھی لیکن اختلاف کرنے والے اہلکار اکیلے نہیں اسی لیے اسے مزید بڑھا چڑھا کر ۵۰۰,۰۰۰ کر دیا گیا۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی تعداد زمینی حقائق پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے مسترد کر دیئے جانے کے لائق ہے۔

سیزن اور روز ہلاکتوں کی ممکنہ تعداد کے مسئلے پر ایک اور اہم نکتہ اٹھاتے ہیں (تعداد جو بھی ہو): ''...... ابھی بھی ممکن ہے کہ ایسی تعداد کا پتہ لگایا جا سکے جسے ہم قابل بھروسہ کہہ سکتے ہوں جیسا کہ (۱) کتنے ''عسکریت پسند'' اس جنگ میں مارے گئے، (۲) کتنے بہاری مسلمان اور پاکستان کے حامی مسلمان بنگالیوں کے ہاتھوں قتل کیے گئے، (۳) کتنے لوگ پاکستان، بھارت اور مکتی باہنی کی فائرنگ اور بمباری سے مارے گئے۔ ایک بات تو واضح ہے۔۔۔ ظلم و جبر کسی بھی لحاظ سے صرف ایک جانب سے نہ کیا گیا، البتہ بنگالی مسلمان اور ہندو بنیادی طور پر جبر و ستم کا نشانہ معلوم ہوتے ہیں''۔[۳۸]

بلاشبہ جیسا کہ گزشتہ ابواب میں ذکر آچکا ہے کہ مرنے والوں میں قابل ذکر تعداد ان غیر بنگالی افراد کی ہے جو بنگالیوں کے لسانی تعصب کی بھینٹ چڑھے۔ جہاں تک ان رپورٹوں کا

تعلق ہے جن میں زمین اور دریاؤں کو لاشوں سے بھرا بتایا گیا ہے، تو ان رپورٹوں میں جہاں مردوں، عورتوں اور بچوں کا ذکر ملتا ہے وہ لازماً بہاری ہی تھے۔ کیونکہ بنگالیوں نے بہاریوں کو بلا امتیاز قتل کیا تھا۔ جبکہ دوسری جانب پاکستان آرمی کے اہلکاروں نے صرف بالغ بنگالی مردوں کو نشانہ بنایا تھا۔ ہلاک ہونے والے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں تفریق کرنا بھی مشکل ہے۔ اس طرح عسکریت پسندوں اور غیر عسکریت پسندوں میں تمیز کرنا بھی ممکن نہیں ہے، کیونکہ بنگالیوں کی طرف سے ہلاک ہونے بہت سے عسکریت پسند سویلین ہی دکھائی دیتے تھے۔ جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ چند سویلین افراد باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ قتل کیے گئے لیکن بہت سے سویلین ایسے بھی تھے جو کہ دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آکر یا بمباری کے نتیجے میں جاں بحق ہوئے۔ حقیقتاً، فی الوقت یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ہلاکتوں کی علیحدہ علیحدہ درجہ بندی کی جا سکے — یعنی بنگالی یا غیر بنگالی، عسکریت پسند یا غیر عسکریت پسند، اور عملاً یا خطاً قتل کیے جانے والے افراد۔

اس سلسلے میں مزید پیچیدگی اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ زمان و مکان کے لحاظ سے ہلاکتوں میں بہت تجاوز پایا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ ابواب میں ذکر آچکا ہے کہ زیادہ تر ہلاکتیں مسلح تصادم کے آغاز — مارچ اور اپریل — اور آخر میں پاکستان اور بھارت کی کھلی جنگ کے دوران نومبر — دسمبر میں ہوئیں۔ چند دیہات جیسا کہ ستیار چورا، تھانہ پاڑہ اور چکنگر وغیرہ میں سال بھر کے دوران ایک آدھ ہی بڑا واقعہ پیش آیا جبکہ چند دیہات ایسے واقعات سے نسبتاً محفوظ رہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی خاص جگہ پر ساری توجہ مرکوز کر کے ہلاکتوں کی درست تعداد کا اندازہ لگایا جا سکے۔

اس ضمن میں صحیح تعداد کا اندازہ مسلح افواج سے ہی مل سکتا ہے گو کہ ہم اسے بھی سو فیصد درست نہیں کہہ سکتے۔ بھارتی آرمی کے لیفٹیننٹ جنرل جے ایف آر جیکب کے مطابق (صرف دسمبر کے مہینے میں) بھارت کی جانب ۱۴۲۱ ہلاکتیں ہوئیں، ۴۰۵۸ افراد زخمی ہوئے اور ۵۶ افراد لاپتہ تھے، جو غالباً مارے گئے تھے۔ بھارت کی جانب سے آغاز ہی میں مداخلت اور پاکستانی اور بنگلہ دیشی دعووں کے پیش نظر بھارت کو دسمبر سے پہلے بھی جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بھارت کو ہونے والا جانی نقصان نا معلوم لیکن مذکورہ نقصان سے زیادہ تھا۔ جیکب کے مطابق بھارت کی جانب سے پاکستان کو پہنچنے والے نقصانات کی تفصیل درج ذیل ہے: ۲۶ مارچ اور ۳ دسمبر کے درمیان ۴۵۰۰ افراد مارے گئے اور ۴۰۰۰ افراد زخمی ہوئے؛ ۴ سے ۱۶ دسمبر کے درمیان، ۲۲۶۱ ہلاکتیں اور ۴۰۰۰ افراد زخمی ہوئے۔ اس طرح کُل ہلاکتیں ۶۷۶۱ تھیں جبکہ زخمی

ہونے والوں کی تعداد ۸۰۰۰ تھی۔[۳۹] جنرل نیازی بھی اگر زیادہ نہیں تو ۳ دسمبر تک مشرقی پاکستان میں تعینات پاکستانی فوج کے ۴۰۰۰ اہلکاروں کے ہلاک ہونے اور لگ بھگ اتنے ہی افراد کے زخمی ہونے کی توثیق کرتے ہیں۔[۴۰]

اس تحقیق کے دوران چند ذرائع میں پائے جانے والی افراط (با تفریط) سے اعداد و شمار کے مسئلے کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے مرتب کیا گیا قرطاس ابیض دعویٰ کرتا ہے کہ یکم مارچ 1971 سے شروع ہونے والی "عوامی لیگی دہشت گردی" کے دوران بنگالی قوم پرستوں نے ۱۰۰،۰۰۰ سے زائد مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔[۴۱] اس بات میں کسی کو کلام نہیں کہ بنگالیوں کی طرح پاکستانیوں نے بھی قرطاس ابیض میں ہلاکتوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کیا۔ تاہم باب چہارم و باب ہشتم میں کھلنہ کے واقعات کے دوران یہ بات سامنے آئی تھی کہ بنگالیوں کی جانب سے ہر واقعے میں ہزاروں بہاری مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ اس لحاظ سے قتل کیے جانے والے بہاریوں کی تعداد کا تخمینہ با آسانی ۱۰۰،۰۰۰ کے قریب لگایا جا سکتا ہے۔

جنگ کے دوران مخالفین عموماً ایک دوسرے کو پہنچانے والے جانی نقصان کو کم کر کے نہیں بتاتے۔ اس کے برعکس اپنی کارکردگی کو بہتر طور پر پیش کرنے کی غرض سے عموماً تعداد کو بڑھا چڑھا کر بتایا جاتا ہے۔ فوجی آپریشن شروع ہونے کے بعد دونوں اطراف سے بھاری نقصانات کی خبریں ملتی ہیں۔ جیسا کہ باب چہارم میں ذکر کیا گیا ہے کہ کشٹیا کہ مقام پر مورچہ بند جنگ اور پھر بعد میں گھات لگا کر ۱۴۴ پاکستانی مسلح اہلکاروں کو قتل کیا گیا۔ البتہ ستیار چورا کے علاقے میں موجود علیحدگی پسند بنگالیوں کے اچانک فوج کے سامنے آنے کے بعد ۲۰۰ سے ۲۵۰ کے لگ بھگ فوجیوں کو ہلاک کرنے کے دعوے میں بڑی حد تک مبالغہ آرائی نظر آتی ہے۔

ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک فوٹو گرافر ۲۶-۲۵ مارچ کو شروع ہونے والے فوجی آپریشن کے بعد سے چند دنوں تک ڈھاکہ سے ملک بدر کیے جانے سے محفوظ رہا۔ مذکورہ فوٹو گرافر نے یہ رپورٹ پیش کی کہ اقبال ہال (ڈھاکہ یونیورسٹی) میں ۲۰۰ طلبہ کو قتل کیا گیا تھا۔[۴۲] جیسا کے باب سوم میں بھی ذکر آ چکا ہے کہ ڈھاکہ میں اس رات آپریشن کے ایک اہم ذمہ دار فوجی افسر نے مجھے بتایا کہ اقبال ہال میں ۱۲ اور جگن ناتھ ہال میں ۳۲ افراد مارے گئے تھے۔ اسی باب میں مختلف شواہد کی بناء پر ہم نے یہ بھی دیکھا تھا کہ یونیورسٹی میں اس رات مارے جانے والے افراد کی تعداد ۷۰ کے قریب تھی، ان مقتولین میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن سے لاشوں کو جمع کروایا گیا اور بعد ازاں انہیں بھی قتل کر دیا گیا جبکہ یونیورسٹی میں ہونے والے ایکشن میں حصہ لینے والی رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر کے

مطابق یہ تعداد ۳۰۰ تھی۔ یونیورسٹی میں بنائی گئی یادگار پر پورے سال کے دوران مارے جانے والے ۱۴۹ افراد کے نام درج ہیں۔ یادگار پر موجود فہرست بھی ابتدائی پریس رپورٹ کے دعووں سے متضاد نظر آتی ہے۔

بالکل اسی طرح، باب چہارم میں ہم پڑھ کر آئے ہیں کہ پرانے ڈھاکہ میں واقع ہندوؤں کے علاقے شنکھر یپارہ میں عینی شاہدین کے مطابق ۲۶ مارچ کو آرمی نے ۱۴ سے ۱۵ افراد اور ایک بچے کو قتل کیا لیکن ایک معروف پاکستانی صحافی نے اس واقعے میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۸۰۰۰ کے لگ بھگ بتائی ہے۔ باب ششم میں شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۲۰ مئی کو چلکنگر میں بڑے پیمانے پر ہونے والے قتل عام کے واقعے میں سینکڑوں ہندو پناہ گزین مارے گئے تھے۔ جبکہ بنگلہ دیشی دانشوروں کی جانب سے اس واقعے کو ۷۱ء کے واقعات میں ایک ''سانحہء عظیم'' بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی اور ہلاکتوں کی تعداد ۱۰،۰۰۰ کے لگ بھگ بتائی گئی ہے۔ یہ الزام بھی صرف ایک پلاٹون کے برابر فوجیوں پر لگایا گیا ہے کہ جو محض چھوٹے ہتھیاروں سے لیس تھے۔

دستیاب شواہد جن پر اس تحقیق میں بحث ہو چکی ہے ان کے مطابق ایک محتاط انداز کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۱ کے واقعات میں بنگالیوں، غیر بنگالیوں، مسلمانوں، ہندوؤں، پاکستانیوں، بھارتیوں، عسکریت پسندوں اور غیر عسکریت پسندوں کو ملا کر ۵۰،۰۰۰ سے ۱۰۰،۰۰۰ کے درمیان ہلاکتیں ہوئی ہونگی۔ اگر کوئی کہے کے ہلاکتوں کی تعداد ۱۰۰،۰۰۰ سے زائد تھی تو اسے بھی مانا جا سکتا ہے لیکن اس سے آگے کے دعوے بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں۔

تشدد اور تعصب کا راستہ۔ اعداد و شمار سے ہٹ کر ۱۹۷۱ کے واقعات کو نسل کشی کے تناظر میں دیکھنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ نسل کشی جیسے جرائم کی بنیاد اس بات پر نہیں ہوتی کہ مرنے والوں کی تعداد کتنی تھی بلکہ اعتبار اس بات کا کیا جاتا ہے کہ لوگوں کو نسلی، قومی، لسانی اور مذہبی تعصب کی بنیاد پر قتل کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے کنونشن برائے تدارک و سزا برائے جرائم بابت نسل کشی مجریہ ۱۹۴۸ کے مطابق ''نسل کشی'' کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

نسل کشی سے مراد درج ذیل میں سے کوئی بھی ایسا فعل جو کلی یا جزوی طور پر کسی قومی، لسانی، نسلی یا مذہبی گروہ کو تباہ کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ جیسے:

(ا) کسی گروہ کے افراد کو قتل کرنا

ب) کسی گروہ کے افراد کو شدید ذہنی یا جسمانی ضرر پہنچانا

ج) عمداً کسی گروہ پر زندگی گزارنے کے لیے اپنی شرائط عائد کی جائیں جس کا نتیجہ

اس گروہ کی کلی یا جزوی تباہی کے طور پر سامنے آئے

د) کسی قوم میں پیدائش کو روکنے کے لیے اقدامات کرنا

ہ) کسی ایک گروہ کے بچوں کو بالجبر کسی دوسرے گروہ میں منتقل کرنا۔

پاکستانی آرمی پر یہ الزام کہ اس نے بنگالیوں کی نسل کشی کی، وضاحت طلب ہے۔ ہم یہ بات اس طرح سے شروع کر سکتے ہیں کہ بنگال میں رہنے والے تمام ۷۰ ملین افراد بنگالی ہی کہلاتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ "بنگالیوں" کو نشانہ بنایا گیا درست نہ ہوگا۔ کیونکہ اس گنجان آبادی والے صوبے میں آزادی حاصل کرنے کے لیے لڑنے والے باغی بنگالی تھے تو اس بات میں کیا تعجب کہ پاکستان آرمی نے بغاوت کچلنے کے لیے جنگ میں باغیوں کو مارا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی سنگین واقعات میں بھی پاکستانی اہلکاروں نے تمام بنگالیوں کو نشانہ نہیں بنایا، جیسا کہ تھانہ پاڑا، چکنگر اور بوروئی ٹولہ کے واقعات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ۲۶-۲۵ مارچ سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں شروع ہونے والے تصادم سے لے کر تمام واقعات میں ہمیں ایک خاص طرز نظر آتا ہے، یعنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر صرف بالغ مردوں کو قتل کیا گیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں غیر بنگالی اسٹاف ممبران کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ دوسری جانب تمام مرد بنگالی بھی آرمی کے ہدف میں شامل نہیں تھے۔ حکومت وقت کے حامی بنگالی جنہیں علیحدگی پسند "رضا کار" کہتے تھے بذات خود آرمی اور حکومت وقت کی حمایت کر رہے تھے۔ بہت سے ایسے افراد بھی تھے جو کہ دونوں فریقوں میں کسی کے ساتھ نہ تھے اور زندہ بچ رہے، بلکہ بعض اوقات تو انہیں عسکریت پسندوں کے ساتھ گرفتار کرنے کے بعد تفتیش کر کے چھوڑ بھی دیا گیا جیسا کہ ڈھاکہ گوریلا گروپوں کی گرفتاری کے واقعات میں ہوا۔ تاہم ہندو و بالغ مردوں کو محض مذہبی بنیادوں پر ہی شر پسند سمجھا گیا۔

ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرمی نے مخالفین ہونے پر لوگوں کے سیاسی قتل کیے اور دوسری جانب بھارت کے ہم نوا ہونے کے ناطے انہیں غداری کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ ماورائے عدالتی سیاسی قتل کو گو کہ کتنے ہی بھیانک انداز میں کیے گئے اقوام متحدہ کی جانب سے کی گئی نسل کشی کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ بجائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ ٹارگٹ کو متعین کرنے کے لیے پاکستان آرمی نے چند پروفائل مقرر کر رکھے تھے یعنی سیاست (عوامی لیگ کا کارکن وغیرہ)، عمر (بالغ)، جنس مرد اور مذہب (ہندو)۔ موخر الذکر پروفائل یعنی مذہب کی بنیاد پر کیے گئے قتل کو ہم نسل کشی کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ البتہ اس بات کا شائبہ بھی موجود ہے کہ ان ہندوؤں کو قتل کرنے کے پیچھے بھی سیاسی محرکات موجود ہوں۔

جبکہ اس کے برعکس ۱۹۷۱ کے دوران پاک آرمی نے بہت سے ہندوؤں کو بھی کسی قسم کا کوئی ضرر نہ پہنچایا۔ جیسا کہ باب ششم میں ذکر آچکا ہے کہ عینی شاہدین کے مطابق دریا کے کنارے جمع ہونے والے سینکڑوں پناہ گزین ہندو اس وجہ سے بھارت نہیں جانا چاہتے تھے کہ انھیں آرمی سے کوئی خطرہ تھا بلکہ ان ہندوؤں کو ظلم وتشدد کا نشانہ بنانے والے بنگالی مسلمان تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی جانب سے بنگالی ہندوؤں کو لاحق خطرے کے محرکات سیاسی نہیں تھے بلکہ وہ یہ سب کچھ حب مال میں کر رہے تھے۔ ہندوؤں کو آرمی نے ڈرایا دھمکایا ہو قتل کیا ہو یا بنگالی مسلمانوں نے مجھے مجموعی طور پر اس سے یہی تاثر لیا کہ بنگال کو ہندوؤں سے پاک کرنے کی ایک سازش کی جارہی تھی۔

پاکستان آرمی کی جانب سے کیے جانے والے قتل عام کو تو صرف اس صورت میں نسل کشی گردانا جاسکتا ہے جب ان کے ٹارگٹ کا پروفائل ہندو ہوں۔ جب کہ دوسری جانب بنگالیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے بہاری اور مغربی پاکستانیوں کا قتل تو ہر لحاظ سے اقوام متحدہ کی جانب سے کی جانے والی نسل کشی کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ اس تحقیق میں درج حالات و واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی مسلمانوں نے جتنے بھی غیر بنگالی مسلمانوں اور بنگالی و غیر بنگالی ہندوؤں کو قتل کیا اس کی بنیاد لسانیت یا مذہب پر قائم تھی۔

''آزادی سے متعلق بنگالی تحریروں'' میں نازی جرمنوں کے ہاتھوں ڈھائے جانے والے مظالم سے مماثلت پیدا کرنے اور زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۷۱ کے واقعات کے لیے ''نسل کشی''، ''ہولوکاسٹ''، اور ''اجتماعی کیمپوں'' جیسی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح اموات کے اعداد وشمار میں ''ملین'' کا عدد بھی غالباً چھ ملین یہودیوں کے قتل سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تاکہ عالمی قوتیں بنگالیوں کی جانب متوجہ ہوں۔ ۱۹۷۱ کے واقعات سے ایک ایسے کلچر کو جنم دینے کی کوشش کی گئی ہے جس سے بھارت نے خوب فوائد حاصل کیے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان میں ۱۹۷۱ء کے دوران پیش آنے والے واقعات اور حقیقی ہولوکاسٹ میں کوئی باہمی ربط نہیں پایا جاتا۔ ہولوکاسٹ میں باقاعدہ منصوبے کے تحت دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں اوران کے اتحادیوں نے لاکھوں کی تعداد میں یورپی یہودیوں، دیگر اقلیتوں اور سیاسی مخالفین کو صفحہ ہستی سے مٹادیا تھا۔ اس طرح سے بے ہنگم حوالے دینا نہ صرف نازی ہولوکاسٹ کے متاثرین بلکہ ۱۹۷۱ میں مارے جانے والے لوگوں کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی۔ کیونکہ ان پر ڈھائے جانے والے مظالم اس بات کے متقاضی نہیں ہیں کہ انہیں بے جا مبالغہ

آرائی اور تحریف کے ساتھ پیش کیا جائے۔

جب ۲۶-۲۵ مارچ کی رات (پاکستان) آرمی شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس آئی تو وہ خائف تھے؛ فوجیوں نے غداری کے الزام میں انھیں گرفتار کرنے کے بعد قید میں ڈال دیا۔ جب ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کو (بنگلہ دیش) کی آرمی ان کے پاس آئی تو وہ انھیں اپنے لوگ سمجھ کر ملنے گئے؛ انھوں نے شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے سارے خاندان بشمول بیوی، دو بہوؤں، تین بیٹوں اور دس سال کے چھوٹے بیٹے کو قتل کر دیا۔

بالآخر بات وہیں پہنچی کہ نہ تو تعداد اہم ہے اور نہ ہی لیبل۔ اصل چیز جسے اہمیت دی جانی چاہیے وہ ہے تصادم کی نوعیت چونکہ بنیادی طور پر انتہائی پیچیدہ اور پرتشدد جدو جہد پر مبنی تھی، جس میں کئی گروہ حصول اقتدار کی خاطر نبرد آزما تھے۔ جس کا نتیجہ ہیبت ناک طور پر یہ نکلا کہ بڑے پیمانے پر انسانی جانوں کے ضیاع کا سانحہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اپنے پیچھے ایک ایسی سرزمین چھوڑ گئی جسے ورثے میں ایسے رویے ملے کہ لوگ اپنے سیاسی مخالفین کے ساتھ اس انداز سے پیش آئے کہ ان میں برداشت کا مادہ نہ تھا۔ انھوں نے سیاسی مخالفین کو ڈرایا، دھمکایا، ظلم و جبر کا نشانہ بنایا اور مٹا ڈالا۔

ضمیمہ ا:

کتابیات سے متعلق نوٹ

اس تحقیق کا ایک بڑا حصہ عملی کام اور ان انٹرویوز پر مبنی ہے جو بنگلہ دیش اور پاکستان میں کیے گیے اور اس ضمن میں اضافی کام برطانیہ اور امریکہ میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ جن لوگوں سے انٹرویو کیے گیے ان کی فہرست ضمیمہ نمبر ۲ میں موجود ہے جبکہ ان کے حوالے براہ راست کتاب کے متن میں موجود ہیں۔ یہاں مختصراً اس شائع شدہ مواد سے متعلق چند گزارشات پیش کرنی ہیں جو بنگالی اور انگریزی زبان سے لیا گیا۔

پینتیس سال گزرنے کے باوجود ۱۹۷۱ کے واقعات پر غیر جذباتی انداز میں کی گئی علمی تحقیق کا فقدان پایا جاتا ہے۔ بنگالی اور انگریزی زبانوں میں موجود مواد ان لوگوں کے ذاتی تجربات اور نظریات ہیں جو یا تو براہ راست اس تصادم میں شامل رہے یا ان لوگوں کی جانب سے تبصرے ملتے ہیں جن کا جھکاؤ ایک یا دوسری جانب نظر آتا ہے۔ ان تحریروں کو ہم ایسا تحقیقی کام قرار نہیں دے سکتے جس کے ذریعے سے غیر جانبدارانہ انداز میں اصل حقائق تک پہنچا جا سکے اور سوالوں کے جوابات دیے جا سکیں۔ اس کے علاوہ چند اہم افراد نے تو اپنے تجربات کو شائع بھی نہ کروایا۔

درج ذیل سطور میں سب سے پہلے اس کام کی بابت بحث کی گئی ہے جو علمی اور تحقیقی ہے اور یہ کام ان افراد نے کیا ہے جو براہ راست جنگ کا حصہ نہ تھے۔ اس کے بعد ان سرکاری دستاویزات پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے جنھیں اس تحقیق میں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد ذاتی یادداشتوں اور تبصروں پر بحث کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض تحریریں انتہائی جانبدار اور تنگ نظری کی آئینہ دار ہیں۔ بعض تحریریں جنگ کا حصہ بننے والے افراد کی ذاتی روداد پر مبنی ہیں، ایسی تحریریں ہمارے لیے نبیادی معلومات کا ذریعہ ہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسی تحریروں میں حقائق کو ذاتی تبصروں سے علیحدہ کر کے دیکھا جائے۔ میڈیا سے متعلق مواد کو یہاں زیر بحث نہیں لایا گیا بلکہ کتاب کے اندر ہی ان کے حوالے دیئے جا چکے ہیں۔

اس مباحثے کا مقصد کار قارئین کے مشاہدے میں اشاعت کردہ مواد کی مقدار اور نوعیت کو

لانا ہے بالخصوص ان کی توجہ اس جانب مبذول کرانا ہے کہ غیر جذباتی اور تحقیقی مواد کی قدر میں کمی ہے۔ اس بحث کے دوران شائع کردہ مواد کی مشترکہ مسائل اور خواص کی بنیاد پر گروہ بندی بھی کی گئی ہے۔ البتہ ہر تحریر پر جامع نظر ثانی یہاں ممکن نہیں ہے۔

غیر شریک دانشوروں کا تحقیقی کام

۱۹۷۱ کی جنگ سے متعلق کسی بھی قسم کی بحث کا آغاز رچرڈ سیزن اور لیو روز کی War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh (1990) سے ہونا چاہیے۔ یہ واحد ایسی کتاب ہے جنھیں معتبر مصنفین نے اصل حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ انداز سے تصنیف کیا ہے۔ اس کتاب میں بنیادی مواد کو جدید تحقیقی تقاضوں کی بنیاد پر جامعیت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ جو کوئی بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے اسے یہ کتاب لازماً پڑھنی چاہیے۔ اس کتاب میں مسئلے کو پالیسی اور پالیسی سازوں کی سطح تک زیر بحث لایا گیا۔ کتاب کا مواد پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور امریکہ میں موجود اہم کرداروں سے ۷۰ کی دہائی میں کیے گئے انٹرویوز اور امریکہ میں موجود تاریخی دستاویزات پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں تمام واقعات اور پالیسیوں کو از سر نو مرتب کر کے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ مختلف سطحوں پر ہونے والی جنگوں کا جائزہ لیا جاسکے یعنی مشرقی پاکستان میں ہونے والی خانہ جنگی اور دو ممالک کے درمیان جنگ — سیزن اور روز کی جانب سے مرتب کیا گیا مواد جنوبی ایشیا کو سمجھنے کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ انٹرویو دینے والوں کی اکثریت دار فانی سے کوچ کر چکی ہے، اس لیے انھیں دہرانا اب ممکن نہیں رہا۔ سیزن اور روز کی کتاب واقعات کو ان کہانیوں سے بالکل ہٹ کر بیان کرتی ہے جو بھارت اور بنگلہ دیش میں زبان زد و عام تھیں، یا جیسا کہ پاکستان میں سوچا جاتا تھا۔

وین ولکوکس (Wayne Wilcox) کی The Emergence of Bangladesh ہماری توجہ اس جانب مبذول کرواتی ہے کہ ان واقعات سے سبق حاصل کرنے کے بعد جنوبی ایشیا میں مستقبل کی امریکی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے ۱۹۷۳ میں شائع کی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے جس میں ۱۹۷۱ کے واقعات کو تجزیاتی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر و ممبر برائے ساوتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ کولمبیا یونیورسٹی، ولکوکس ۱۹۷۰ کی دہائی میں امریکی پالیسی اور انتخاب کو زیر بحث لانے سے قبل ۱۹۷۱ کے واقعات کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔ انتہائی دلچسپ دلائل پر مبنی حالات و واقعات کا مفید تجزیہ بھی اس میں ملتا ہے۔ اس کتاب میں تحقیق

کو اسی رخ پر کیا گیا ہے جس رخ پر کچھ عرصے بعد سیزن اور روز نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا۔

آل سولز کالج، اوکسفرڈ (All Souils College, Oxford) کے رفیق رابرٹ جیکسن نے ۱۹۷۲ میں بہار کے موسم میں بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کا دورہ کیا۔ اپنے دورے سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پر انھوں نے انسٹی ٹیوٹ فار اسٹریٹیجک اسٹڈیز کے لیے" جنوبی ایشیا کا بحران" (South Asian Crisis) نامی کتاب تحریر کی جو ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اس جامع کتاب میں حالات و واقعات کو بڑی قوتوں کے مفادات کے تناظر میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کتاب میں بھی تحقیقی انداز دیگر مغربی اسکالروں جیسا ہی ہے گو کہ چند باتوں میں اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن آخری باب میں بحث کو سمیٹتے ہوئے کم وبیش وہی نتائج سامنے آتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اسکی ذمہ داری بڑی قوتوں اور بھارت کی جانب سے کی جانے والی مداخلت پر عائد ہوتی ہے۔

چند ایسی تحریریں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن کے لکھنے والے براہ راست تو اس بحران کا حصہ نہ تھے لیکن کسی نہ کسی لحاظ سے ان کا تعلق اس بحران سے تھا۔ ان تحریروں میں ہمیں کم وبیش جانبداری کا عنصر محسوس ہوتا ہے۔ تین مصنفین کو ہم اس کٹیگری میں شامل کر سکتے ہیں ان میں سے ایک بنگلہ دیشی، دوسرا پاکستانی اور تیسرا برطانوی ہے۔

بنگلہ دیشی مصنف رونق جہاں ہیں جن کی کتاب Pakistan: Failure in National Integration "The disintegration of Pakistan and Birth of Bangladesh" یعنی پاکستان کی تحلیل اور بنگلہ دیش کا قیام کے نام سے تتمہ موجود ہے۔ تاریخ اشاعت اور کتاب کے خلاصے سے ظاہر ہے کہ رونق جہاں کی کتاب ۱۹۷۱ء کے ان واقعات کا احاطہ کرتی ہے جن کی وجہ سے بالآخر بنگلہ دیش کا قیام ممکن ہوا، ان واقعات میں بالخصوص ایوب دور کی پالیسیاں بھی زیر بحث ہیں۔ تتمہ کا ایک تہائی حصہ ۱۹۶۹ سے شروع ہونے والے واقعات کا تجزیہ کرتا ہے، یہ تجزیہ متوازن اور مختصر ہے ان واقعات میں رونق جہاں نے، یحییٰ کی ایوب سے مختلف پالیسی، سیاسی عمل کو اہمیت دینا، رواداری کا رویہ، بنگالیوں کے مسائل کو اہمیت دینا اور ۱۹۷۰ کے عام انتخابات کروانے جیسے واقعات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس تحریر میں انتخابات کے بعد ۱۹۷۱ء میں پیدا ہونے والی صورتحال کا ذمہ دار بھٹو کو قرار دیا گیا۔ تاہم، نو ماہ کے اس تصادم پر مشتمل آخری حصے میں یہ بحث بلا جواز انداز سے عوامی زبان بولنے لگتی ہے۔ اس مقام پر یہ تحریر ایک بنگلہ دیشی تحریر معلوم ہوتی ہے جس میں ہنگامی حریت پسندوں، بھارت کے محدود کردار، پاک آرمی کے وحشیانہ کردار اور نو ماہ کے دوران ایک سے تین ملین افراد کے لگ بھگ مارے جانے والے بنگالیوں کا ذکر ملتا ہے"۔

کمال متین الدین، پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر رہے اور بعد میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹیجک اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیں۔ متین الدین اپنی کتاب Tragedy of Errors: East Pakistan Crises (۱۹۹۳) ۷۱-۱۹۶۸ ''زونق جہان'' کی جانب سے بنگالیوں کے مبینہ خلاف امتیازی سلوک کو زیر بحث لاتے ہیں۔ یہ کتاب اس سانحہ کو سمجھنے کیلیے کافی مفید ہے جس میں مصنف نے صحیح مواد کا تجزیہ کرتے ہوئے آرمی اور حکومت وقت کی پالیسیوں کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔ تاہم پاکستانی جنرل ہونے کے ناطے شاید وہ مکمل طور پر غیر جانبدار نہ رہ سکے۔ ان کی جانبداری بالخصوص ہندو طلبا کے کردار، غیر بنگالیوں کے قتل عام، بھارت کی طویل مداخلت اور عوامی لیگ کی جانب سے آرمی کے خلاف سازش جیسے عنوانات میں جھلکتی نظر آتی ہے۔

برطانوی مورخ، سرکاری افسر اور صحافی، ایل ایف رش بروک ولیمز نے اس بات کو محسوس کرتے ہوئے کہ بحران کو عجیب انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، بحران کے دنوں میں ہی ۱۹۷۱ء میں The East Pakistan Tragedy کے نام سے ایک کتاب تحریر کی۔ وہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا تین مرتبہ دورہ کر چکے تھے اس لیے یہاں کی سرزمین سے واقف تھے۔ رش بروک ولیمز ایک ایسے غیر ملکی تھے جو کہ خطے سے اچھی طرح واقف تھے اور کسی ایک فریق کے ساتھ جانبداری کا شاید ان سے تعلق بعید از قیاس ہے۔ اس کتاب میں رش بروک ہمیں پاکستانی حکومت اور آرمی کا بھرپور دفاع کرتے نظر آتے ہیں خواہ معاملہ قدرتی آفات سے نمٹنے کا ہو، یا انتخابات کے بعد مذاکرات اور آرمی ایکشن کا رش بروک پاکستان کی پالیسیوں کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ آرمی کی جانب سے کیے گیے ایکشن کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے جب کہ عوامی لیگ درحقیقت ''نسل کشی'' کے جرم میں ملوث رہی ہے رش بروک کی یحییٰ خان تک رسائی، قرطاس ابیض سے صرف نظر دور پاکستان کے حق میں ایک جھکاؤ سا دکھائی دیتا ہے۔ نیز عوامی لیگ، بھارت اور مغربی میڈیا پر کڑی تنقید سے اس جھکاؤ میں مزید تقویت دیکھنے کو ملتی ہے۔

اس کتاب میں ۱۹۷۱ء کے واقعات کو بعض اوقات جنوبی ایشیا میں جاری جنگ کے وسیع تناظر میں بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال British Medical Journal(2008) میں مشمولہ اوبرمیئر اور دیگر (Obermeyer) میں بین الاقوامی جنگوں کے دوران ہونے والی ہلاکتوں کے باعث ہیں۔ ان مسلح تصادم سے متعلق مواد کو اپسالہ یونیورسٹی (Uppsala University) اور انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اوسلو میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات سے اس تحقیق کو اس

طرح منطق کیا گیا ہے کہ اوسطاً ڈیٹا کے مطابق جنگ میں مارے جانے والے افراد کی تعداد ۵۸۰۰۰ کو جنگ کی اہمیت کم کرنے کی سازش قرار دے کر اس میں ترمیم کی گئی اور تعداد کو ۲۶۹،۰۰۰ تک پہنچایا گیا (اس سلسلے میں ۱۲۵،۰۰۰ سے ۵۰۵،۰۰۰ کے درمیان سے اوسط نکالی گئی)۔

سرکاری دستاویزات

امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے ۱۹۷۱ کی جنگ سے متعلق دستاویزات "South Asia Crises 1971" کے نام سے جاری کر دی ہیں، یہ دستاویزات Foreign Relations of the United States, 1969-1976 (2005) کی جلد نمبر XI میں محفوظ ہیں۔ یہ دستاویزات بحران کے دور میں نکسن انتظامیہ اور امریکہ کی پالیسیوں کو جاننے کے لیے ایک خزانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جنوبی ایشیاء کے ممالک سے اس سلسلے میں ملنے والی محدود سرکاری دستاویزات نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ کئی وجوہات کی بنا پر انھیں معتبر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حکومت پاکستان نے مشرقی پاکستان کے بحران پر قرطاس ابیض اگست ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ اس دستاویز میں مابعد انتخابات ۱۹۷۲ء کے واقعات، مذاکرات اور عوامی لیگ کی جانب سے مبینہ دہشت گردی کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بھارت کے کردار اور بنگالیوں کے جانب سے ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد بڑے پیمانے پر ڈھائے جانے والے مظالم پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اس دستاویزات کا سب سے بڑا منفی پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک جانب سے سرکاری نقطۂ نظر کو بیان کیا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر کو قبول کرنے سے قبل آزاد ذرائع سے اس کی توثیق کرنا لازم ہے۔ لیکن اس دستاویز کا مثبت پہلو یہ ہے کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی تاریخوں، واقعات اور جگہوں سے محقق کو مدد فراہم ہو جاتی ہے کہ وہ ان کی بنیاد پر آزادانہ ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ان کی توثیق کر لے۔ میجر جنرل شوکت ریاض پاکستان آرمی (۱۹۶۶ — ۷۱) کی تحریر بھی اسی مسئلے سے دوچار ہے کہ وہ جنگ کے اہم فریقوں میں سے ہیں نیز ان کی یہ تحریر ایک فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے۔ تاہم اس تحریر میں بھی کئی اہم تاریخوں، مقامات، واقعات اور فوجیوں کی تعیناتی کا ذکر ملتا ہے جو کہ محقق کے لیے انتہائی اہم ثابت ہو سکتے ہیں۔

حکومت پاکستان کی جانب سے جاری کی گئی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ جو Vanguard Books کی جانب سے شائع کی گئی، محدود پیمانے پر فائدہ مند ہے۔ گو کہ یہ رپورٹ کئی مسائل سے

دوچار ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ یہ بات مستقلاً کہی جاتی رہی ہے کہ کمیشن کی مکمل رپورٹ کو شائع ہی نہیں کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی بڑا مسئلہ کمیشن کے ارکان کے دائرہ کار اور محدود دائرۂ اختیار ہے، نیز اس رپورٹ میں پیش کیے گئے تجزیات اور شواہد بھی مبینہ طور پر معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ اس رپورٹ میں پیش کیے جانے والے ''شواہد'' مدعا علیہان کی غیر موجودگی میں محض ''الزامات'' تک ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں، اپنایا گیا طریقہ کار بھی غیر مربوط دکھائی دیتا ہے۔ رپورٹ سے اخذ کیے گئے نتائج چند افراد کی کڑی تنقید پر مبنی نظر آتے ہیں جن میں بنیادی طور پر جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی شامل ہیں، جو اس تذبذب کے عالم میں آسان اہداف بھی تھے۔ اس تفتیش میں ان حضرات کو ملزم ٹھہرانے کے مواقع بھی کم ہی تھے بشمول جنرل ٹکا خان اور جنرل فرمان علی کے۔ جبکہ دوسری جانب سیاستدانوں میں تو ذوالفقار علی بھٹو بذات خود برسراقتدار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ کمیشن نے کئی افراد پر سرعام مقدمہ چلانے اور کورٹ مارشل کرنے کی سفارش کی تھی، جن میں جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی بھی شامل تھے اور ان دونوں نے بھی کسی ایسے مقدمے کو موقع غنیمت جانتے ہوئے خود کو پیش کر دیا تھا۔ تاہم اس طرح کا کوئی مقدمہ چلایا گیا نہ کورٹ مارشل کیا گیا اور اس طرح سے اکٹھے کیے گئے تمام ثبوتوں کی حیثیت بھی مشکوک سی ہو گئی۔ مذکورہ بالا مسائل حمودالرحمان کمیشن رپورٹ کے قابل بھروسہ ہونے میں سدراہ ثابت ہوتے ہیں۔

بنگلہ دیش کی حکومت نے History of the War of Independence کے عنوان سے پندرہ جلدوں پر مشتمل دستاویزات شائع کی ہیں۔ ان دستاویزات میں ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال تک کا پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ ان دستاویزات میں قوم پرست بنگالیوں کی تحریک اور ۱۹۷۱ء کے واقعات سے متعلق بہت سا مواد موجود ہے جو کسی محقق کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے۔ تاہم ان جلدوں کے ساتھ دو اہم مسائل درپیش ہیں۔ ایک مسئلہ تو عمومی ادارتی کمزوری کا ہے جبکہ دوسرا مسئلہ جانبدارانہ رویے کا ہے۔ ان مسائل کے پیش نظر ان دستاویزات کی اہمیت میں خاطر خواہ کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ ایک جلد تو پاکستانی حکومت کی جانب سے جاری کردہ دستاویزات پر مشتمل نظر آتی ہے۔ البتہ مجتمع کی گئی دستاویزات میں تمام نقطۂ ہائے نظر کو پیش کرنے کے لیے جامعیت نظر نہیں آئی۔

غیر شریک افراد کے تبصرے

چند تحریریں اور کتابیں ہمیں ایسے صحافیوں اور مصنفین کے قلم سے بھی ملتی ہیں جو کہ اس بحران کا براہِ راست حصہ نہ تھے۔ لیکن ان لوگوں نے واقعات سے متعلق نہ تو غیر جانبدارانہ اور غیر جذباتی

رپورٹیں پیش کی ہیں اور نہ ہی ان کے تجزیات کو غیر جانبدار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ایسے لکھنے والے مصنفین کسی ایک فریق کی جانب جھکاؤ رکھتے تھے یا اپنی تحریروں سے قائم کی جانے والی عوامی رائے سے چپکے ہوئے ہیں۔

اس قبیل کے لکھاریوں میں سب سے اہم نام انتھونی میسکر یناس کا ہے، یہ ایک پاکستانی صحافی تھا جو راہِ فرار اختیار کر کے برطانیہ میں مقیم ہونے کے بعد سنڈے ٹائمز میں پاکستانی حکومت اور ملٹری کی پالیسوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنانے کے لیے مشہور تھا۔ میسکر یناس ان پاکستانی صحافیوں میں شامل تھا جنھیں اپریل ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان لے جایا گیا اور جو ملٹری آپریشن کے بعد کے واقعات کو براہِ راست دیکھ چکے تھے۔ سنڈے ٹائمز میں شائع ہونے والی میسکر یناس کی رپورٹ کے مطابق بندوق کے نشے میں دھت ملٹری ہر طرح سے ایک سیاسی بغاوت کو کچلنے کے لیے تیار تھی۔ اس رپورٹ میں مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے دوران دونوں اطراف سے وحشیانہ کارروائیوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ میسکر یناس نے اپنی ابتدائی رپورٹ کو اسی سال اکتوبر میں شائع ہونے والی کتاب The Rape of Bangladesh میں جامع انداز میں پیش کیا۔ میسکر یناس کی جانب سے ملٹری ایکشن کے تشدد کو پڑھ کر کوئی بھی قاری فریق ثانی سے ہمدردی کرنے لگتا ہے۔ جبکہ دیگر دعوے جذباتیت پر مبنی بلا جواز اور کمزور دکھائی دیتے ہیں اور غیر جانبدار مصنفین نے انھیں کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر آ چکا ہے کہ میسکر یناس نے ایسے بہت سے واقعات کو اپنی رپورٹوں کا حصہ بنایا جو اس کے مشاہدے میں نہ آئے تھے، اور بعد ازاں ایسی بہت سی رپورٹیں سرے سے غلط ثابت ہو گئیں۔ اپنی کتاب میں بھی میسکر یناس اس بات کو تاکید کے ساتھ دہراتا ہے کہ شفاف انتخابات کروانے اور انتخابات کے بعد سیاسی مذاکرات کو آگے بڑھانے کے باوجود یحییٰ خان کی نیت نہ تھی کہ اقتدار کامیاب جماعت عوامی لیگ کے حوالے کیا جائے۔ یہ ایک ایسا نقطہ نظر تھا جسے ان دنوں عام مقبولیت حاصل تھی، لیکن میسکر یناس ان اسکالروں کے برعکس جو مختلف نتائج پر پہنچے ہیں اس دعوے کے حق میں کوئی دلیل پیش کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔ اس نے بھی چھ نکات اور مجیب الرحمٰن کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو جائز قرار دیا اور اپنے تجزیات میں وہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ذاتی تعلقات کے نمایاں رنگ کا اعتراف بھی کرتا ہے۔

بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک کے حق میں جھکاؤ اور آرمی کو کڑی تنقید کا نشانہ بنانے کی خواہش چند مقامات پر اس کی کتاب کو ایک جذباتی تقریر کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔ مارچ کے مہینے سے متعلق باب تو میسکر یناس کی اپنی پوزیشن کو بھی مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس باب میں وہ بنگالی

فوجی افسران کے سخت موقف کے مقابلے میں شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے مذاکرات کے لیے رضامندی کو سخت تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر بلا جواز ملٹری کے خلاف ''نسل کشی'' کا لفظ استعمال کیا ہے جبکہ بہت سے واقعات بعد ازاں یا تو مبالغہ آرائی پر مبنی نظر آئے یا پھر ان کو مکمل طور پر تحریف کر کے پیش کیا گیا تھا۔ اپنی بعد میں آنے والی کتاب Bangladesh: A Legacy of Blood(1986) میں میسکر یناس نے بنگلہ دیش کے قیام کے بعد فوج کی جانب سے اقتدار پر شب خون مارنے اور قتل و غارت گری کی دہائی کو موضوع بحث بنایا ہے۔ وہ نومولود ریاست کی امیدوں کا گلا گھونٹنے کا ذمہ دار مجیب، خوندکار مشتاق اور جنرل ضیاء الرحمان کو ٹھہراتا ہے۔ اس مرتبہ وہ مجیب کی نجی فوج کو خاکی وردی میں ملبوس نازیوں سے مشابہ قرار دیتا ہے۔

بحران کے دوران چھپنے والی دوسری کتاب Pakistan Crisis (1971) ایک صحافی ڈیوڈ لوشاک (David Loshak) نے لکھی۔ مصنف نے بذات خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ کتاب صحافتی نوعیت کی ہے نہ کہ کوئی تحقیقی کام، لیکن موصوف نے خود کو جنوبی ایشیاء میں بطور نامہ نگار براہ راست حاصل ہونے والی معلومات تک ہی محدود نہ رکھا۔ اپنی رائے قائم کرنے میں وہ کہیں بھی معذرت خواہ نظر نہیں آتے۔ لیکن ایک ایسی تحریر جس میں نہ تو گہرائی ہے اور نہ ہی شواہد کی توثیق کے لئے کسی قسم کی کوئی سعی کی ہے معاملات کو سمجھنے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر سکتی۔ بالخصوص جبکہ واقعات بھی ساتھ ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ ایک اور تحریر جس کا حوالہ ملتا ہے وہ لارنس لفشلز (Lawrence Lifshultz) کی کتاب Bangladesh: The Unfinished Revolution 1979 ہے۔ لیکن یہ کتاب فوجی انقلاب اور حد انقلاب سے بحث کرتی ہے جو کہ ۱۹۷۵ء میں رونماء ہوئے ان انقلابات کے پس منظر میں موجود سازشوں کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ (اس سلسلے میں ان اہم واقعات کا حوالہ بھی ملتا ہے جنہیں میسکر یناس اپنی تحریر میں متضاد بتایا ہے اور چند ایسے سازشی نظریات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن کا اظہار اپنی دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے بعد سیزن اور روز نے اپنی تحقیق میں کیا تھا)۔

بنگالی تحریروں میں چند تحریریں شواہد معلوم ہوتی ہیں لیکن ان میں جانبدارانہ سیاسی رنگ نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر معید الحسن کی جنگ سے متعلق تحریر (۱۹۹۲، ۱۹۸۵) بنگلہ دیش کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگ اور ''بھارت میں جلاوطن حکومت'' کے دنوں کی کہانی ہے۔ نیلما ابراہیم کی کہانیاں خواہ وہ اسکے ذاتی تجربات (۱۹۸۹) ہوں یا سات بنگالی عورتوں کی

داستان(۲۰۰۱،۱۹۹۸) بھی کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں معلوم ہوتی ہیں جس نے بنگلہ دیش کی آزادی میں حصہ لیا ہو۔ نیرادسی چودھری کی چبھتی ہوئی تحریریں تو اپنے تئیں ایسے تفاوات کا شکار ہیں کہ اس کے اپنے بنگالی بھائی سرحد کے اس پار یا اس پار ان سے اتفاق کرنے کے لیے تیار نہیں۔

خون اور آنسو (1974) Blood and tears قطب الدین عزیز کی جانب سے ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں مشرقی پاکستان کے زندہ بچ جانے والے غیر بنگالیوں کی زبانی بنگالیوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم کی داستانیں ملتی ہیں۔ اس میں ایک تجزیہ بھی ملتا ہے لیکن ایک ایسے شخص کی جانب سے جو مغربی پاکستانی حکومت کی جانب سے ایک فریق ہے۔ یہ تحریر ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ۱۹۷۱ کے دوران بنگالیوں کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم کو بیان کیا گیا ہے۔ محمد عبدالمومن چودھری (ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق اسٹاف ممبر) کی جانب سے تحریر کی گئی Behind the Myth of Three Million (1996) میں پیش کیے جانے والے حقائق کی جانچ مشکل ہے کیونکہ یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے، لیکن اس کتاب میں ایسی معلومات ہیں جن کی جانچ دستاویزات کی دستیابی پر کی جاسکتی ہے۔

جنگ میں شریک افراد کی تحریریں

بنگالی اور انگریزی زبانوں میں ۱۹۷۱ کے واقعات سے متعلق سب سے زیادہ شائع ہونے والا مواد وہ ذاتی یادداشتیں ہیں جو مختصر بیانات سے لے کر ضخیم کتابوں کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ان کی حیثیت بنیادی معلومات کی ہے لیکن ان کے مستند ہونے سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی آزاد ذرائع سے جانچ پڑتال کر لی جائے۔ بہت سے امریکی، پاکستانی، بھارتی اور بنگلہ دیشی افراد نے، جنگ سے متعلق اپنے تجربات کو انگریزی زبان میں قلم بند کیا ہے۔ جبکہ بنگالیوں کی جانب سے اس قسم کی تحریریں بنگالی زبان میں مل جاتی ہیں۔ ان کی حیثیت بنیادی شواہد کی ہونے کے باوجود ہم ان تحریروں کو من وعن قبول نہیں کر سکتے۔ تاہم، وہ سب اس بات پر مائل تھے کہ کسی ایک یا دوسری پوزیشن کا دفاع کریں، اور انھیں مہیا کی گئی معلومات کے حوالے سے متوازن نہیں مانا جاسکتا، اور دانستاً یا غیر دانستہ طور پر وہ لوگ مکمل طور پر درست نہیں سمجھے جاسکتے۔

امریکی— جون ۱۹۷۱ تک ڈھاکہ میں تعینات رہنے والے امریکی قونصل جنرل آرچر بلڈ نے ۲۰۰۲ میں خودسوانح حیات تحریر کی۔ آرچر بلڈ کو بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک سے ہمدردی تھی

اور یہ کتاب بھی اس ہمدردی پر ہی مبنی ہے جس میں بحران کو، ڈھاکہ میں فرائض منصبی پر مامور ایک امریکی قونصل جنرل کی نظر سے دکھایا گیا ہے۔ واقعات کی تفصیلات اندر کی خبروں اور کبھی کبھار فاصلے یا دیگر مجبوریوں کے بنا پر معلومات تک براہِ راست رسائی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت چنداں بڑھ جاتی ہے ۔ یہاں فاصلوں سے مراد جغرافیائی اور تجزیاتی فاصلے دونوں ہی مراد ہیں۔ یعنی اسلام آباد اور واشنگٹن سے فاصلے۔ درمیان کے لوگوں پر بھروسے کرنے کی وجہ سے چند ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوئیں جو اب نمایاں ہو کر سامنے آ چکی ہیں۔ ہمیں اس کتاب میں ایسے اعترافات بھی ملتے ہیں جہاں معاملہ فہمی میں غلطیاں کی گئیں۔ جبکہ غلط تجزیات کے ساتھ ساتھ بلڈ کی جانب سے کیے گئے صحیح اور مفید تجزیات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

۱۹۷۱ کے بحران کا ذکر ہمیں ہنری کسنجر کی White House Years اور صدر نکسن کی Memoirs میں بھی ملتا ہے۔ انہی تحریروں میں ہمیں دونوں اہم کرداروں کے نقطہ ہائے نظر اور اختلافات بھی ملتے ہیں جو امریکی پالیسی کو سمجھنے میں انتہائی اہم ہیں۔ ان دونوں صاحبان کی تحریروں کو چین کے ساتھ تیزی سے بڑھتے ہوئے تعلقات کے ساتھ ملا کر پڑھنا سودمند ثابت ہوگا۔ چک یگر (Chuck Yeager) کی خود نوشت سوانح حیات میں ۱۹۷۱ کی جنگ کا ذکر انتہائی اچھوتے انداز میں ملتا ہے۔ چک اس وقت پاکستان میں واقع امریکی سفارتخانے میں دفاعی نمائندے کے طور پر فرائض سرانجام دے رہے تھے اور جنگ کے وسط تک یہ ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

بھارتی — ۱۹۷۱ء کے بارے میں بھارت کی جانب سے آنے والی اکثر تحریروں کا مرکزی نقطہ سال کے آخر میں شروع ہونے والی باقاعدہ جنگ اور مشرقی پاکستان میں ان کی فتح ہے۔ تاہم بھارت کی جانب سے بہت سے اہم کرداروں نے اپنے براہِ راست تجربات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان میں مشرقی کمانڈر اور وہ ڈویژنل کمانڈر بھی شامل ہیں جن کی یونٹوں نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ صرف چند اشاعتیں ہی ایسی ملتی ہیں جن میں شریک جنگ افراد کی براہ راست شہادتیں قلم بند کی گئی ہیں، جیسا کہ لفٹیننٹ جنرل جے ایف آر جیکب کی Surrender at Dacca (2001) میجر جنرل سکھونت سنگھ کی ۱۹۷۱ کے واقعات پر کتاب دراصل تین جلدوں پر مشتمل کتاب کا ایک حصہ ہے جس میں آزادی سے لے کر اس وقت تک بھارتی افواج کی کارکردگی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ میجر جنرل لچھمن سنگھ نے عسکریت پسندوں کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو اپنی کتاب کا حصہ بنایا ہے گو کہ ان میں سے کسی کے تجربات پر بات نہیں کی گئی۔ بھارتی تحریروں میں گرم محاذ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ اس لیے یہ تحریریں مسئلے کو سمجھنے میں خاطر خواہ کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کتابوں میں

ایک دلچسپ پہلو یہ پایا جاتا ہے کہ جنگ جیتنے کے باوجود بھارتی فوجی افسران ایک دوسرے سے نہ صرف اختلاف رکھتے تھے بلکہ انھوں نے ایک دوسرے کو کڑی تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔

پاکستانی جنرل اے اے کے نیازی نے The Betrayal of East Pakistan ۱۹۹۸ء لکھی۔ نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کے مشرقی کمانڈر نے اس کتاب سے اپنے تجربات اور نقطہ نظر کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ جنرل نیازی اپریل ۱۹۷۱ سے مشرقی پاکستان میں تعینات تھے لیکن اس کتاب میں لڑائی کے آخری ہفتوں سے متعلق تفصیلات بشمول جنگی منصوبہ بندی کا ذکر آنا ناگزیر ہے۔ اس کتاب کے پورے متن میں ہمیں ایک دفاعی طرز تحریر نظر آتا ہے جس کی وجہ غالبًا اپنے ہی وطن میں جنگ کے بعد جنرل صاحب سے روا رکھے جانے والے رویہ تھا۔ اور یہ خواہش بھی کہ ریکارڈ اپنے صحیح رخ پر سب کے سامنے آجائے۔ ان تمام باتوں کے باوجود معاملے کے ایک بہت بڑے فریق اور کردار ہونے کے ناطے جنرل صاحب کی کتاب انتہائی اہم ہے اور اس میں ایسا بہت سا مواد موجود ہے جس کی توثیق دیگر آزادنہ ذرائع سے کی جاسکتی ہے۔

کئی دیگر پاکستانی افسران نے بھی ۱۹۷۱ء کے بارے میں ذاتی تجربات سپرد قلم کیے ہیں۔ ان میں چند کتابی صورت اور چند بصورت آرٹیکل شائع ہو چکے ہیں۔ تاہم کچھ مواد ایسا بھی ہے جو اب تک شائع ہی نہیں ہوا۔ بھارتی افسران کی طرح، پاکستانی افسران بھی چند مخصوص محاذوں اور بھارت کے ساتھ جنگی منصوبہ بندی میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ایسے اہلکاروں کی تحریریں جو ان دنوں مشرقی پاکستان میں تعینات رہے اس لحاظ سے کافی اہم ہیں کہ ان کی مدد سے کڑی سے کڑی جوڑ کر زمینی حقائق کو جانچا جاسکتا ہے۔ میجر جنرل اے او مٹھا کی خود نوشت سوانح حیات (۲۰۰۳ء) میں ۱۹۷۱ء کے دنوں کو بھی بھرپور انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ میجر جنرل ایچ اے قریشی کی کتاب محض ۱۹۷۱ء کے واقعات کو ہی بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب محاذ جنگ پر موجود ایک فوجی کمانڈر کی تحریر ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محاذ جنگ پر موجود پاکستانی فوجی افسران کی جانب سے لکھی گئی اور بھی تحریریں ہونی چاہیے تھیں۔

مارچ ۱۹۷۱ء سے اپنی مزید خدمات نہ پیش کرنے والے صاحبزادہ یعقوب خان نے اپنے ٹیلی گراموں (۲۰۰۵ء) کے ذریعے وقتاً فوقتاً صورت حال پر بحث کی ہے۔ ایوب خان کی ڈائریاں (۲۰۰۷ء) ہمیں ایوب خان کے ذاتی نقطۂ نظر سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں، البتہ مکمل اور صحیح معلومات ان تک نہ پہنچ سکیں۔ سول سرونٹ روئیداد خان جیسے لوگوں کی یادداشتیں (۲۰۰۴ء) آنکھوں دیکھے واقعات کی قلمی تصویر کشی میں مدد فراہم کرتی ہیں۔

اشاعت شدہ مواد میں بریگیڈیئر محمد حیات کے آرٹیکل (۱۹۹۸ء) ان براہِ راست تجربات سے معلومات فراہم کرتے ہیں جو بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالتے وقت ایک یونٹ کو پیش آئے جبکہ وہ ابھی تک محاذ جنگ پر ہی ڈٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح مختلف مقامات پر آرمی کے یونٹوں کو جب ہتھیار ڈالنے کی خبر پہنچتی ہے تو وہ کس عجیب کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں، ان کی عکاسی میجر قریشی نے اپنی تحریروں میں کی ہے۔ بریگیڈیئر تاج سے کیا گیا انٹرویو (۲۰۰۲ء) بھی محاذ جنگ پر موجود ایک کمانڈر کے تجربات کو جاننے کے لیے بہت اہم ہے۔ اسکے علاوہ بریگیڈیئر کریم اللہ اور بریگیڈیئر شوکت قادر نے مجھے مشرقی پاکستان کے متعلق کچھ ایسا مواد بھی فراہم کیا جو کبھی بھی شائع نہ ہوسکا۔

چند فوجی افسران نے حالات پر تبصرے بھی لکھے ہیں جو براہِ راست تجربات و معلومات پر مبنی نہیں ہیں۔ ان تبصروں کی اپنی حدود ہیں۔ البتہ ان کے ذریعے سے مختلف افسران کی تحریروں میں پائے جانے والے تضادات ہمارے سامنے ضرور آجاتے ہیں۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی کی جانب سے لکھی گئی کتاب East Pakistan the Endgame کی حدود بذات خود اس کے ذیلی عنوان "An Onlooker's Journal ۱۹۶۹ء۔۷۱" سے ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ ان کی تعیناتی مغربی پاکستان میں تھی لیکن چیف پبلک ریلیشنز آفیسر ہونے کے ناطے انھیں مشرقی پاکستان بھی آنا جانا ہوتا تھا۔ Witness to Surrender (۱۹۷۲ء) کے مصنف صدیق سالک بھی پبلک ریلیشنز آفیسر تھے، لیکن وہ ان دنوں مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ اس لیے ان کی تحریر میں بہت سے آنکھوں دیکھے حالات قلم بند ہیں۔ بالخصوص دو سالوں کے درمیان بدلتے سیاسی حالات کے وہ عینی شاہد ہیں۔ البتہ جنرل مٹھا نے اس تحریر میں ملٹری کے نقطۂ نظر سے چند غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جیسا کہ بعض اوقات ملٹری کو محاذ پر بھیجے جانے سے متعلق اقتباسات کے سلسلے میں مصنف عینی شاہد نہ تھے۔ حسن ظہیر نے بطور سول سرونٹ برسوں مشرقی پاکستان میں خدمات سرانجام دی تھیں اور مئی ۱۹۷۱ء میں وہ واپس آگئے۔ البتہ ان کی کتاب (۲۰۰۱ء) براہ راست تجربات سے کافی دور نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ بنگالیوں میں علیحدگی کا رجحان بہت عرصہ قبل ہی پیدا ہوگیا تھا۔ اس لیے یحییٰ خان کی جانب سے سیاسی اصلاحات اور مذاکرات جیسے اقدامات پر کڑی تنقید کی گئی۔

بنگلہ دیشی — بنگالیوں کی جانب سے ہمیں چند ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متحدہ پاکستان کے حق میں تھے۔ وہ مشرقی پاکستان کے مسائل کے حل کے خواہاں بھی تھے، لیکن وہ عوامی لیگ کی علیحدگی کی تحریک کو اپنے مسائل کا حل نہیں سمجھتے تھے۔ جی ڈبلیو چودھری کی کتاب The Last Days of United Pakistan(1974) بنگالیوں کے مسائل کی کھل کر نشاندہی

کرتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یحییٰ خان کی جانب سے متعارف کروائے جانے والے سیاسی اصلاحات کی تعریف بھی کرتے ہیں۔سید سجاد حسین کی کتاب The Wastes of Time (۱۹۹۵ء)اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ راج شاہی اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر کیوں متحدہ پاکستان کے حق میں تھے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ آزاد بنگلہ دیش میں خود کو (مغربی پاکستان کے)''حواری'' کہلائے جانے جیسے تجربات بھی قلم بند کرتے ہیں۔بیگم اختر امام (۲۰۰۲۔۱۹۹۸ء) جو کہ رقیہ ہال وومن ہاسٹل ڈھاکہ یونیورسٹی میں ۱۹۷۱ء کے دوران پرووسٹ (انچارج) تھیں۔اپنی تحریر میں ۱۹۷۱ء کے دوران ہال میں رونما ہونے والے واقعات کو بیان کرتی ہیں۔ وہ بھی ''حواری'' کہلائے جانے کے طعنوں کا ذکر اپنی تحریروں میں کرتی ہے۔ایک اور ''وفادار'' چکماؤں کے سردار راجہ تری دیورائے اپنی خودنوشت سوانح حیات The Departed Melody(2003) میں چکما کے اہم نقطہ ہائے نظر کو بیان کرتے ہیں۔اس کے ساتھ وہ ان مشکلات کا ذکر بھی کرتے ہیں جو انھیں مشرقی پاکستان میں مسلح بنگال قوم پرستی کو حاصل ہونے والے عروج کی بناء پر پیش آئیں۔

آزادی کے حق میں بنگالی تحریریں — بنگلہ دیش میں آزادی کے حق میں بہت کچھ لکھا گیا جو بنیادی طور پر بنگالی زبان میں تھا۔ان میں چند تحریریں ان افراد کے ذاتی تجربات پر مشتمل ہیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں براہ راست کردار ادا کیا۔ان میں وہ باغی مسلح فوجی اور پولیس اہلکار بھی شامل ہیں جنھوں نے آزادی کی تحریک میں مدد فراہم کی۔جب کہ دیگر تحریریں صدمے سے دوچار ان گھرانوں اور عینی شاہدین کی رُوداد ہیں جو دل دہلا دینے والے واقعات سے براہ راست متاثر ہوئے۔ان تحریروں کے مستند ہونے میں کم وبیش کلام ہوسکتا ہے۔

عینی شاہدین کے ذاتی تجربات کی حیثیت بنیادی ماخذ کی سی ہے۔تاہم مفید ترین مواد بھی مسائل سے پاک نہیں ملتا۔ایک مسئلہ تو سیاسی جانبداری ہے جس سے پوری تحریر متاثر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔بعض لوگ اپنی کہانیوں میں تحریف کے ذریعے آزادی کی اس تحریک میں اپنے اور اپنے مخالفین کے لیے خاص کردار متعین کرنا چاہتے ہیں۔لہٰذا اِس تمام مواد کو اگر تقابلی انداز میں پڑھا جائے تو تضادات یا اتفاقات ہمارے سامنے ضرور آتے ہیں۔

ذاتی طور پر لکھی گئی یادداشتوں میں سب سے زیادہ مؤثر تحریر جہاں آراء امام کا جنرل Ekattorer Dinguli (1986) ہے جس نے اس کے بیٹے رومی کو ایک دائمی کردار بنا ڈالا وہ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں شریک تھا جس کو بعد میں سیکیورٹی فورسز نے دیگر لوگوں کے ساتھ گرفتار کرلیا اور وہ ''لاپتہ'' ہوگیا۔بسنتی گوھا ٹھاکرتا کی کتاب Ekattrorer Smriti(2000) اس لحاظ سے

اہم ہے کہ اس میں ۲۵۔۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں کیے جانے والے ملٹری آپریشن کی آنکھوں دیکھی روداد کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ان کے شوہر پروفیسر جوئے تیر موئے گوھا ٹھاکرتا کا قتل بھی اسی روداد کا حصہ ہے۔ ان کے پڑوسی پروفیسر انیس الرحمٰن کی یادداشتیں ۲۰۰۱ء بھی انہیں آنکھوں دیکھے واقعات کا قصہ سناتی ہیں۔ انھوں نے اپنی یادداشت میں بعد میں پیش آنے والی جلا وطنی کے واقعات کو بھی قلم بند کیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی وہ دستاویزات ہیں جنھیں ۱۹۷۱ء میں پیش آنے والے واقعات کے دوران ذاتی تجربات کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ رشید حیدر کی جانب سے ایڈیٹنگ کے بعد چھپنے والی یہ دستاویزات سمرتی دراصل بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک کا نقطۂ نظر بیان کرتی ہیں۔ یہ دستاویزات تیرہ جلدوں پر مشتمل ہیں اس میں بہت سے عینی شاہدین کے بیانات شامل ہیں۔ بنگالی زبان میں اسی نوعیت کی ایک اور تحریر (1989) .1971: Bhayabaha Abhignata ہے۔ اس کتاب کو بھی رشید حیدر کی جانب سے ایڈیٹنگ کے بعد شائع کیا۔ یہ کتاب دراصل ان عینی شاہدین کے بیانات پر مبنی ہے جنھیں بالخصوص اس مقصد کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ان دونوں تحریروں سے ہمیں بڑی مقدار میں بنیادی ماخذات تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ تمام مواد بنگالی میں ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں نے ایڈیٹر کو اس بات کا مشورہ بھی دیا تھا کہ چند منتخب شدہ اقتباسات کا اگر انگریزی زبان میں ترجمہ کر دیا جائے تو غیر بنگالی افراد بھی عالمی سطح پر ان ماخذات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ حیدر صاحب نے (1994) Shahid Buddhijeebi Koshgrantha کی ایڈیٹنگ بھی کی ہے جو ۱۹۷۱ء کے دوران قتل کیے جانے والے اور لاپتہ ہونے والے ان افراد سے متعلق ہے جو کہ دانشور اور پیشہ ور طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

گو کسی تحقیق کا آغاز کرنے کے لیے یہ مواد انتہائی اہم ہے لیکن اس مواد کو محفوظ کرنے میں تنظیمی بے قاعدگیاں نظر آتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایڈیٹر نے بہت سے مواد کی توثیق کے بعد ہی انھیں ان دستاویزات حصہ بنا دیا ہے۔ مثال کے طور پر Bhayabaha Abhignata 1971 میں واقعات میں براہ راست ملوث افراد اور عینی شاہدین جیسا کہ نور اللہ، کالی رنجن شیل امام الزماں، شمشیر مبین چودھری، جہاں آراء امام، ابوالبرق علوی، کے ایم صفی اللہ، شیامولی چودھری اور نیلیما ابراہیم کے بیانات کو ان دیگر آرٹیکل کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جن میں ہمیں نہ تو عینی شاہدین کے شواہد ملتے ہیں اور نہ ہی ان کی اہمیت اول الذکر شواہد جیسی ہے۔ نیز مدعیوں کے دعوؤں کی توثیق کے لیے کسی معتبر طریقے کو بھی نہیں اپنایا گیا۔ اس وجہ سے مواد میں موجود مختلف تحریریں معیار اور مستند ہونے کے

حوالے سے ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔

کچھ مواد کتابوں یا واحد کالموں کی صورت میں ایک سے زائد بار بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان میں پاکستانی فوج میں خدمات انجام دینے والے ان بنگالی اہلکاروں کی تحریریں شامل ہیں جنھوں نے بغاوت کے رستے کو اپنایا اور بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ ان افراد میں بریگیڈیئر ایم آر مجوم دار، لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسین خان، میجر جنرل کے ایم صفی اللہ اور میجر جنرل امام الزماں شامل ہیں۔ مکتی جودھاؤں میں سے قادر ''ٹائیگر'' صدیقی کی دو جلدوں پر مبنی Swadhinata, 71 جنگ آزادی کے حوالے سے اس کا نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ محبوب عالم کی کتاب (۱۹۹۳ء) گوریلا جنگ پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ بالا دستاویزات میں بے شمار مکتی جودھاؤں کی ذاتی کہانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ڈھاکہ میں واقع لبریشن وار میوزیم حال ہی میں نجی کاوشوں کے نتیجے میں قائم کیا گیا۔ یہ میوزیم آزادی کے حامی افراد کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میوزیم میں بے شمار تصاویر، دستاویزات عسکریت پسندوں کی اشیاء اور جنگ سے متعلق دیگر اشیاء کو محفوظ کیا گیا ہے اس کے علاوہ میوزیم سے کتابیں وغیرہ بھی شائع ہوئیں ہیں۔ اس تمام مواد کو یکجا کرنے کی غرض سے یہ کوششیں بے شک قابل ستائش ہیں لیکن ان تمام اشیاء اور دستاویزات کو مزید مستند بنانے کی غرض سے دو بنیادی کمزوریوں کا ازالہ کیا جانا از حد ضروری ہے تاکہ میوزیم میں موجود تمام مواد بین الاقوامی معیار کی تحقیق کے لیے مؤثر ثابت ہو۔ ایک کمزوری تو یہ ہے کہ میوزیم کی انتظامیہ کلی طور پر علیحدگی پسندوں کی حامی نظر آتی ہے، اور آج بھی جنگ کے دوران کی جانے والی پرزور تقاریر سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ مذکورہ بالا مواد کی نمائش اور اشاعت کے لیے اس کے مستند ہونے کی توثیق کرانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کمزوری سے بذات خود میوزیم کے اپنے مقاصد کو دھچکا لگتا ہے۔

۱۹۷۱ء کے تصادم کے دوران صنف اور تشدد سے متعلق بہت سا مواد موجود ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مواد کسی تحقیقی مقصد کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کو خواتین اور جنگی نقطہ نظر سے پیش کرنے کے سلسلے میں تحقیقی کام ابھی تک ابتدائی مراحل ہی میں ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تقسیم سے متعلق مواد کا مرکز بھی پنجاب ہی رہا نہ کہ بنگال اور اب ۱۹۷۱ء میں دوبارہ تقسیم کے بعد اس سمت میں کام آگے بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس نوعیت کا بہترین کام یاسمین صائیکیہ (۲۰۰۸،۲۰۰۴) کے قلم سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ مصنفہ نے تحقیقی انداز اپناتے

ہوئے سرکاری طور پر متاثرین سے لیے گئے بیانات کو بھی چیلنج کیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں زبردست سیاسی اور لسانی غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتی ہیں۔

بنگلہ دیش کی آزادی کے حامیوں کے قلم سے جنم لینے والی تحریروں کا خاطر خواہ حصہ مستند، قابل بھروسہ اور متوازن ہونے سے عاری ہے۔ ان خصوصیات کی بنا پر مواد محققین کے لیے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتا۔ آزادی کے حق میں لکھی گئی بہت سی تحریریں واضح جانبداری، بلا جواز دعوؤں اور غیر مستند ہونے کی وجہ سے ایک باقاعدہ تحقیق کو آگے بڑھانے کے بجائے اس سلسلے میں سدراہ ثابت ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر منتصر مامون کی ادارت کردہ کتاب 1971 Chuknagarey Gonohotya (2002) ایسے ہی مسائل کا پلندہ ہے۔ بالخصوص سویلین پناہ گزینوں کے قتل سے متعلق اصل واقعات کو محفوظ کرنے کا سنہری موقع گنوا دینے کے بعد تو یہ تحریر بڑی مایوس کن محسوس ہونے لگتی ہے۔ بنگالی زبان میں موجود شواہد کا پورا مجموعہ کم و بیش انہی مسائل کا شکار ہے۔ سب سے زیادہ غیر معتبر تحریریں وہ ہیں جن میں بنگلہ دیش کی آزادی کی تحریک کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ شہر یار کبیر (۱۹۹۹ء)۔ اس قسم کے مواد کو شد و مد کے ساتھ انٹرنیٹ پر بھی پیش کیا گیا۔ تاہم اس مواد میں موجود دعوے بھی نہ صرف غیر مستند ہیں بلکہ ان کی سند کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کو برداشت بھی نہیں کیا جاتا۔

ضمیمہ ب :

شرکاء اور عینی شاہدین جن کے انٹرویوز لیے گئے

بنگلہ دیش

- قوسین میں درج دوسرا مقام انٹرویو کے مرکزی علاقے کی طرف اشارہ کناں ہے
- جیسا کہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ کچھ انٹرویوز، انٹرویو دینے والے کے علاوہ گروپ میں موجود دیگر افراد سے بھی لیے گئے ہیں۔

لیفٹیننٹ (میجر جنرل) امام الزماں، ڈھاکہ (۵۳ فیلڈ رجمنٹ؛ مکتی جودھا)

شمشیر مبین چودھری، واشنگٹن (۸ ای بی آر؛ مکتی جودھا)

کبیر میاں، نرسنگدی (مکتی جودھا)

ابوالبرق علوی، ڈھاکہ (مکتی جودھا)

اقبال، ڈھاکہ (مکتی جودھا)

ڈاکٹر میگھنا گوہا ٹھاکرتا، ڈھاکہ یونیورسٹی

رابندر موہن داس، ڈھاکہ یونیورسٹی

شیاملی نسرین چودھری، ڈھاکہ

ڈاکٹر ابوالکلام، ڈھاکہ

ظفر احمد، واشنگٹن

زین الکریم، ڈھاکہ (مکتی جودھا)

جوئے نال عابدین دیوان (اور اہلیہ شیولی عابدین)، ستیار چورا، ٹنگیل

ریحان علی (اور اہلیہ محمودہ بیگم گنی)، تھانہ پاڑہ، راجشاہی

اودیا جان، تھانہ پاڑہ، راجشاہی

محمد عبدالستار، تھانہ پاڑہ، راجشاہی

محمد زینت العالم، تھانہ پاڑہ، راجشاہی
محمد عبدالحق، میمن سنگھ
شیخ سلطان احمد، میمن سنگھ
عبدالعزیز، کشور گنج، میمن سنگھ
محمد علی اکبر دام پاڑہ، میمن سنگھ (بوروئی ٹولہ؛ بشمول دیگر دیہاتی)
جوئے نال عابدین، بوروئی ٹولہ، میمن سنگھ (مکتی جودھا؛ بشمول دیگر دیہاتی)
امر سُور، شنکھاری پاڑہ (دیگر افراد بشمول امر کے چھوٹے بھائی کی موجودگی میں، جو خود بھی زندہ بچ جانے والا عینی شاہد تھا)
آمیہ کمار سُور، شنکھاری پاڑہ (نرائن نندی اور دیگر بھی)
اچنتیا ساہا، بوٹیہ گھاٹ، کھلنہ
شیلندر ناتھ جوردار، کٹھاماری گاؤں، کھلنہ (چلنگر)
محمد واجد علی، چلنگر (دیگر افراد کی موجودگی میں)
دلیل الدین دولو، چلنگر
نیتائی گائن، ضلع کھلنہ (چلنگر)
لتیکا گائن، ضلع کھلنہ (چلنگر)
تارا داسی بیراگی، کھلنہ (جھوڑانگا)
موئنہ مستری، کھلنہ (جھوڑانگا)
بمل منڈل، کھلنہ
تنویر مکمل، ڈھاکہ (کھلنہ)
تنویر مکمل کے بھائی کا سسر، کھلنہ
ایس ایم راقب علی، کھلنہ (مکتی جودھا، جیسور)
رستم علی سکندر، کھلنہ (مکتی جودھا)
عبدالرب سردار، کھلنہ (مکتی جودھا)
محمد شفیع، سابک، پرویز عالم خان اور دیگر، نیو کالونی، خالس پور
بیگم اختر امام، ڈھاکہ (ٹیلیفون پر)

پاکستان

(قوسین میں بعد کا عہدہ درج کیا گیا ہے)

لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، کمانڈر، ایسٹرن کمانڈ

میجر جنرل غلام عمر، سیکرٹری، قومی سلامتی کونسل

صاحبزادہ یعقوب خان، کمانڈر، ایسٹرن کمانڈ مارچ ۱۹۷۱ء تک

لیفٹیننٹ کرنل (میجر جنرل) حکیم ارشد قریشی، ۲۶ ایف ایف

لیفٹیننٹ کرنل (بریگیڈیئر) محمد تاج، ۳۲ پنجاب

بریگیڈیئر محمد حیات، ۱۰۷ بریگیڈ

بریگیڈیئر سلیم ضیا، ۸ پنجاب

کیپٹن (بریگیڈیئر) شوکت قادر، ۱۳ ایف ایف

کرنل (بریگیڈیئر) منصور شاہ، اسٹیشن کمانڈر، ڈھاکہ کینٹ

بریگیڈیئر کریم اللہ، پی او ایف، غازی پور

کیپٹن شجاعت لطیف، ۱۵ ایف ایف

کیپٹن (لیفٹیننٹ جنرل) علی قلی خان، ۴ آرمی ایوی ایشن

کیپٹن (میجر) اکرام سہگل، ۲ ای بی آر

لیفٹیننٹ (لیفٹیننٹ جنرل) غلام مصطفیٰ، ۵۵ فیلڈ

میجر (کرنل) انیس احمد، ۲۰۵ بریگیڈ

میجر (بریگیڈیئر) جعفر خان، ۵۷ بریگیڈ

میجر (کرنل) ثمین جان بابر، ۲۲ ایف ایف

(لیفٹیننٹ کرنل) محمد کامران خان دوتانی، ۲۲ ایف ایف

میجر عبدالماجد، ۵۳ فیلڈ

لیفٹیننٹ نعیم اللہ، ۲۳ پنجاب

بریگیڈیئر اقبال شفیع، ۵۳ فیلڈ

لیفٹیننٹ کرنل (کرنل) محمد شفیع، ۲۳ فیلڈ

لیفٹیننٹ کرنل (بریگیڈیئر) امیر محمد خان، ۳۴ پنجاب

لیفٹیننٹ کرنل مطلوب حسین، ۱۸ پنجاب

لیفٹیننٹ سید عطا اللہ شاہ، ۲۷ بلوچ

کیپٹن (بریگیڈیئر) اے ایل اے زمان، ۵۳ فیلڈ

(کرنل) ایم کمال الدین، ۵۵ فیلڈ

کیپٹن (کرنل) محمد علی شاہ، ۱۸ پنجاب

کیپٹن سرور اظہر، ۱۸ پنجاب

جناب قطب الدین عزیز

جناب علی یحییٰ

جناب اردشیر کاؤس جی

کرنل عنایت اللہ حسن

بنگلہ دیش اور پاکستان کے چند افراد کے نام ظاہر نہیں کیے گئے، اسکے علاوہ ایک حاضر سروس افسر نے نام کو پوشیدہ رکھنے کی شرط پر انٹرویو دیا۔

مندرجہ ذیل افسران انٹرویو دینے پر راضی نہیں ہوئے:

بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ جنرل) جہانزیب ارباب، ۵۷ بریگیڈ

لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان، ۱۸ پنجاب

کیپٹن (میجر) صالح حسن مرزا، ۱۸ پنجاب

لیفٹیننٹ کرنل ایس ایف ایچ رضوی، ۳۲ پنجاب

نوٹس

تعارف: تصادم کی تلخ یادیں

۱۔ بائیں بازو کی مسلح انقلابی جدوجہد کہ جس نے ساٹھ کے اختتام اور ستر کی دہائی کے اوائل میں انڈین مغربی بنگال کو ہلا کر رکھ دیا تھا، شمالی بنگال کے کسانوں میں بیداری کی تحریک کا سبب بنی اور نکسل باڑی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس نے نظریاتی بناء پر کلکتہ کے ہونہار طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس تحریک کو حکومت نے سختی کے ساتھ کچل دیا۔ یہاں سے ہندوستان کی سیاسی لغت میں ماورائے عدالت قتل کی اصطلاح کا اضافہ ہوا۔ مشتبہ عسکریت پسندوں کو قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ ہونے والے جعلی مقابلوں یا دوران حراست فرار کی کوشش کا الزام لگا کر مار دیا جاتا تھا۔

۲۔ شیخ مجیب الرحمن نے ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ کے رمنا ریس کورس میں منعقدہ تاریخی ریلی سے خطاب کے دوران خلاف توقع یکطرفہ اعلانِ آزادی سے اجتناب برتا اور ۲۵ مارچ تک مزید سیاسی مذاکرات کرنے کا عندیہ دیا۔

۳۔ پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء۔

۴۔ قانون برائے انسداد دہشت گردی و لاقانونیت۔

۵۔ بہت سی نامور سکھ شخصیات نے ۱۹۸۴ء کے دہلی فسادات اور پنجاب میں جاری انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ پنجاب ۸۰ء اور ۹۰ء کے عشرے میں بغاوت کا گڑھ بنا رہا۔ بنگلہ دیش میں مکتی باہنی کے گوریلوں کی تربیت میں پیش پیش انڈین میجر جنرل شاہ بیگ سنگھ باغیوں کے ساتھ جاملا۔ جون ۱۹۸۴ء میں کیے گئے آرمی آپریشن "بلیو سٹار" کے دوران وہ باغی لیڈر جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے ہمراہ گولڈن ٹیمپل، امرتسر میں موجود تھا۔ اس نے انڈین آرمی سے لڑتے ہوئے جان دی۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کو اس کے سکھ باڈی گارڈز نے قتل کر دیا جس کے نتیجے میں دہلی میں ہزاروں سکھوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ حکام کو مؤرد الزام ٹھہرایا جاتا ہے کہ انہوں نے ان جرائم سے چشم پوشی اختیار کی اور یوں قتل عام میں ملوث کسی بھی فرد کو انصاف کے کٹہرے میں نہیں لایا جا سکا۔

۶۔ سکھونت سنگھ (۱۹۸۰ء)، ص: ۷۸۔

۷۔ پچھمن سنگھ (۱۹۸۰ء)، ص: ۶۰۔

۸۔ جیکب (۲۰۰۱ء)۔

۹۔ تقریباً نوے برس کے جنرل اروڑا کے خدوخال ابھی تک دلکش اور انداز شاندار تھا۔ تقریبِ شکست کی ایک بڑی تصویر اس کے گھر کی دیوار پر آویزاں تھی۔ اور فیملی تصویر میں وہ یونیفارم میں شاداں نظر آرہا تھا— بے تحاشہ ناچتے ہوئے۔

۱۰۔ مارچ، ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی صورت حال پر صاحبزادہ یعقوب خان کا حقیقت پسندانہ تجزیہ ملاحظہ کیجیے صاحبزادہ یعقوب خان کے مشرقی پاکستان کی مارچ ۱۹۷۱ء کی صورتِ حال کے پیش بینی تجزیے اور بطور کمانڈر ایسٹرن کمانڈ کے استعفیٰ دینے کے فیصلے کی وضاحت کے لیے دیکھیں۔ خان (۲۰۰۵ء) ص: ۲۸۰ تا ۲۸۴ اور بوس (زیرِ اشاعت)؛ اس کے علاوہ مصنف کا انٹرویو (۲۰۰۷ء)۔

۱۱۔ لاہور ۲۰۰۳ء، میں جنرل نیازی کا انٹرویو لینے کے بعد میں نے ان پر ایک فیچر تحریر کیا جو بھارت کے روزنامہ ٹیلی گراف میں ۱۷ اگست ۲۰۰۳ء کو شائع ہوا۔

۱۲۔ مشرقی پاکستان سے ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے بعد آنے والے تمام غیر بنگالی مہاجرین عام طور سے ''بہاری'' کہلاتے تھے۔

۱۳۔ انتھونی ماسکریناس ایک پاکستانی اخبار نویس تھا۔ اِسے حکومت نے اپریل ۱۹۷۱ء میں سرکاری خرچے پر مشرقی پاکستان بھیجا۔ وہاں سے وہ اپنے خاندان کے ہمراہ برطانیہ فرار ہوگیا۔ سنڈے ٹائمز میں اس نے مشرقی پاکستان میں ہونے والے ملٹری آپریشن کے خلاف مذمتی مضمون شائع کیا۔

۱۴۔ دیکھیے سرمیلا بوس، "The truth about the Jessore massacre"، ٹیلیگراف، ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء۔

۱۵۔ سرمیلا بوس، "Anatomy of Violence: Analysis of Civil War in East Pakistan in 1971" *Economic and Political Weekly*، جلد ۴۰، نمبر ۴۱، ص: ۸ تا ۱۴، اکتوبر ۲۰۰۵ء۔

ا۔ کھلی کتاب: بنگالی قوم پرستوں کی بغاوت

۱۔ میجر جنرل حکیم ارشد قریشی، *The 1971 Indo-Pak War: a soldier's Narrative*، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۰۴۔

۲۔ آرچر بلڈ، *The Cruel Birth of Bangladesh: Memoirs of an American Diplomat*، دی یونیورسٹی پریس لمیٹڈ، ڈھاکہ، ۲۰۰۲ء ص: ۱۵۵۔

۳۔ سیزن اینڈ روز، (۱۹۹۰ء)، ص: ۶۳۔

۴۔ صدارتی مشیر برائے قومی سلامتی کسنجر کی جانب سے صدر نکسن کو پیش کردہ یادداشت، FRUS، جلد ۱۱، ص: ۱۷ تا ۲۰۔

۵۔ پاکستان کے دولخت ہونے اور اس دوران پاکستانی سیاست کے تجزیہ کے لیے ملاحظہ کیجیے، سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء) مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے، جی ڈبلیو چودھری (۱۹۷۴ء)۔

۶۔ ولکاکس (۱۹۷۳ء)، ص: ۱۵۔

۷۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۸۔ مزید دیکھیے، جی ڈبلیو چودھری (۱۹۷۴ء) باب ۵۔

۸۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۷۔

۹۔ سن سینتالیس کے بعد دو عشروں تک بنگالیوں کی پاکستان میں اجنبیت کے موضوع پر پاکستان اور بنگلہ دیش میں کافی مواد قلم بند کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۵۰ء کے آغاز میں ہونے والی لسانی بغاوت، معاشی تفاوت، انتظامیہ، فوج، صنعت و حرفت وغیرہ میں بنگالیوں کی نامناسب نمائندگی اور جداگانہ ثقافت وہ چند عوامل تھے جنھوں نے اختلافات کو جنم دیا۔ عام تاثر یہ بھی تھا کہ مغربی پاکستان کے اونچے لمبے گورے چٹے پنجابی اور پٹھان مشرقی پاکستان کے کالے بھدے ناٹے ٹھگنے بنگالیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے قطع نظر دوسرے صوبوں کے مابین بھی اختلافات موجود تھے۔ خوشحال پنجاب کے مقابلے میں سندھ اور بلوچستان کے دیہی علاقوں کی حالت دگرگوں تھی۔

۱۰۔ ''چھ نکات'' کے لیے دیکھیے سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء) ص: ۲۰۔ کچھ نکات قومی حکومت سے علیحدگی کا اعلان تصور کیے گئے، اس وقت بیشتر پاکستانیوں کی یہی رائے تھی۔

۱۱۔ دیکھیے لیفٹیننٹ جنرل کمال متین الدین (۱۹۹۳ء)، مغربی پاکستان کی جانب سے دی جانے والی تاویل کے مطابق دونوں بازوؤں کے درمیان موروثی تفاوت دور کرنے کے لیے کئی اصلاحی اقدامات اٹھائے گئے۔ ایوب دور حکومت میں موجود مشرقی اور مغربی حصوں کے مابین اختلاف پر مشرقی پاکستان کے نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے رونق جہاں (۱۹۷۲ء)۔ ایک پاکستانی بنگالی بیوروکریٹ، جی ڈبلیو چودھری کے خیال میں معاشی اونچ نیچ اہم مسئلہ تھا۔ جنرل یحییٰ کی جانب سے بنگالیوں کی شکایات کے ازالہ کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات درست مگر تاخیر کا شکار تھے (جی ڈبلیو چودھری (۱۹۷۴ء))۔ ولکاکس مسائل کا خلاصہ کچھ یوں بیان کرتا ہے کہ دونوں بازوؤں میں جھگڑا معاشی تفاوت کے باعث نہ تھا بلکہ اصل جھگڑا یہ تھا کہ معاشی تفاوت پیدا ہی کیسے ہوئی (ولکاکس (۱۹۷۳ء)، ص: ۱۷)۔ جہاں آراء امام لکھتی ہیں کہ انھیں اپنے امریکی مہمان کو اس بات پر قائل کرنے کے لیے کہ بنگالیوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اعداد و شمار ڈھونڈنے پڑے۔ ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ بنگالیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی اتنی واضح تھی کہ امریکی مہمان کا دلیل کے طور پر ثبوت مانگنا غیر منطقی حرکت تھی۔ ان کے خیال میں شیخ مجیب کا الیکشن پوسٹر ان کے مہمان کو قائل کرنے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا (امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۲۵)۔

۱۲۔ جی ڈبلیو چودھری (۱۹۷۴ء)، ص: ۱۰۔

۱۳۔ نرادی چودھری "Elections in Pakistan" ہندوستان اسٹینڈرڈ، ۳۱ دسمبر، ۱۹۷۰ء۔

۱۴۔ مذاکراتی دور کے نشیب و فراز کے صحیح احوال کے لیے دیکھیے ابواب ۴، ۵ اور ۶ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)۔ مزید دیکھیے جی ڈبلیو چودھری (۱۹۷۴ء)۔

۱۵۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۱۲۲۔ جنرل یحییٰ خان کے اخلاص اور پاکستان کو جمہوریت کی جانب لوٹانے

کے لیے کی جانے والی ان کی کاوشوں کے بھرپور دفاع سے مزین کتاب دیکھیے، ایل ایف رشبروک ولیمز (۱۹۷۱ء)۔

۱۶۔ امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۹ تا ۱۱۔ (مصنف نے بنگالی سے ترجمہ کیا)۔ رومی، جہاں آراء امام کے بڑے صاحبزادے مکتی باہنی (freedom fighters) میں شامل تھے، گرفتار ہوئے اور پھر کبھی ان کا سراغ نہ مل سکا۔ دیکھیے باب ۷۔

۱۷۔ رائے (۲۰۰۳ء) ص: ۲۱۰۔

۱۸۔ چودھری (۱۹۷۴ء) ص: ۱۵۸۔

۱۹۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر انیس الرحمان رقم طراز ہیں، ''عدم تشدد پر مبنی سول نافرمانی کی تحریک کے دوران میں نے اپنے لیے 'سونگ ڈائریکٹر' کے شعبے کا انتخاب کیا''۔ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ صرف بنگالی بغاوت میں ہی ایسا ممکن تھا! رحمان نے جن نغموں کو اشاعت وترویج کے لیے منتخب کیا وہ ''برت چاری'' تھے۔ قومی جنگی ترانوں کی ایک قسم جس کی شروعات گروساڈے دت نے ۱۹۳۰ء میں کی۔ ملٹری ایکشن کے آغاز کے بعد وہ اپنے ساتھی رحمان سبحان کے ہمراہ ۳۰ مارچ کو انڈیا فرار ہوتے ہوئے دیہاتیوں کے ہاتھوں مرتے مرتے بچے۔ سبحان کے غیر بنگالی حلیے اور لہجے نے دیہاتیوں کو شبہ میں ڈال دیا۔ دیہاتیوں کی بات چیت سے رحمان کو پتہ چلا کہ وہ ایک دن قبل ہی دو مشکوک افراد کو غیر بنگالی ہونے کے سبب اسی جگہ زندہ دفن کر چکے تھے۔ مقامی ہونے کے سبب رحمان کو بنگلہ زبان پر مکمل عبور حاصل تھا اور اس وجہ سے ان دونوں کی گلوخلاصی ہوگئی۔ جن طلبہ نے ان دونوں پروفیسرز کی جاں بخشی کروائی انھوں نے مشرقی پاکستان کے حقوق کے لیے ان دونوں کی جانب سے کی جانے والی کاوشوں اور نغموں سے متعلق کبھی کوئی خبر نہیں سنی۔ (رحمان (۲۰۰۱ء))۔

۲۰۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۵۵ تا ۱۵۶۔ مسلح گروہ کی جانب سے مغربی پاکستان کے ممبرز آف پارلیمنٹ کو ''ان کے حوالے'' کرنے کے مطالبے کی وجوہات پر بلڈ نے کوئی وضاحت نہیں کی۔

۲۱۔ ماسکریناس (۱۹۷۱ء)، ص: ۹۱ تا ۹۲۔

۲۲۔ ماسکریناس (۱۹۷۱ء)، ص: ۹۹۔

۲۳۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۵۸۔

۲۴۔ امام (۱۹۸۶ء) ۵ تا ۶ مارچ، ص: ۱۷ تا ۱۸۔

۲۵۔ شیل مشمولہ حیدر، (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۵ تا ۶۔

۲۶۔ مثلاً دیکھیے ڈیلی ٹیلیگراف ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء۔

۲۷۔ ماسکریناس (۱۹۸۶ء)، ص: ۱۴۔

۲۸۔ ماسکریناس (۱۹۸۶ء)، ص: ۴ تا ۵۔

۲۹۔ باب ۷ میں دی گئی بحث ملاحظہ کیجیے۔

۳۰۔ مجومدار مشمولہ کبیر (۱۹۹۹ء)۔

۳۱۔ متعدد بنگلہ دیشی قوم پرستوں کا دعویٰ ہے کہ سبھاش چندرا بوس ان کے لیے مشعل راہ ہیں۔ بوس نے دوسری جنگ عظیم میں انڈین نیشنل آرمی قائم کی۔ انہوں نے اسیر فوجی افسران اور جوانوں کی سیاسی ہمدردی حاصل کی۔ ان کے مقاصد میں برٹش انڈین آرمی کے مزید افسران اور جوانوں کو تاج برطانیہ کی وفاداری سے دستبردار کروانا تھا۔ آئی این اے ہر نسل، زبان اور مذہب کے مرد و خواتین پر مشتمل تھی۔ بوس کی آئی این اے کے کئی افسران برٹش انڈین آرمی کی طرح پنجابی مسلمان، سکھ اور ہندو تھے۔ بہت سے افراد کا تعلق ان علاقوں سے تھا جو بعد میں مغربی پاکستان میں شامل ہوئے۔ یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب بوس نے یورپ میں موجود انڈین جنگی قیدیوں سے ''ہندوستانی لشکر'' میں شمولیت کی اپیل کی تو اس وقت یحییٰ خان اور صاحب زادہ یعقوب خان اٹلی میں جنگی قیدی تھے۔

۳۲۔ مائیکل اگنائیف (۱۹۹۳ء)، ص: ۱۵ تا ۱۶۔

۲۔ فوجی اقدام سے گریز: ذمہ داری کے بغیر طاقت

۱۔ *Foreign Relations of the United States, 1969-1976.* (Frus) جلد ۱۱، "South Asia Crisis, 1971" ۲۰۰۵، ص: ۳۶ تا ۳۷۔ اگلے دن کسنجر کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو میں، صدر نکسن فرماتے ہیں، ''سب سے اہم کام یہ ہے کہ خاموش رہیں اور تماشہ دیکھیں۔ دونوں صورتوں میں ہمارے لیے کچھ سودمند نہیں''۔

۲۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۶۲ تا ۱۶۷۔

۳۔ رائے (۲۰۰۳ء)، ص: ۲۱۱ تا ۲۱۲۔

۴۔ امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۲۲۔

۵۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۸۳ تا ۱۸۴۔

۶۔ حکومت پاکستان *White Paper on the Crisis in East Pakistan.* (اگست ۱۹۷۱ء)، باب ۳: "Terror in East Pakistan" ص: ۲۹ تا ۴۳۔

۷۔ مصنف کی جانب سے میجر (کیپٹن) اکرام سہگل کا انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۸۔ ماسکریناس (۱۹۷۱ء)، ص: ۱۰۳ تا ۱۰۴۔ بنگالی بغاوت سے کڑی ہمدردی رکھنے کے باوجود ماسکریناس مجیب اور عوامی لیگ پر تنقید کرتا تھا، اس کا الزام ہے کہ انہوں نے موقع کا فائدہ نہ اٹھایا: ''۳ نے ۲۵ مارچ کے دوران ۳ مختلف مواقع پر بنگالی فوجی افسران نے شیخ مجیب سے رہنمائی چاہی کیونکہ جو کچھ ہونے جارہا تھا اس کے بارے میں انھیں کوئی ابہام نہ تھا۔ ہر بار مجیب نے انہیں نامراد یاسیت کے ساتھ واپس کیا... تاہم سیاستدان جتنا بھی ان پر حاوی ہونا چاہیں، یہ لوگ اور لڑائی میں ان کے شانہ بشانہ بہادری کے جوہر دکھانے والے طلبہ بنگلہ دیش کی جدوجہد کے اصل سرخیل ہیں...'' (۹۷)۔ میں نے بنگلہ دیش میں جاری سیاسی تقسیم پر

فریقین کے دلائل سنے: ایک جانب سے سیاستدانوں پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ تو آرام دہ جلاوطنی کے مزے اڑا رہے تھے جبکہ پولیس اور فوج میں موجود بنگالیوں نے مکتی باہنی میں شامل عام شہریوں کے ہمراہ اصل لڑائی لڑی: رد دلیل یہ ہے کہ مجیب مشکل اور طویل سیاسی جدوجہد کے بعد بنگلہ دیش کو آزادی کی منزل تک لے گیا جبکہ عسکری اداروں میں شامل بنگالی حضرات ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے چاروناچار اس جدوجہد میں شامل ہوئے۔

۹۔ مصنف کا کرنل (میجر) شمین جان بابر کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۱۰۔ مصنف کا لیفٹیننٹ جنرل (لیفٹیننٹ) غلام مصطفیٰ کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۵ء، ۲۰۰۶ء۔

۱۱۔ قریشی (۲۰۰۳ء)، ص: ۱۶ تا ۱۹۔

۱۲۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۶۰ تا ۱۶۱۔ وائس ایڈمرل احسن، سابقہ گورنر، مشرقی پاکستان میں بہتر مقبولیت رکھتے تھے۔

۱۳۔ قریشی (۲۰۰۳ء)، ص: ۱۶ تا ۱۷۔

۱۴۔ مصنف کا کرنل (لیفٹیننٹ) محمد علی شاہ کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۱۵۔ مصنف کا کیپٹن سرور محمود اظہر کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۱۶۔ ماسکریناس (۱۹۷۱ء)، ص: ۱۰۵۔ ماسکریناس پاکستانی صحافیوں کے ایک گروپ کے ہمراہ فوجی حکام کی جانب سے مرتب کردہ دورہ پر مشرقی پاکستان گیا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے خاندان کے ساتھ برطانیہ فرار ہوگیا۔ سفاک انداز میں بغاوت کچلنے سے متعلق اس کی رپورٹ جون ۱۹۷۱ء میں سنڈے ٹائمز میں شائع ہوئی۔

۱۷۔ مائیکل اگناٹیف *Blood and Belonging: Journeys into the New Nationalism* (ونٹیج، ۱۹۹۴ء)، ص: ۱۶۔

۱۸۔ امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۳۴۔

۱۹۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۸۲۔

۲۰۔ جوئے دیو پور، ''راج باڑی''، ایک زمیندار ریاست بھاول کے راجہ کا گڑھ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں ''کمار'' دوم کا، بھاول کے شہزادے کا دارجلنگ کی یاترا کے دوران انتقال ہوگیا۔ بارہ برس بعد ۱۹۲۱ء میں، ایک ''سنیاسی'' ڈھاکہ میں وارد ہوا اور دعویٰ کیا کہ حقیقتاً وہی ''کمار'' ہے اور اس کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ ''کمار'' دوم کی بیوہ نے اسے بہروپیا قرار دے کر مسترد کردیا، لیکن اس کی بہنوں نے اسے اپنا مدت سے بچھڑا بھائی تسلیم کرلیا اور اس کی داشتہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ ایک رقاصہ تھی جس کے ساتھ ''کمار'' نے اپنی بیگم سے زیادہ وقت گزارا تھا۔ عدالت میں ایک طویل مقدمہ چلا اور معاملہ لندن میں پریوی کونسل تک جا پہنچا۔ مدعی نے عدالت میں ہر سطح پر کامیابی حاصل کی اور آخرکار ۱۹۴۶ء میں پریوی کونسل نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اسی شام وہ کلکتہ میں ''کالی'' کے مندر میں پوجا کے لیے گیا۔ وہاں اسے دورہ پڑا اور دو دن بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ یوں وہ اپنی محبت کا صلہ پانے سے پیشتر ہی دنیا سے رخصت ہوگیا۔ میں اپنے نانا سے یہ محیرالعقل واقعہ سنتے سنتے بڑی ہوئی۔ میرے نانا ایک وکیل تھے اور ان کا تعلق مشرقی بنگال سے تھا۔ اپنے دوست پھانی بھوشن چکرابرتی کی طرح جو

بعد میں چیف جسٹس بنے؛ وہ بھی اس پینل کا حصہ تھے جو ''رانی'' کا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ بچپن میں کلکتہ کے لینس ڈاؤن روڈ پر وہ مکان ہمیں اشارے سے ضرور دکھایا جاتا جس کی بالکونی سے ''رانی'' نے فٹن میں سوار اس شخص کو دیکھا جو اس کا شوہر ہونے کا دعوے دار تھا۔ اس محیر العقل مقدمہ کا احوال دہرانے اور تجزیہ کے لیے دیکھیے، پرتھا چٹرجی، *A Princely Impostor? The Strange and Universal History of the Kumar of Bhawal* (پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء)۔

۲۱۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسین خان مشمولہ کبیر (مدیر)، ۱۹۹۹ء، ص: ۹ تا ۴۸، مصنف کا بنگالی سے ترجمہ۔

۲۲۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود مشمولہ کبیر (مدیر)، ۱۹۹۹ء، ص: ۴۹۔

۲۳۔ میجر جنرل کے ایم صفی اللہ ۱۹۸۹ء، ص: ۲۲ تا ۲۷۔

۲۴۔ بریگیڈیئر کریم اللہ نے روزانہ کی بنیاد پر غازی پور میں رونما ہونے والے واقعات کا بھرپور تذکرہ لکھا ہے۔ ۱۹ مارچ سے متعلق ان کا بیان اس باب میں شامل ہے۔

۲۵۔ بریگیڈ میجر جعفر خان کا ۱۹ مارچ کے واقعے سے متعلق بیان اس باب میں شامل ہے۔

۲۶۔ صفی اللہ (۱۹۸۹ء)، ص: ۲۶۔

۲۷۔ مصنف کا بریگیڈیئر (میجر) جعفر خان کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔ خالد مشرف بنگلہ دیش کی آزادی کا مقبول ترین مجاہد بن گیا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں ہونے والی بغاوت در بغاوت کے دوران اس نے کچھ عرصے کے لیے اقتدار پر قبضہ جمایا لیکن بالآخر مارا گیا۔ اسی دوران آرمی افسران نے شیخ مجیب کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور آخرکار جنرل ضیاء الرحمان مسند حکومت پر براجمان ہوئے۔

۲۸۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد تاج نے ۳۲ پنجاب کی کمان سنبھالی جو مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے افسر تھے۔ انہوں نے ۲۵ تا ۲۶ مارچ کو ہونے والی عسکری کارروائی میں مرکزی کردار ادا کیا۔

۲۹۔ بریگیڈیئر کریم اللہ، "Log of Daily Events—POF, Ghazipur" غیر مطبوعہ، مصنف کی اجازت کے ساتھ۔ مزید، مصنف کا بریگیڈیئر کریم اللہ کے ساتھ انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ موصوف ''پنجابی'' نہیں بلکہ ''مدراسی'' تھے۔ ان کے آباء و اجداد جنوبی بھارت کے تھے، انہوں نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

۳۔ فوجی اقدام: ڈھاکہ میں ''آپریشن سرچ لائٹ''

۱۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۹۵۔

۲۔ کسنجر — نکسن کی ٹیلی فون پر گفتگو، ۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء، FRUS جلد ۱۱، ص: ۳۵۔

۳۔ بریگیڈیئر ایم آر مجمدار مشمولہ کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء)، (مجمدار پاکستان آرمی کا سب سے سینئر بنگالی افسر تھا)؛ انیس الرحمان (۲۰۰۱ء) ص: ۲۸؛ رائنا (۱۹۸۱ء) دعویٰ کرتا ہے کہ بھارتی انٹیلی جنس اور بنگالی افسران کے درمیان پہلے سے رابطہ تھا، جن میں کرنل عثمانی، میجر خالد مشرف، میجر صفی اللہ اور قادر ''ٹائیگر'' صدیقی شامل ہیں

اور یہ بھی کہ شیخ مجیب سے مسلسل ڈھاکہ چھوڑنے کے لیے کہا جاتا رہا مگر اس نے انکار کیا، اس نے اپنے ساتھیوں کو آخری لمحات میں ڈھاکہ چھوڑنے کی اجازت دی۔

۴۔ نور العلیٰ مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۔

۵۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۲۵۔

۶۔ مصنف کا میجر جنرل غلام عمر سے انٹرویو، کراچی، ۲۰۰۵ء۔

۷۔ مصنف کا صاحبزادہ یعقوب خان سے انٹرویو، کراچی، ۲۰۰۷ء۔

۸۔ گزشتہ انٹرویو میں، جنرل عمر نے کہا تھا کہ انہوں نے یحییٰ کے مشرقی پاکستان چھوڑنے کے اگلے دن ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان چھوڑا۔ جنرل عمر ایک شاطر انسان ہیں اور اپنے طریقے سے ''بچ جانے'' والوں میں سے ہیں۔ انٹرویو کے لیے میری تیاری کے حصے کے طور پر میں نے ایک ریکارڈنگ سنی (جو Liberation War Museum ڈھاکہ میں بنی) جو بنگلہ دیش کے دو افراد کو چند سال پہلے دیئے گئے ان کے انٹرویو کی تھی۔ جس میں انہوں نے نہایت طویل طویل جواب دیئے تھے۔ جس سے بنگلہ دیشی چکرا کر رہ گئے۔ میں ان کی گفتگو کے دوران مسلسل سوالات کرتی رہی جو زیادہ سود مند طریقہ تھا لیکن جنرل عمر ''آپریشن سرچ لائٹ'' میں اپنے کردار کے اختصار سے نہیں ہٹے۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کے اختتام پر بھٹو نے ''خبروں میں'' انہیں ریٹائر کر دیا اور ان کی پینشن روک دی گئی لیکن دوبارہ اس وقت جاری ہوئی جب ضیاء الحق نے حکومت سنبھالی۔ دیگر افراد جیسے کہ مٹھا اور نیازی جن کی پینشن روک لی گئی تھی اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہوئے۔ آنے والے برسوں میں عمر نے خود کو بھارت کے ساتھ Track II ڈپلومیسی میں شریک کار کے طور پر متعارف کرایا۔ دیگر کے برخلاف عمر نے معزول یحییٰ پر تنقید نہ کی بلکہ سراہا کہ یحییٰ ''بہت اچھے پروفیشنل فوجی'' تھے اور دوسروں کے برعکس ان پر ''ذاتی عادات'' کا الزام ان کی پالیسی کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوا۔

۹۔ قریشی (۲۰۰۳ء)، ص: ۲۳ تا ۲۴۔

۱۰۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، باب: ۲۱۔

۱۱۔ مجمدار مشمولہ کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء)، ص: ۳۳ تا ۳۴۔

۱۲۔ پراباسی سے مراد وہ بنگالی ہیں جو بنگال سے باہر رہتے ہوں، چاہے وہ بھارت میں ہوں یا دنیا میں کہیں اور ہوں۔ ''چٹرجی'' ایک ہندو، برہمن خاندانی نام ہے؛ تاہم یہ خاندان عیسائی تھا۔

۱۳۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، باب: ۱۷۔ جنرل مٹھا کی کتاب کے ابتدائی ابواب اس وقت کی خیرہ کن معاشرتی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ اندو مٹھا اور مٹھا خاندان سے مشرقی پاکستان اور ۱۹۷۱ء کے بارے میں گفتگو سے مجھے بہت فائدہ ہوا۔

۱۴۔ مصنف کا بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) محمد تاج سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۱۵۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، ص: ۳۳۶۔

۱۶۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۱۵۷ تا ۱۶۰۔

۱۷۔ پاکستان آرمی کے افسران کے مابین ۲۵۔۔۔ ۲۶ مارچ کی رات کو آپریشن کے دوران ہونے والی ریڈیو کمیونی کیشن کی جزوی ریکارڈنگ سے (ریڈیو ۲۵۔۔۔ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء)۔ لبریشن وار میوزیم، ڈھاکہ نے ریکارڈنگ کی ایک کاپی مجھے فراہم کی تھی۔ ریکارڈنگ کے مندرجات کی مزید تفصیلات اس باب میں آگے دی گئی ہیں۔

۱۸۔ نور العلیٰ مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۲ تا ۳۔

۱۹۔ FRUS جلد ۱۱، ص: ۳۴۔

۲۰۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۲۰۷۔

۲۱۔ سائمن ڈرنگ، *The Sunday Telegraph*، ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء مشمولہ گورنمنٹ آف بنگلہ دیش (۱۹۸۴ء)، جلد ۱۴، ص: ۳۴۵ تا ۳۴۷۔

۲۲۔ شیل مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۵ تا ۶۔ مصنف کا بنگالی سے ترجمہ۔

۲۳۔ اسلام مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۸ تا ۱۹۔ مصنف کا بنگالی سے ترجمہ۔

۲۴۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، ص: ۳۳۵۔

۲۵۔ بسنتی گوھا ٹھاکرتا (۱۹۹۱ء، ۲۰۰۰ء)، ص: ۱ تا ۵ اور مشمولہ حیدر (مدیر) (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۶۶ تا ۱۷۴۔

۲۶۔ مصنف کا کیپٹن سرور سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۲۷۔ ۱۸ پنجاب، ۳۲ پنجاب اور ۵۷ بریگیڈ ایچ کیو جس نے کارروائی میں حصہ لیا تھا، کے ساتھ میرے انٹرویو کے نتیجے میں مختلف یونٹوں کے درمیان ذمہ داریوں کی تقسیم کا پورا نقشہ سامنے آگیا۔

۲۸۔ مصنف کا بریگیڈیئر (میجر) جعفر خان سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۲۹۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ میں شاہ پر کرپشن کا الزام لگایا گیا اور دیگر افسران کے مطابق مبینہ طور پر گرفتاری سے بچنے کیلئے وہ ملک سے فرار ہوگیا۔

۳۰۔ جیسا کہ کرنل شاہ نے بتایا کہ ایک کمپنی ایک میجر کے زیر کمان ہونی چاہیے تھی، لیکن آرمی میں افسران کی بہت کمی تھی یہاں تک کہ کپتانوں اور لیفٹیننٹوں پر بھی ان کے عہدے اور تجربے سے بڑھ کر ذمہ داریاں پڑی تھیں۔ وہاں فوج کی کمی تھی اس طرح کسی ایک ٹاسک سے نمٹنے کے لیے یونٹس سال بھر ایڈہاک بنیاد پر ٹوٹتے رہے۔

۳۱۔ مصنف کا کرنل (لیفٹیننٹ) محمد علی شاہ سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۳۲۔ یہ واضح نہیں کہ رکاوٹوں (Barricades) پر مزاحمت کار تھے یا غیر ملوث لوگ جو اتفاق سے سڑک پر نکل آئے تھے۔

۳۳۔ مصنف کا رابندرا موہن داس سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۳۴۔ گوھا ٹھاکرتا (۱۹۹۱ء، ۲۰۰۰ء)، ص: ۶۔

۳۵۔ نور العلیٰ مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۔

۳۶۔ شیل مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۶ تا ۸۔ پاکستان آرمی کے لیفٹیننٹ سادات فاروق جو اس سال بعد میں کارروائی کے دوران ہلاک ہوگئے۔ انھوں نے اپنے کچھ ساتھیوں کو رات کو طالب علموں کے ہالز کی تلاشی

کے بارے میں بتایا کہ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بالکل اندھیرے میں جارہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اکثر اندھادھند فائرنگ بھی کررہے تھے۔

۳۷۔ لبریشن وار میوزیم، ڈھاکہ کے پاس ایک ٹیپ ریکارڈنگ ہے جو ۲۵ ــ ۲۶ مارچ کی رات کو ڈھاکہ میں ہونے والے ملٹری ایکشن کے دوران افسران کی کمیونی کیشن پر مبنی ہے۔ اس ٹیپ ریکارڈنگ کا ــ جو ایک دلچسپ ابتدائی ذریعہ ہے ــ کریڈٹ اٹامک انرجی سینٹر، ڈھاکہ کے ایم ایم حسین کو جاتا ہے جنہوں نے یہ ریکارڈنگ کہا جاتا ہے کہ B-174 کھلگاؤں چودھری پاڑا، ڈھاکہ میں بنائی۔ یہ ۲۶ مارچ کو رات ڈیڑھ بجے سے صبح نو بجے کے دوران کی ہے۔ میں لبریشن والا میوزیم کی نہایت مشکور ہوں کہ انہوں نے میری تحقیق کے لیے مجھے اس ریکارڈنگ کی ایک کاپی فراہم کی۔ پاکستان آرمی کے افسران سے انٹرویو کے ذریعے میں نے ٹیپ کے باوثوق ہونے کی تصدیق کی اور کچھ بولنے والوں کی شناخت بھی امکانی طور پر ہوئی جو تو سین میں دیئے گئے ہیں۔

۳۸۔ مصنف کا بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج، ۲۰۰۵ء اور بریگیڈیئر (میجر) جعفر خان، ۲۰۰۶ء سے انٹرویو۔

۳۹۔ جہاں آراء امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۴۰ تا ۴۱۔

۴۰۔ اختر امام (۱۹۹۸ء، ۲۰۰۲ء) اور مصنف سے گفتگو، ۲۰۰۶ء۔

۴۱۔ بیگم امام جو بیتھیون کالج، کلکتہ میں پڑھتی تھیں۔ ۱۹۳۷ء میں فلسفہ کے آنرز کی طالبات میں اول نمبر پر آنے کی بنا پر کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے گنگامنی دیوی طلائی ایوارڈ سے نوازی گئیں۔ وہ ۱۹۵۶ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں رُقیہ ہال کی سربراہ (Provost) تھیں۔ اختر امام نے بتایا کہ ۲۷ مارچ کو جب کرفیو اٹھایا گیا تو ان کا تباہ شدہ گھر دوبارہ حملے کا نشانہ بنا۔ اس بار بہت سے مشتعل بنگالیوں نے یہ جاننے کا مطالبہ کیا کہ کتنی سو" طالبات کو مارا پیٹا اور قتل" کیا گیا۔ جیسے ہی ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جنگ ختم ہوئی ان سے ایک بھارتی ''میجر" نے سوال کیا کہ ۲۵ ــ ۲۶ مارچ کو اور اس کے بعد میں رُقیہ ہال میں کتنی طالبات تھیں۔ ان سے اور ان کے ٹیوٹر سے گفتگو اور ہال کے ریکارڈ کی جانچ کے بعد بھارتی افسر نے تبصرہ کیا کہ اس نے پہلے جو کچھ بھی کہا تھا وہ اب مکمل غلط ثابت ہوا (امام (۱۹۹۸ء)، ص: ۱۵۳ تا ۱۵۵)۔ مسز امام آزاد بنگلہ دیش میں چھٹیوں پر بھیج دی گئیں، ان پر "غدار" کا لیبل لگا اور ان کو اپنی سربراہ (Provost) کی پوسٹ پر واپس آنے کی کبھی اجازت نہ دی گئی۔

۴۲۔ بسنتی گوھا تھا کرتا نے واضح کیا کہ شاہد مینار پر فائرنگ سنی تھی۔ فوجی کچھ باغیوں کا گلیوں میں ان کے تالابی علاقے میں پیچھا کررہے تھے۔ گوھا تھا کرتا (۲۰۰۰ء)، ص: ۱۱ تا ۱۳۔

۴۳۔ نور العلیٰ مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۲۔ مصنف نے بنگالی سے ترجمہ کیا۔

۴۴۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۴۲۔

۴۵۔ میں نے ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر جانا کہ بلڈنگ ۳۴ میں کیا ہوا تھا۔ اس میں میری گفتگو اور متاثرہ مقام کا دورہ جوئے تیرموئے گوھا تھا کرتا، جو ڈھاکہ یونیورسٹی کی فیکلٹی ممبر تھیں اور ان کی بیٹی میگھنا گوھا تھا کرتا، مسز بسنتی گوھا تھا کرتا کی کتاب، جس میں پروفیسر انیس الرحمان کی کتاب کا ضمیمہ بھی شامل کیا گیا تھا، جہاں آراء امام کا حیَ

خاندان سے ۲۷ مارچ کو اسپتال میں ہونے والی ملاقات کا حوالہ، شیل اور فضل کا لاشوں کو اٹھانے سے متعلق بیان، آرمی کمانڈرز کے مابین ریڈیو (وائرلیس) سے ہونے والے پیغامات کے ٹیپس، اور کئی افسران کے انٹرویوز جنھوں نے ڈھاکہ میں اس رات فوجی ایکشن میں حصہ لیا تھا، سب شامل تھے۔ میں پروفیسر میگھنا گوھا ٹھاکرتا کی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے یونیورسٹی سے جگن ناتھ ہال اور اس کے میدان، بلڈنگ ۳۴ تک جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتی تھیں، میرا ساتھ دیا — اور مجھے یہ جاننے میں مدد دی کہ وہاں کیا ہوا تھا بشمول اس جگہ کے جہاں پر ان کے والد گولی کا نشانہ بنے۔

۴۶۔ یہ گفتگو بالکل ویسے ہی پیش کی گئی ہے جیسی بسنتی گوھا ٹھاکرتا (۱۹۹۱ء، ۲۰۰۰ء)، ص: ۶ تا ۷ نے لکھی۔ مصنف نے یہ ترجمہ بنگالی سے کیا۔ ممکن ہے اردو میں گرامر کی کچھ غلطیاں ہوگئی ہوں، لیکن یہ اسی طرح پیش کی گئی ہے جیسے بسنتی گوھا ٹھاکرتا نے لکھی۔

۴۷۔ ۱۸ پنجاب کے افسران سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے بٹالین حوالدار میجر کو شناخت کیا۔ وہ عام طور پر کمانڈنگ آفیسر کے ساتھ ہوتا تھا۔

۴۸۔ رحمان (۲۰۰۱ء)، امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۴۴ تا ۴۵۔

۴۹۔ کمال حسین ایک معروف وکیل اور بنگلہ دیش کے سابق وزیر خارجہ ہیں۔ بریگیڈیئر تاج نے بتایا کہ انھوں نے جس کیپٹن کو کمال حسین کو گرفتار کرنے کے لیے بھیجا تھا اس نے شکایت کی کہ مسز حسین (جو مغربی پاکستان سے تھیں) نے اس کو تھپڑ مارا تھا۔ بنگلہ دیش میں یہ کہانی بالکل الٹ ہے — افسر پر حسین کی بھتیجی کو تھپڑ مارنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے (رحمان (۲۰۰۱ء)، ص: ۳۷)۔ میجر جنرل مٹھا نے لکھا ہے کہ کمال حسین نے بعد میں انھیں اپنے سالے (یا بہنوئی) کے ذریعے ایک پیغام بھیجا تھا جس میں اپنی گرفتاری پیش کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تھا، اور جنرل مٹھا نے انھیں ان کے ایک رشتہ دار کے گھر سے گرفتار کیا (مٹھا، ص: ۳۴۴)۔

۵۰۔ عبداللہ خالد، مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۲۶ تا ۳۰؛ کوہ نور حسین مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۱ء، جلد چہارم) ص: ۱ تا ۱۹۔

۵۱۔ بسنتی گوھا ٹھاکرتا لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر مرتضیٰ نے، جو اقبال ہال کے برابر میں رہتے تھے، انہیں بتایا کہ ۲۶ مارچ کی صبح انہوں نے کس طرح باہر جا کر دو زخمی طالب علموں کی مدد کی اور ان کو ملٹری نے لاشوں کو اٹھانے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ''برٹش کونسل'' کے قریب ۲۵ سے ۳۰ افراد کی لاشیں گنیں جنہیں ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی ماری گئی تھی انھیں بھی فوجی گولی مارنے والے تھے کہ ایک ٹرک نمودار ہوا اور فوجی اس ٹرک میں سوار ہو کر انہیں چھوڑ گئے۔ بالکل ایسا ہی بیان شیل اور ایک دوسرے شخص ابوالفضل کا تھا جس نے دعویٰ کیا کہ وہ اس رات جگن ناتھ ہال میں موجود تھا، اس نے لاشیں اٹھائیں اور پھر بچ نکلا۔ وہ محکمہ ڈاک سے وابستہ تھا، لیکن یکم مارچ سے جگن ناتھ ہال میں تھا۔ ان کے پاس بم بنانے کے لیے کمروں میں بارود بھی تھا۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ حملے کے دوران وہ بیت الخلا میں چھپ گیا تھا، اور بعد میں مالیوں اور بھنگیوں میں گھل مل کر اپنی شناخت چھپاتا رہا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ فوجیوں نے بنگالیوں سے بہاریوں کو الگ کیا، مگر سب کو گولی ماردی۔ فضل نے

کہا کہ اس نے پروفیسر منیر الزماں، ان کے دو رشتہ داروں اور ایک روم میٹ شیشو توش دتہ کی لاشیں اٹھائیں۔ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ اپنے گروپ کو گولی مارے جانے سے پہلے ہی وہ لاشوں کے درمیان گر گیا تھا۔ اس کی وضاحت کے مطابق وہ اور شیل ایک ہی مقام پر تھے۔ وہ اور ایک اور لڑکا جو طالب علم نہیں تھا — فرار ہو گئے تھے۔ فضل دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے سامنے والی عمارت سے دیکھا کہ بلڈوزروں نے ۵۰ سے ۶۰ لاشوں کو کچل کر برابر کر دیا اور لاشوں کے اعضا زمین پر چپکے ہوئے تھے۔ اس کا بیان کسی اور نے ایک انٹرویو کی بنیاد پر لکھا (کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء) ص: ۹۴ تا ۹۹)۔

۵۲۔ "Dispatches" War crimes file ، ۱۹۹۴ء۔ میں نے چینل ۴ سے رابطہ کیا مگر وہ اصلی فلم ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔

۵۳۔ اختر امام (۲۰۰۲ء)، ص: ۲۶۶ تا ۲۶۷۔

۵۴۔ اس واقعے میں تین افسران ملوث تھے اور سب نے مجھ سے بات کرنے سے انکار کیا۔ اس لیے میں ان کے ذاتی افعال کے بارے میں پر یقین نہیں ہوں۔

۵۵۔ میگھنا گوھا ٹھاکرتا بنگالی دستاویزی فلم *Shei raater kotha boltey eshechhi* میں۔

۵۶۔ یہ پولیس لائنز کی ریکارڈ شدہ ریڈیو کمیونی کیشن میں ایک حوالہ ہے جو اشتعال انگیز ہے۔

۵۷۔ انہوں نے نیو مارکیٹ کے علاقے میں درجنوں غریب افراد کی لاشیں بھی دیکھیں، جو سڑک اور فٹ پاتھ پر پڑی تھیں۔ بنگلہ دیشی فضائیہ کے ایک پائلٹ بدر العالم نے، جنہیں جنگِ آزادی میں ان کے کردار پر خطاب عطا کیا گیا، نیو مارکیٹ کے علاقے میں ۲۷ مارچ کو عام افراد کی لاشیں دیکھیں۔ (مصنف کی ڈاکٹر کلام اور مسٹر عالم سے گفتگو)۔

۵۸۔ مصنف کا بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) تاج سے انٹرویو۔ بریگیڈیئر اے آر صدیقی آئی ایس پی آر کے سربراہ تھے۔ مزید دیکھیے صدیقی (۲۰۰۵ء)۔ پاکستان آرمی کے متعدد افسران نے جنہوں نے مشرقی پاکستان میں خدمات انجام دیں مجھ سے کہا کہ ان کے خیال میں غیر ملکی میڈیا کو باہر نکال دینا ایک سنگین غلطی تھی۔

۵۹۔ روجرز اور کسنجر کے مابین ٹیلی فون پر گفتگو، ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء (FRUS جلد ۱۱، ص: ۴۷ تا ۴۸)۔

۶۰۔ کسنجر اور نکسن کے مابین ٹیلی فون پر گفتگو، ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء (FRUS جلد ۱۱، ص: ۳۷)۔

۶۱۔ سینئر ری ویو گروپ کی میٹنگ، وائٹ ہاؤس سچویشن روم، ۶ مارچ ۱۹۷۱ء (FRUS، جلد ۱۱، ص: ۸ تا ۱۶)۔

۶۲۔ بلڈ (۲۰۰۲ء)، ص: ۲۸۶۔

۶۳۔ کسنجر، *White House Years*، محولہ FRUS جلد ۱۱، ص: ۴۸۔

۶۴۔ مصنف کا لیفٹیننٹ جنرل اے اے کے نیازی سے انٹرویو، ۲۰۰۳ء۔ مزید دیکھیے نیازی (۱۹۹۸ء، ۲۰۰۲ء)۔

۶۵۔ نذرالاسلام مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۸ تا ۲۵۔ بنگالی سے ترجمہ مصنف نے کیا۔ اسلام اور اس کے دوست بچ گئے، شاہنواز پہلے ہی مر چکے تھے۔

۴۔ وحشیانہ جنگ: گھیراؤ، بغاوتیں اور پاگل پن

۱۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۴۵ تا ۴۸۔

۲۔ مصنف کا (اس وقت) لیفٹیننٹ سید عطا اللہ شاہ سے انٹرویو ۲۰۰۶ء۔ ۱۹ اپریل کو Time میں ڈین کوگنز کی شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ''نسیم وقیر'' کشٹیا کے اسسٹنٹ ڈی سی (ڈسٹرکٹ کمشنر) قتل کر دیے گئے اور ان کی لاش کو گلیوں میں گھسیٹا گیا۔

۳۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۴۷، فٹ نوٹ ۷۔

۴۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۴۷ تا ۴۸۔

۵۔ مصنف کا آمیہ کمار سُور سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء۔ شنکھر یپارہ میں ان انٹرویوز کے دوران دیگر بچ جانے والے متاثرین (جیسے نارائن نندی) بھی آئے اور سرہلا کر اقرار کیا، یا اپنے تجربات بیان کیے۔

۶۔ ۱۸ پنجاب رجمنٹ ہی ڈھاکہ یونیورسٹی میں کارروائی کی طرح شنکھر یپارہ پر حملے کے لیے ذمہ دار تھی۔ کیپٹن صالح حسن مرزا کی قیادت میں یہی کمپنی ۲۶ تا ۲۵ مارچ کو رات کو اسٹوڈنٹ ہال میں تھی، بظاہر اگلے دن شنکھاری پاڑا میں تھی۔ ۱۸ پنجاب کے سی او لیفٹیننٹ کرنل بشارت سلطان اور کیپٹن صالح حسن مرزا مجھ سے بات کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ شنکھر یپارہ کیوں ہدف ہوگا، ایک اور افسر نے جو ڈھاکہ سے تھا مجھے بتایا کہ اس نے کہانیاں سنی ہیں کہ امیر ہندو مارواڑی عوامی لیگ کی مالی مدد کرتے تھے اور شنکھر یپارہ میں رہتے تھے اور یہ کہ مسلمانوں کو اس گلی سے صرف ننگے پاؤں گزرنے کی اجازت تھی۔ لہٰذا لالچ، نفرت اور فرقہ واریت ممکنہ وجوہات ہوسکتی ہیں، لیکن یہ جائز فوجی اہداف کی بنیاد نہیں بناتے۔

۷۔ ماسکرینا س (۱۹۷۱ء)، ص: ۱۱۴۔ ''پاڑا'' اور ''پٹی'' سے مراد پڑوس ہے۔

۸۔ مصنف کا امر سُور سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء۔ اس کا ایک بچ نکلنے والا بھائی اور ایک دوسرا بچنے والا شخص وقتاً فوقتاً گفتگو میں شریک رہے۔ جبکہ دیگر کبھی کبھار تھوڑا سا اضافہ کر دیتے، بھائی کچھ نہیں بولا۔

۹۔ امر سُور کے مطابق اسٹوڈیو سووا بازار کلکتہ میں ''اے کے اسٹوڈیو'' تھا۔ جس فوٹوگرافر نے یہ تصویر کھینچی اس نے دیگر تصاویر بھی کھینچیں ــــ جو اگر مل جائیں تو قیمتی ذریعہ (وسیلہ) ثابت ہوسکتی ہیں۔

۱۰۔ ایک بنگالی اخبار نے تصویر میں موجود متاثرین کی درست شناخت کی مگر غلط بیان دیا کہ ان لاشوں کو گلیوں میں پھینک دیا گیا تھا۔ ڈھاکہ میں واقع لبریشن وار میوزیم سے شائع ہونے والی ایک ''دستاویز'' میں اس تصویر کا کیپشن غلط لگایا ہے کہ ''معصوم خواتین جن کو وحشی پاکستان آرمی نے زیادتی کے بعد ان کے بچوں سمیت قتل کر دیا''۔

۱۱۔ ''دا'' کا کسی کے نام میں اضافہ بڑے بھائی کے معنوں میں کیا جاتا ہے اور یہ غیر رشتہ داروں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

۱۲۔ نیچے جنجیرا کا حصہ دیکھیں۔

۱۳۔ ڈھاکہ میں فوجی کارروائی میں حصہ لینے والے آرمی یونٹس کے مابین ابلاغ (کمیونی کیشنز) کی ریکارڈنگ سے

۲۵ تا ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء۔ قوسین میں مقررین کے ممکنہ نام دیے گئے ہیں۔

۱۴۔ مصنف کا کرنل (لیفٹیننٹ) محمد علی شاہ سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۱۵۔ بریگیڈیئر کریم اللہ "Log of Daily Events — POF, Ghazipur" (غیر مطبوعہ) مصنف کی اجازت اور مصنف کا بریگیڈیئر کریم اللہ سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۱۶۔ صفی اللہ (۱۹۸۹ء)، ص: ۲۷ تا ۲۸۔

۱۷۔ بریگیڈیئر مجمدار مشمولہ کبیر، (مدیر) (۱۹۹۹ء)، ص: ۳۳ تا ۴۷۔

۱۸۔ لیفٹیننٹ کرنل مسعود الحسین خان مشمولہ کبیر، (مدیر) (۱۹۹۹ء)، ص: ۴۸ تا ۵۹۔

۱۹۔ میجر جنرل صفی اللہ مشمولہ حیدر، (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۲۲۶ تا ۲۲۷۔ مصنف کا بنگالی سے ترجمہ۔

۲۰۔ صفی اللہ (۱۹۸۹ء)، ص: ۲۷ تا ۳۹۔

۲۱۔ بریگیڈیئر کریم اللہ "Log of Daily Events — POF, Ghazipur" (غیر مطبوعہ)۔

۲۲۔ صفی اللہ (۱۹۸۹ء)، ص: ۳۹۔

۲۳۔ مصنف کا رستم علی سکدر سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۴۔ مصنف کا عبدالرب سردار سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۵۔ سردار کا خیال تھا کہ کریسنٹ جوٹ مل کا جنرل منیجر ایک انگریز تھا جس کا نام والس تھا۔ کریسنٹ جوٹ مل کے ایک اور ملازم ایس ایم راقب علی کا خیال تھا کہ جنرل منیجر مہر علی تھا، اور اس کا ڈپٹی مسٹر میکلائی تھا۔ اور یہ دونوں بمبئی سے تھے، اس کا مطلب ہے کہ دونوں اسماعیلی تھے۔ بنگالیوں کی جانب سے بیان کیا جاتا ہے کہ تمام اسماعیلی منیجرز اچھے انسان تھے، جو بنگالیوں اور بہاریوں دونوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ رکھتے تھے۔

۲۶۔ مصنف کا محمد شفیع، سبیک، پرویز عالم خان اور دیگر سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۷۔ جن بنگالی مل ملازمین کے میں نے انٹرویو کیے انہوں نے بہاریوں پر الزام لگایا کہ اسی سال بعد میں انہوں نے بنگالیوں کو مارنے کے لیے پھانسی گھاٹ تیار کیا۔

۲۸۔ مصنف کا کرنل (میجر) ثمین جان بابر سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۲۹۔ حکومت پاکستان، *White Paper* (۱۹۷۱ء)، ص: ۶۴ تا ۶۹۔

۳۰۔ مصنف کی محمد عبدالحق اور شیخ سلطان احمد سے گفتگو ۲۰۰۴ء۔ احمد کے نقطۂ نظر پر دیگر تائیدی مواد کے بغیر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، یہ مصدقہ بات ہے کہ ''چھاؤنی'' میں بنگالی عناصر نے بغاوت کر دی تھی اور کئی مغربی پاکستانی وہاں قتل کر دیئے گئے تھے۔ احمد کی کئی کہانیوں میں ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ آنے والے دنوں میں اس نے ایک ''پنجابی'' کی جان بچائی بدلے میں بعد میں اس ''پنجابی'' نے احمد کی جان بچائی۔ اس نے ''پنجابی'' کا نام نذیر احمد بتایا جو ایک تاجر غلام رسول کا بھتیجا تھا۔ غلام رسول مشکلات اور بدامنی شروع ہوتے ہی اپنے بھتیجے کو کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ کر اپنے خاندان کے ساتھ مغربی پاکستان چلا گیا تھا۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ ''امن کمیٹی'' کے ایک بنگالی رکن نے آخر کار ان کی جائیداد ہتھیالی۔

۳۱۔ بریگیڈیئر (کیپٹن) شوکت قادر، مخطوطہ (غیر مطبوعہ) ص: ۷۔

۳۲۔ مصنف کا افسر سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۳۳۔ مصنف کا میجر انیس احمد سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ مزید دیکھیے اوپر جوئے دیو پور کے حصے میں۔

۳۴۔ بریگیڈیئر (کیپٹن) شوکت قادر، مخطوطہ (غیر مطبوعہ) ص: ۷، اور مصنف کا انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۳۵۔ مصنف کا کیپٹن سرور سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۳۶۔ مصنف کا بریگیڈیئر اقبال شفیع سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۳۷۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، ص: ۳۳۶ تا ۳۳۸۔

۳۸۔ رائے (۲۰۰۳ء)، ص: 215۔

۳۹۔ چودھری مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء) اور مصنف کا شمشیر مبین چودھری سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ سابق کامریڈز۔ ان۔ آرمز نفرت کی جس گہرائی میں اترا اس کا ایک اشارہ یہ ہے کہ، چودھری نے الزام لگایا کہ اسے اسپتال کے بستر تک پر مارا پیٹا گیا، اور اس نے پاکستان آرمی کو بور بور، پوشو سلابہ، رکتا ان میڈ (وحشی، جانوروں جیسے، خون آشام) کہا۔ تاہم، وہ ایک طویل تحقیقات سے گزرے، ستمبر میں انہیں چارج شیٹ دی گئی اور دسمبر میں جب بھارت سے مکمل جنگ چھڑ گئی ان پر مقدمہ چلایا جانا تھا۔ انہوں نے آزاد بنگلہ دیش میں سفارتی خدمات انجام دیں۔

۴۰۔ جنرل مٹھا نے اس آپریشن کے دوران ایک بنگالی میجر کو بھی اپنے پرسنل اسٹاف آفیسر (PSO) کے طور پر بھرتی کیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ تنازع نسلی بنیاد پر نہیں تھا۔ اس کے برعکس، چٹا گانگ کے ملٹری اسپتال کے دورے کے دوران انہوں نے لکھا ''جب میں وارڈ کی طرف جا رہا تھا ایک بنگالی افسر نے جو زخمی اور زیر نگرانی تھا، مجھے پکارا۔ میں رک گیا اور اس کی طرف گیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اس نے اور اس کے سپاہیوں نے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کو برہنہ کر کے اس کے ساتھ زیادتی کی، اور پھر اسے برہنہ حالت میں ناچنے پر مجبور کیا، اب اس کے بعد وہ سب مرنے میں خوشی محسوس کریں گے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا... '' (مٹھا (۲۰۰۳ء) ص: ۳۴۱)۔ میری تحقیق کے دوران مجھے تین دیگر پاکستانی افسران ملے جنھوں نے انفرادی طور پر بالکل ویسا ہی تجزیہ ڈھاکہ ملٹری اسپتال کا بتایا، سوائے اس کے کہ وہ اس زخمی بنگالی افسر کو جانتے تھے اور نام سے بھی واقف تھے۔ وہ زندہ بچ گیا اور آزاد بنگلہ دیش میں اعلیٰ عوامی خدمات انجام دیں۔

۴۱۔ مصنف کا کرنل (میجر) انیس احمد سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۴۲۔ مصنف کا لیفٹیننٹ جنرل (کیپٹن) علی قلی خان سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۴۳۔ مثال کے طور پر دیکھیے، *Washington Post* ۱۲ مئی ۱۹۷۱ء، *New York Times* ۱۱ مئی ۱۹۷۱ء اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی رپورٹس۔

۴۴۔ رائے (۲۰۰۳ء)، ص: ۲۱۴ تا ۲۲۱۔ اس وقت موجود لاقانونیت کی ایک اور مثال، اپنے علاقے کے DC اور

SDO (سول سرونٹ) نے ایک پٹھان ٹھیکے دار نور الزماں خان سے کہا کہ وہ اپنے آتشیں ہتھیار رکھ دے تو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اس نے ایسا کیا تو بنگالی EPR فوجیوں نے اسے قتل کر دیا۔ پولیس کا بہاری ریزرو انسپکٹر بھی اپنے خاندان سمیت مارا گیا۔ دونوں واقعات میں آرمی ملوث نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ایک یونٹ نے چٹا گانگ کے بنگالی ایس پی (سپرنٹنڈنٹ آف پولیس) سے اس کی مدد کرنے کا پوچھا تاکہ انتظامیہ پھر سے فعال ہو سکے۔ لیکن دوسری یونٹ کے ایک افسر نے اسے اٹھالیا اور وہ پھر کبھی نظر نہ آیا۔

۴۵۔ مصنف کا جوئے نال عابدین دیوان سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۴۶۔ صدیقی (۱۹۹۷ء)، جلد ا۔

۴۷۔ اوپر جوئے دیو پور کا حصہ دیکھیں۔

۴۸۔ صدیقی (۱۹۹۷ء)، جلد ا، ص: ۱۸ تا ۳۵۔

۴۹۔ مصنف کا لیفٹیننٹ عطا اللہ شاہ سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۵۰۔ اصل میں رپورٹر *Guardian* کا مارٹن وولا کوٹ محسوس ہوتا ہے، جس نے "Death and Victory in Bangladesh" کے نام سے رپورٹ مرتب کی جو ۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو شائع ہوئی۔ ۷ اپریل کو بی بی سی کے مارک ٹلی کی نشر ہونے والی رپورٹ میں وولا کوٹ کے مضمون کا حوالہ دیا گیا۔ جبکہ ۱۹۷۱ء کی غیر ملکی پریس رپورٹس پر تحقیق کے دوران ایک تصویر ملی جو ۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو *Daily Telegraph* میں چھپی، اس کا کیپشن یوں تھا: ''مغربی پاکستان آرمی کا ایک لیفٹیننٹ، جس کا سر زخمی ہے۔ جیسور کے قریب بنگلہ دیش (آزاد بنگال) لبریشن فورسز کے ہاتھوں اپنے سولہ دیگر ساتھیوں سمیت پکڑے جانے کے بعد رپورٹر کو انٹرویو دے رہا ہے''۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ لیفٹیننٹ کا سر کیسے زخمی ہوا۔ اس صفحے پر چوڈانگا سے بھی ایک رپورٹ ہے۔ اس صفحے پر کلکتہ سے ڈیوڈ لوشک کی ایک رپورٹ کا کیپشن ہے "Britons tell of army's massacre in Chittagong"۔ لیکن برطانوی پناہ گزینوں کا کہنا تھا کہ دونوں اطراف سے ایک دوسرے کا قتل کیا گیا اور تقریباً تمام رپورٹس میں عوامی لیگ کے دیگر بنگالی اور غیر بنگالیوں پر مظالم کے بارے میں بتایا گیا۔

۵۱۔ مصنف کا میجر جنرل امام الزماں سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء؛ بریگیڈیئر اے ایل اے زماں اور کرنل کمال الدین، ۲۰۰۶ء؛ بریگیڈیئر اقبال شفیع، ۲۰۰۶ء۔ اس کے علاوہ اوپر چٹا گانگ کا حصہ دیکھیں۔ الجھن سے بچنے کے لیے دو کرنز کو ان کے ۱۹۷۱ء کے رینک سے منسوب کیا گیا ہے۔ ''کیپٹن زماں'' اور ''لیفٹیننٹ امام''۔

۵۲۔ میجر جنرل امام الزماں (۲۰۰۱ء، ۲۰۰۲ء)؛ مشمولہ حیدر، (مدیر) (۱۹۹۶ء)؛ *New York Times*؛ ۱۷ اپریل ۱۹۷۱ء۔

۵۳۔ بریگیڈیئر اقبال شفیع علی گڑھ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی، وہاں ان کے والد اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ جب میں ان سے ملی تو وہ ملنسار اور کسی حد تک پروفیسرانہ تھے۔ بریگیڈیئر شفیع نے کہا کہ وہ مشرقی پاکستان میں رہنا پسند کرتے ہیں اور وہاں پر تین مرتبہ پوسٹنگ بھی بخوشی قبول کی۔ چٹا گانگ میں مارچ — اپریل ۱۹۷۱ء میں اپنے ٹاسک کی تکمیل کے بعد بریگیڈیئر شفیع نے فینی میں رہائش کا فیصلہ کیا۔ ایک دوسرے بریگیڈیئر

نے کومیلا میں عہدہ سنبھالا۔

۵۴۔ مصنف کا میجر عبدالمجید سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ انہوں نے کیپٹن زماں کو پاکستان آرمی کے ایک دیانت دار بنگالی افسر کے طور پر یاد رکھا جس نے جنگ کے اختتام تک لڑائی کی۔

۵۵۔ دیکھیے اے کے ایم فضل الحق خاں ان کے بھائی کومیلا کے ڈی سی شمس الحق خان، مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۱ء) جلد ۴۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ڈی سی نے ایس پی اور دیگر کے ساتھ اوائل مارچ میں حکومت کے خلاف مزاحمت کا پلان بنایا تھا، آرمی کو راشن کی فراہمی روک دی اور ایس پی کو حکم دیا کہ بریگیڈ کمانڈر کو اسلحہ خانہ کی چابی نہ دے۔ جب جنرل مٹھا ''گمشدہ'' ۵۳ ایچ کیو بریگیڈ کی تلاش میں ۲۶ مارچ کو آئے تو کومیلا چھاؤنی گئے، وہاں انہیں آرٹلری لیفٹیننٹ کرنل یا میجر ملا جو بہت جذباتی اور گھبرایا ہوا تھا.... اس نے دعویٰ کیا کہ ایک بہت بڑا ہجوم کومیلا میں چھاؤنی پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہوا ہے۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ ہراساں ہو رہا ہے...'' (مٹھا (۲۰۰۳ء) ص: ۳۳۶)۔ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ میں ۲۷ تا ۲۸ مارچ کو مبینہ طور پر ۱۷ بنگالی افسران اور ۹۱۵ سپاہیوں کے قتل عام کو لیفٹیننٹ کرنل یعقوب ملک کے احکام سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ملک نے کمیشن کو شواہد پیش کیے (HRC رپورٹ، ص: ۵۱۰، ۵۱۲)۔

۵۶۔ صفی اللہ (۱۹۸۹ء)، ص: ۶۶ تا ۷۴۔

۵۷۔ سین *Identity and Violence: the Illusion of Destiny* (ایلن لین، ۲۰۰۶ء)، ص: ۱۷۱ تا ۱۷۲۔

۵۔ بیواؤں کا گاؤں: دیہی علاقوں میں ''کارروائی''

۱۔ مصنف کا ریحان علی سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۔ تین ہزار کا اندازہ بہت زیادہ ہے، یہاں تک کہ قریبی علاقے کے لوگوں اور باہر کے لوگ جیسے باغی پولیس کو گننے کے بعد بھی۔ یہ کسی ایسے شخص کی قوتِ حافظہ بھی ہے جو اس وقت بچہ تھا۔ تاہم، میری اس مقام کے دورے کی بنیاد پر رائے قائم کی، دریائی کنارے کا درست نقشہ سامنے آیا۔ خصوصاً خشک موسم میں یہاں پر کئی سو افراد ہو سکتے ہیں۔

۳۔ مصنف کا محمودہ بیگم سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ مغربی پاکستان کے صوبے بلوچستان کے لوگوں کا ایک حوالہ ہے۔ ''بلوچوں'' کو مشرقی پاکستان میں بنگالیوں سے متعلق کرنے کا ایک تجزیہ باب نمبر ۹ میں ہے۔

۵۔ مصنف کا اویا جان سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۶۔ مصنف کا محمد عبدالستار سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۷۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح تھے۔

۸۔ چور: گاد کے باعث بننے والے زمین کے عارضی قطع۔

۹۔ پاکستان آرمی کے ایک افسر نے مجھے بتایا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ میجر سیف اللہ خان ہو، جو ۱۲ پنجاب رجمنٹ کا پٹھان افسر تھا اور اس علاقے میں تعینات تھا۔ اس سازشی معاملے سے متاثرہ پاکستان آرمی کا افسر بنگالی دیہاتی کی جانب سے سراہا گیا۔ یہ دیہاتی گولی لگنے پر بھی بچ گیا اور جلنے سے بھی ایک دوسرے افسر کے ہاتھوں بچ گیا تھا۔ میں نے میجر سیف اللہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو مجھے بتایا گیا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

۱۰۔ مصنفہ کا محمد زینت العالم سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۱۱۔ بظاہر افسران کو ہلاک اور مثلہ (لاشوں کو مسخ) کیا گیا تھا۔ عالم نے نہیں بتایا کہ بیوی کے ساتھ کیا ہوا۔

۱۲۔ جبکہ ریحان علی اور اس کے والد محمد عبدالستار نے کہا کہ آرمی یونٹس راج شاہی سے آ رہے تھے، عالم باوثوق تھا کہ وہ یونٹس ڈھاکہ سے راج شاہی کی طرف جا رہے تھے۔

۱۳۔ عالم اپنے بھائی اور بہنوئی کو (خود کی جانب سے) روکنے کے حوالے سے گہرے احساس جرم میں مبتلا ہے۔ یہ لکڑی کے لٹھوں کو پکڑ کر تیرتے ہوئے پار جاتے۔ جیسا کہ بعد ازاں دونوں افراد گولی مار کر ہلاک کر دیئے گئے اور یہ جان بچانے میں کامیاب رہا۔ اس نے اپنی زندگی اپنی بیوہ بہن اور اس کے خاندان کی دیکھ بھال میں گزار دی۔ اس سے بھی میں نے اس کے گھر پر ملاقات کی۔

۱۴۔ بنگالی میں ''ز'' کی آواز نہیں ہوتی یہ ''ج'' کی آواز دیتا ہے۔ لہٰذا ''زینٹل'' کی آواز ''جینٹل'' ہے۔

۱۵۔ مغربی پاکستان کے صوبے سندھ سے۔

۱۶۔ ایک گاڑی، ٹرائی سائیکل، (Tandem)۔

۱۷۔ مصنف کا بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) محمد تاج سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ لیفٹیننٹ جنرل (بریگیڈیئر) جہاں زیب ارباب نے متعدد درخواستوں کے باوجود انٹرویو نہ دیا۔

۱۸۔ مٹھا (۲۰۰۳ء)، ص: ۳۴۳ تا ۳۴۴۔

۱۹۔ لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں بظاہر میجر جنرل) رضوی نے انٹرویو دینے سے اجتناب برتا۔

۲۰۔ ناظم محمود، راج شاہی یونیورسٹی کے اسٹاف ممبر نے وائس چانسلر سجاد حسین کی بالکل الٹ عکاسی میں، لکھا کہ وہ ۲۱ اپریل کو یونیورسٹی واپس آئے اور شاعر اقبال کی سالگرہ کی تقریب منعقد کرنے کو کہا۔ تاہم، اقبال کی سالگرہ ۹ نومبر کو ہوتی ہے؛ ۲۱ اپریل کو برسی ہوتی ہے۔ محمود نے لکھا کہ شام کی تقریب میں چار آرمی افسران شریک ہوئے۔ (محمود، مشمولہ حیدر، (مدیر) (۱۹۹۶ء) ص: ۸۹ تا ۹۲)۔

۲۱۔ اس افسر کی فیملی شمال مغربی سرحدی صوبے میں واقع پشاور سے تھی۔ ہوسکتا ہے یہ محمد عبدالستار کی یادداشت ہو، یہ بنگالی دیہاتی تھا جو تھانہ پاڑا میں گولی لگنے پر بھی بچ گیا، اس نے بیان دیا کہ دوسری آرمی یونٹ جو ''پٹھان'' یونٹ تھی۔ ''مکتار پور کیڈٹ کالج'' کے قریب دریا کے کنارے کی طرف گئی مگر وہاں کسی کو نہیں مارا۔ نہ ہی ۱۸ پنجاب اور ۳۲ پنجاب کے افسران جنہوں نے مجھ سے بات کی ''مکتار پور کیڈٹ کالج'' کا نام پہچانتے تھے، اگرچہ وہ تمام ساردا پولیس اکیڈمی کو جانتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے ''راج شاہی کیڈٹ کالج'' کا نام پہچانا۔

۲۲۔ اس رجمنٹ کی ''ڈی کمپنی'' ۲۵ ــ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہونے والی کارروائی میں شامل رہی

تھی۔

۲۳۔ مشرقی پاکستان کے بنگالی قوم پرستوں کی جانب سے دشمنوں اور اتحادیوں کی ''Ethnicisation'' کے لیے دیکھیے باب نمبر ۹۔

۲۴۔ ۱۸ پنجاب کے ایک افسر نے مجھے بتایا کہ جب وہ بالآخر گھر پہنچا تو اس کے والد نے بچ جانے کا مطالبہ کیا کہ رجمنٹ مشرقی پاکستان میں کیا کرتی رہی تھی۔ پاکستان آرمی کے وہ افسران جنہوں نے مجھ سے بات کی سوائے ایک کے سب نے یہی کہا کہ انہیں کبھی ایسے واقعے کا تجربہ نہیں ہوا کہ نہتے افراد کو گھیرا اور مار دیا گیا ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ۵۷ بریگیڈ کے اس وقت کے بریگیڈ کمانڈر جہاں زیب ارباب اور اس کے جز ۳۲ پنجاب اور ۱۸ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسرز لیفٹیننٹ کرنل تاج اور لیفٹیننٹ کرنل بشارت سب کو ۱۹۷۱ء کے دوران مغربی پاکستان واپس بھیج دیا گیا تھا۔ حمود الرحمان کمیشن کے مطابق ۱۸ پنجاب کے میجر مدد حسین شاہ، لیفٹیننٹ کرنل مظفر علی خان زاہد جو اس وقت ۳۱ فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر تھے اور لیفٹیننٹ کرنل طفیل جو اس وقت ۵۵ فیلڈ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر تھے، یہ سب لوٹ مار کے مرتکب قرار دیئے گئے۔ (ایچ آر سی رپورٹس، ص: ۵۰۵ تا ۵۰۶)۔ اس الزام کی کوئی عدالتی کارروائی یا مسئلے کے حل کا ذکر موجود نہیں۔

۲۵۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۱۰ تا ۱۱۔

۲۶۔ FRUS، جلد ۱۱، ص: ۳۵ تا ۳۶۔

۶۔ ہندوؤں کو ہراساں کرنا: اقلیتوں سے امتیازی سلوک کی سیاست

۱۔ بلڈ (۲۰۰۲ء) ص: ۲۱۶۔

۲۔ مصنف کا نیتائی گیان سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۳۔ مصنف کا چکنگر کے قتل عام کے عینی شاہدین اور بچ جانے والے افراد سے انٹرویوز، ضلع کھلنہ میں چک نگر اور دیہات ۲۰۰۴ — ۲۰۰۵ء۔

۴۔ اس مقصد کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایک ٹیم نے اشتراک کیا، جس نے چکنگر قتلِ عام کے بارے میں بنگالی میں ۲۰۰۰ء میں ایک کتاب شائع کی۔ اس میں ''مکتی جودھا کیمپ'' کے دوران ۲۰۰ افراد کے انٹرویوز میں سے ۹۰ افراد کے انٹرویو شامل ہیں۔ کتاب یہ دعویٰ کرتی ہے کہ فوجیوں کے ایک چھوٹے گروپ شاید صرف ایک پلاٹون نے، (جو غالباً ۳۰ افراد پر مشتمل ہوتی ہے) جو صرف اپنے ذاتی اور ہلکے ہتھیاروں سے لیس تھی چکنگر میں دس ہزار افراد کو قتل کر دیا تھا— غیر ذمہ داری سے کیا گیا ایک دعویٰ جو عقل یا کسی زمینی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھ سکتا (مامون، (مدیر) ۲۰۰۲ء)۔

۵۔ اس سال بعد میں آرمی نے ایک مددگار فورس بنائی جو مشرقی پاکستان کے مقامی افراد، بنگالی اور بہاری دونوں پر مشتمل تھی۔

۶۔ ''بہاری'' مشرقی پاکستان کے غیر بنگالی تھے ـــ مسلمان جو شمالی بھارت سے مشرقی پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔

۷۔ چک نگر کے تمام مسلمان رہائشی ہندو پناہ گزینوں کا استحصال کرنے والے نہ تھے یا ان کی تکالیف سے لاتعلق رہنے والے نہ تھے۔ چک نگر کی دو مسلمان خواتین کے اقدامات خصوصاً نمایاں ہیں۔ ایک مدُر (mat، چٹائی) پر بیٹھی تھی۔ جو نتائی گیان کے گرد لپیٹ دی گئی یوں وہ فوجیوں سے چھپ گیا۔ دوسری نے زخمی شائیلن جوار دار کو دریا کے کنارے سے بچایا اور اپنے گھر پر مکمل صحت یاب ہونے تک مرہم پٹی کی۔

۸۔ بلڈ (۲۰۰۲ء) ص: ۲۱۷۔

۹۔ بلڈ (۲۰۰۲ء) ص: ۲۱۶ تا ۲۱۷۔

۷۔ مارو اور دوڑ جاؤ: سبوتاژ اور سرزنش

۱۔ ساتھی براتا، ''Big brother goes to war'' ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کے *The Guardian* میں۔

۲۔ سنگھ (۱۹۸۱ء)، ص: ۶۰۔

۳۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۱۲۔

۴۔ "A flickering cause: East Pakistanis pledge to fight to the death but mostly they don't"۔ پیٹر کان، *Wall Street Journal* ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء۔

۵۔ *New York Times*، ۱۰ مئی ۱۹۷۱ء۔

۶۔ *Washington Post*، ۱۳ مئی ۱۹۷۱ء۔

۷۔ "An urge for self-destruction" ہاروے اسٹاک وِن۔ *Financial Times* ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء۔

۸۔ مصنف کا عبدالبرق علوی سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔ مزید دیکھیں علوی مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء) ص: ۱۶۳ تا ۱۶۶ اور علوی مشمولہ کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء) ص: ۸۷ تا ۹۳۔

۹۔ سارہ آرا محمود مشمولہ حیدر (مدیر)، *Smriti:* ۱۹۷۱ء، جلد ۱، ص: ۱۵۸ تا ۱۶۰۔

۱۰۔ یہ تمام کہانیاں ان افراد کی ہیں جو ڈھاکہ میں باغیانہ کارروائیوں کے شبہے میں گرفتار ہوئے۔ وہ سب مارشل لا کورٹ میں پیش کیے گئے اور آرمی نے چھاپوں کے دوران جن افراد کو پکڑا تھا ان کو زیر نگرانی رکھا۔ جو افراد ابتدائی تفتیش کے بعد غیر ملوث پائے گئے ان کو گھروں کو واپس بھیج دیا گیا۔ ان میں سے کئی فعال جنگجو کے طور پر شناخت کیے گئے اور دوبارہ کبھی نہیں دیکھے گئے، خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

۱۱۔ مسعود صادق ''چُلّو''، لنو باللہ، الطاف محمود کے رشتہ داروں میں سے تھے اور ناصر بختیار احمد، محمود کے پڑوسی تھے۔ دونوں نے تفتیشی مرکز کا ایک جیسا تجربہ ریکارڈ کرایا۔ ان کے ساتھی قیدیوں میں جیول، رومی، رومی کے والد شریف امام اور ان کا چھوٹا بھائی جامی، بدیع العالم (جس نے فرار کی کوشش کی)، ڈھاکہ ٹیلی وژن کے حافظ جیسے جنگجو اور دیگر افراد شامل تھے۔ دیکھیں کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء)۔ مزید دیکھیں جہاں آرا امام (۱۹۸۶ء)۔

۱۲۔ بنگالیوں کا بلوچیوں کے لیے تصور انسانیت مزید دیکھنے کے لیے باب ۹ دیکھیں۔

۱۳۔ دیگر کئی نظر بند افراد کا رمنا پولیس اسٹیشن میں اندراج ہوا اور رات کو گرفتار کیے گئے۔

۱۴۔ امام (۱۹۸۶ء)۔ کچھ بنگلا دیشیوں نے بعد میں رائے دی کہ اگرچہ خوبصورت لکھی گئی ہے مگر کتاب میں دی گئیں تمام تفصیلات لازمی طور پر درست نہیں۔

۱۵۔ یہ اس وجہ سے سامنے آیا کہ جیسا کہ علوی نے ذکر کیا وہ ایک رحم دل بوڑھا فوجی تھا جس نے انہیں ڈبل روٹی دی ایسا ہی اس نے جہاں آراء امام کی فون پر درخواست پر کیا۔ علوی نے اسے ''بلوچی'' قیاس کیا لیکن مسز امام نے لکھا کہ وہ ''بہاری'' تھا۔ تو ایک ہی آدمی کو مختلف بنگالی افراد نے بہاری اور بلوچی اور ظالم ترین اور مہربان ترین گردانا۔

۱۶۔ لیونارڈ گورڈن، *Bengal: the Nationalist Movement 1876-1940*، منوہر، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۵۶۔

۱۷۔ سنگھانیا مشمولہ حیدر، (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۳۱ تا ۱۳۲۔

۱۸۔ مصنف کا کرنل محمد شفیع سے انٹرویو، ۲۰۰۵ء۔

۱۹۔ محمد سفیک العالم چوہدری مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۳۳ تا ۱۳۷۔

۲۰۔ حکومتِ بنگلہ دیش، *History of Bangladesh War of Independence*، دستاویزات، جلد ۸، ص: ۵۱۱ تا ۵۱۲۔ یہ دستاویزات سرکاری اور غیر سرکاری دستاویزات جیسے چنیدہ اخباری مواد وغیرہ کا ملغوبہ ہیں۔ ناشر نے غیر سرکاری مواد کی تصدیق کی کوئی کوشش نہیں کی، جیسا کہ اس میں نہیں کی۔

۲۱۔ مصنف کا بریگیڈیئر (لیفٹیننٹ کرنل) امیر محمد خان سے انٹرویو، ۲۰۰۶ء۔

۲۲۔ مصنف کا محمد علی اکبر اور جوئے نال عابدین سے انٹرویو اور دیگر کئی دیہاتیوں سے بات چیت، بوروئی ٹولا، ۲۰۰۴ء۔ میموریل (یادگار) جدید مجسمہ سازی میں ایک غیر معین مجسمہ ہوتا ہے جو شاعری وغیرہ پر مبنی ایک تختی (plaque) اٹھایا ہوتا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک شخص اس کے سائے میں آرام سے سو رہا تھا۔

۲۳۔ جوئے نال عابدین کی چھوٹی بیٹی گھر کی طرف بھاگی اور ایک کتاب ''کشور گنج کے شہداء کے بارے'' میں لے کر آئی۔ یہ کتاب ۱۹۷۱ء میں مقامی طور پر شائع ہوئی تھی۔ اس میں علاقے کے ۱۵۴ افراد کے نام ہیں جو اسی سال مر گئے تھے۔ ابتدائی طور پر ایسا لگتا ہے کہ یہ بالکل اس قسم کی دستاویزات میں سے ہے جس کی بنگلہ دیش کو سخت ضرورت ہے۔ تاہم ہجوم میں سے ایک نوجوان نے کہا کہ کتاب میں بہت غلطیاں ہیں اس میں کچھ ایسے افراد کو بھی مرنے والے کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے جو اب بھی زندہ ہیں! دوسرے لوگ بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ کتاب میں اس قسم کی غلطیاں ہیں۔ (دوسری طرف ممکنہ طور پر فہرست میں جنگ کے اصل متاثرین کو شامل نہیں کیا گیا)۔ جس نوجوان نے کہا تھا کہ مرنے والوں کی فہرست میں زندہ افراد کے نام بھی شامل ہیں، بعد میں اس نے انکشاف کیا کہ مولانا حفیظ — جو اپنے دیہاتیوں کو وہاں سے لے گئے تھے۔ اس کے دادا تھے۔ اس نے اپنے دادا کا دفاع کیا اور ایک دوسرا خیال پیش کیا: اس نے کہا کہ جو رضا کار وہاں آئے اور ملٹری سے بات کی ان کی اردو اتنی اچھی نہ تھی وہ کہہ رہے تھے کہ ان کا بھائی بیمار اور زخمی ہے۔ ملٹری نے غلطی

سے یہ سمجھا کہ ان کا اپنا آدمی گاؤں میں قتل ہوگیا ہے یہی وجہ تھی کہ وہ غصے اور انتقام سے پاگل ہوگئے اور سب کو گولی مار کر ہلاک کردیا۔ یہ سازشی امکان پیش کیا گیا کہ اسی وجہ سے بہت سے شہری قطار میں کھڑے کرکے مار دیئے گئے۔ کیونکہ بے شک فوجی اور عوامی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔

۲۴۔ متعدد بنگالی عینی شاہدین نے یکم دسمبر ۱۹۷۱ء کو نیشنل جوٹ مل، گھوراسال نزد نرسنگدی میں ہونے والے قتل عام کے بارے میں وضاحتی بیان دیا۔ مثال کے طور پر دیکھیں حیدر (مدیر)، Smriti 1971 سیریز۔

۲۵۔ مصنف کا ایس ایم رقیب علی سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۶۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رقیب علی کہتا ہے ''وہاں پر پہلا فرمان علی اور اگلا اے کے نیازی تھا۔'' یہ طرز دونوں وجوہات کے باعث ہوسکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جنرل نیازی مشرقی پاکستان بعد میں آیا، اور بنگالیوں کے اس خیال کے باعث کہ فرمان علی زیادہ طاقت ور ہے۔

۲۷۔ اس کے علاوہ دیکھیں حیات (۱۹۹۸ء)، کھلنہ میں لڑائی کے بارے میں پاکستانی بریگیڈ کمانڈر کا بیان۔

۲۸۔ مصنف کا کبیر میا سے انٹرویو، ۲۰۰۴ء۔

۲۹۔ سنگھ (۱۹۸۰ء)، ص: ۳۰ تا ۳۷۔

۳۰۔ سنگھ (۱۹۸۱ء)، ص: ۵۰ تا ۶۴۔

۳۱۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۱۲۔

۳۲۔ جیکب (۲۰۰۱ء)، ص: ۹۰ تا ۹۴۔

۳۳۔ سنگھ (۱۹۸۱ء)، ص: ۲۸۸۔

۳۴۔ ساتھی براٹا ''Big brother goes to war''، ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کے *The Guardian* میں چھپا۔ یہ ایک منفرد حیرت انگیز بیان ہے۔ مصنف بنگالیوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرسکتا تھا اور بغیر پہچانے مشرقی پاکستان میں اندر تک سفر کیا لیکن بھارتی میڈیا میں کام کرنے والے صحافیوں کو کوئی مشکلات نہ تھیں۔ گارجین نے اپنی رپورٹ اس رائے کے ساتھ شائع کی کہ ''اگر وہ یہ رپورٹ بھارت سے بھیجتے تو گرفتار ہوچکے ہوتے۔''

۸۔ برادر کشی: جنگ کے اختتام پر ڈیتھ اسکواڈ

۱۔ مصنف کا شیامولی نسرین چودھری سے انٹرویو، ان کی بیٹی فرزانہ چودھری نیپا اور ان کے دیور (بہنوئی) حافظ چودھری، جو بعد ازاں ان کے دوسرے شوہر بنے موجود تھے۔ مزید دیکھیں چودھری مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۳ء) ص: ۱۹۴ تا ۱۹۹ اور چودھری مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۲۳۳ تا ۲۳۷۔

۲۔ نیازی (۱۹۹۸ء)، ص ۷۸ تا ۷۹۔

۳۔ اطراف سے لپیٹ لیا جانے والا لباس جو مشرقی بنگالی آدمی پہنتے ہیں۔

۴۔ *The Shaheed buddhijeebi koshgrantha*، راشد حیدر (مدیر) (بنگلہ اکیڈمی، ۱۹۹۴ء)، فہرست میں

۲۴ بدھی جی بی ہیں۔ جو پیشہ ور اور عاقل ہیں۔ یہ سب دسمبر کے دوسرے ہفتے میں البدر کے ہاتھوں اغوا ہوئے اور بعد میں مردہ پائے گئے یا "غائب" کردیئے گئے۔ وہ یہ تھے: اے این ایم غلام مصطفیٰ، صحافی (۱۲ دسمبر)؛ انور پاشا، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ عبدالرؤف سردار، معیشت داں (۸ دسمبر)؛ علیم چودھری، ڈاکٹر (۱۵ دسمبر)؛ عبدالکلام آزاد، پروفیسر (۱۵ دسمبر)؛ ابوالخیر، پروفیسر (۱۰ دسمبر)؛ اے کے ایم صدیق، وکیل (۱۴ دسمبر)؛ ایم اے ایم فیض الحی، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ غیاث الدین احمد، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ نظام الدین احمد، صحافی (۱۲ دسمبر)؛ محمد اختر، لکھاری (۱۴ دسمبر)؛ منیر چودھری، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ محمد امین الدین، سائنس داں (۱۴ دسمبر)؛ مفضل حیدر چودھری، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ فضلِ ربی، ماہر امراضِ قلب (۱۵ دسمبر)؛ محمد مرتضیٰ، ڈاکٹر (۱۴ دسمبر)؛ راشد الحسن، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ شاہد اللہ کیسر، صحافی (۱۴ دسمبر)؛ سنتوش بھٹا چاریہ، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ سراج الحق خان، پروفیسر (۱۴ دسمبر)؛ سراج الدین حسین، صحافی (۱۰ دسمبر)؛ سید نجم الحق، صحافی (۱۱ دسمبر)؛ سلینا پروین؛ لکھاری (۱۴ دسمبر)؛ رفیق الحیدر چودھری، لکھاری (۱۳ دسمبر)۔

۵۔ ایچ آر سی رپورٹ، ص: ۵۱۱ تا ۵۱۲۔

۶۔ دیگر متاثرین کے اہلِ خانہ نے بھی ایسی ہی یادداشتیں لکھیں جیسے مسز شیا مولی نسرین چودھری نے لکھیں۔ دیکھیں *Smriti' 71* سیریز، راشد حیدر (مدیر)، جلد ۱ تا ۱۳۔ بلکہ کچھ افراد نے تو ایک بنگالی آدمی کو شناخت بھی کرلیا جس کو نوجوانوں نے نشانے کے طور پر تاک لیا تھا۔ وہ ۱۹۹۴ء میں چینل فور کے دستاویزی پروگرام "وار کرائم فائلز" میں برطانیہ میں بلا کھٹکے رہنے والا دکھایا گیا ہے۔ صرف ڈاکٹر فضل ربی کی اہلیہ جہاں آراء ہی ان میں ایسی تھیں جنہوں نے پاکستان آرمی کے ساتھ تعلق بنایا۔ وہ دعویٰ کرتی ہیں کہ انہوں نے ایک کرنل سے ۱۵ دسمبر کو بات کی (کئی نے اس کا نام مارشل لاء کورٹ کے تفتیشی مرکز کے سربراہ کے طور پر لیا) اور اس نے ڈاکٹر ربی، ڈاکٹر چودھری، اور یونیورسٹی کے بیس (۲۰) پروفیسرز کو اٹھانے کا اعتراف کیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے اسی افسر سے ۱۶ دسمبر کی صبح دوبارہ بات کی تو اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا کہ قیدیوں کے ساتھ کیا ہوا (جہاں آراء ربی مشمولہ حیدر (مدیر)، *Smriti* ۱۹۷۱ء، جلد ۲ (۱۹۸۹ء))۔ میں نے مسز ربی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر اس نے کہا کہ وہ مرچکی ہیں۔ دیگر کسی خاندان نے کسی پاکستانی افسر کا ذکر نہیں کیا۔

۷۔ دلاور حسین کی یادداشتیں مطبوعہ *Dainik Bangla*، ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء۔ دوبارہ اشاعت مشمولہ *Ekattorer ghatok-dalalera ke kothay* (*Muktijuddha Chetona Bikash Kendro*, 1989) بشکریہ لبریشن وار میوزیم، ڈھاکہ۔ دلاور حسین اس کے علاوہ اوپر بیان کیے گئے دستاویزی پروگرام میں بھی دکھائی دیئے۔

۸۔ میں نے مولانا منان سے ملاقات کی درخواست کی تاکہ ان کی کہانی اور واقعات بھی مل سکیں۔ لیکن ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ قوت گویائی سے محروم ہوگئے۔ چند ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

۹۔ حیدر، (مدیر) *Shahid buddhijeebi koshgrantha* (بنگلہ اکیڈمی، ۱۹۸۵ء، ۱۹۹۴ء) فہرست دی گئی ہے جس میں ان ۲۴ پیشہ ور کے نام ہیں جنہیں رایر بازار اور دیگر نامعلوم مقامات سے دسمبر میں اٹھایا اور قتل کردیا

گیا۔ اگر دلاور حسین نے وہاں ۱۳۰ سے ۱۴۰ افراد دیکھے تو یہ غیر واضح ہے کہ باقی افراد کون تھے۔

۱۰۔ جہاں آراء ربی مشمولہ حیدر (مدیر) *Smriti 1971* (۱۹۸۹ء)، جلد ۲، ص: ۲۶۔

۱۱۔ میں نے رایر بازار کی ہلاکتوں میں ازروئے دعویٰ بچ جانے والے افراد ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ دلاور حسین نے مجھے ایک ایسے نوجوان سے متعارف کرایا جس نے ''دستاویزی'' ٹیم کی مدد کی تھی، اس کو مسٹر حسین نے تلاش کیا تھا۔ اس کا والد بھی گزشتہ برس جنگ کے آخری دنوں میں ''غائب'' ہوگیا تھا اور اس کی لاش تک نہ ملی۔ اس موقع پر وہ حسین کو تلاش کرنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم اس نے ایک گروپ سے ملایا جس نے پرجوش بیان دیا جو دلاور حسین نے بظاہر کہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے دلاور حسین کے دیکھے ہوئے ۸۰۰ سے ۹۰۰ قیدیوں کا حوالہ بھی دیا۔ اور کہا کہ حسین نے انہیں فرار کرنے میں بہت مدد دی جبکہ قاتل اس وقت ایک قیدی عورت سے اجتماعی زیادتی میں مصروف تھے۔ اس کے بعد جلد ہی میں نے دلاور حسین کا مطبوعہ بیان پڑھا جس کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے۔ اس سے رایر بازار میں قیدیوں کی تعداد کا اندازہ ۱۳۰ سے ۱۴۰ بنتا ہے جو زیادہ قرین قیاس تعداد ہے۔ اور بیان کیا کہ جس وقت حسین فرار ہوئے قیدی ان کے سامنے ہی ہلاک کیے جارہے تھے۔ دسمبر کی ہلاکتوں کے ایک متاثرہ شخص کے بیٹے کے طور پر نوجوان کو متاثرین سے ہمدردی ہے۔ لیکن اس سے انہیں اعداد وشمار واقعات کے بارے غلط بیانی کرنے کا لائسنس نہیں مل جاتا۔ جو حقیقت میں ہوا کافی خوفناک تھا۔ تمام غیر ذمہ دار حاشیہ آرائی کرنے والوں کی وجہ سے دستاویز سازی (Documentation) میں رکاوٹ پڑی اور بنگلہ دیشی مبصرین کی ساکھ خراب ہوئی۔

۱۲۔ جیسا کہ اس کتاب میں کئی مقامات پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مخالفین پر تشدد میں لڑائی میں شامل تمام گروپ ملوث تھے۔ وحشی پن اور قتل میں وہ سب ملوث تھے جو آزادی اور جمہوریت کے نام پر لڑ رہے تھے۔ ایک پریشان کن اور اب تک نہ دریافت ہونے والا سوال یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ان بچوں پر کیا اثرات پڑے جنہیں گرفتار کیا گیا تھا۔ بچے صرف وحشی پن کے شکار اور گواہ نہ تھے بلکہ اس کے فعال حصہ دار بھی تھے۔ نوخیز لڑکے خصوصاً ''آزادی'' کے لیے ''لڑاکا بچوں'' کے طور پر متاثر ہوئے۔ ایک سابقہ مکتی جودھا نے مجھے بتایا کہ ان کے درمیان ۱۲ سے ۱۴ برس کی عمر کا ایک لڑکا تھا جو مغربی پاکستانی قیدیوں پر تشدد کرنے میں ماہر تھا۔ وہ ان کے پورے جسم پر بلیڈ سے گھاؤ لگا کر نمک مرچ کا آمیزہ لگاتا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ آزاد بنگلہ دیش میں ایسے بچوں کے ساتھ کیا ہوا اور نوخیز ذہنوں میں وحشی پن کے معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔

۱۳۔ "Indian Army arrests 'Tiger of Tangail' after Dacca bayonetings" ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء کے *The Times* میں چھپا۔

۱۴۔ صدیقی (۱۹۸۵ء، ۱۹۹۷ء)، جلد ۲، ص: ۲۹۹ تا ۳۰۵۔

۱۵۔ حسین (۱۹۹۵ء)، باب ۱۔

۱۶۔ اس کے علاوہ دیکھیں پنا کیسر اور شاہد احمد کیسر کے بارے میں، مشمولہ حیدر (مدیر)، *Smriti 1971*، جلد ۱ (۱۹۸۸ء)، ص: ۸۹ تا ۹۳، اور زکریا حبیب اور ظاہر ریحان کے بارے میں، مشمولہ جلد ۲، ص: ۴۵ تا ۵۱۔

۱۷۔ مصنف کے بنگالی جوٹ مل کے ورکرز اور بہاری رہائشیوں سے انٹرویوز، کھلنا، ۲۰۰۴۔ مزید دیکھیں باب ۴۔

۹۔ الفاظ و تعداد: یادیں اور دل دہلا دینے والے قصے

۱۔ سیکریٹری آف اسٹیٹ ولیم راجرز اور پریذیڈنٹس اسسٹنٹ فور نیشنل سیکورٹی افیئرز ہنری کسنجر کے مابین مشرقی پاکستان کے بحران پر ٹیلی فون پر گفتگو۔ ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء (FRUS، جلد ۱۱، ص: ۴۵ تا ۴۸)۔

۲۔ سرب اور کروٹس کے مابین ۱۹۹۰ء کی دہائی میں نفرت اور نسلی قتل عام کے فروغ کا حوالہ ہے۔ (اگناٹیف (۱۹۹۴ء)، ص: ۱۴ تا ۱۵)۔

۳۔ سبودھی خان، جنگ اور محصول کے وزیر اور ان کے بیٹے ایشان خان ایک ہی پوسٹ پر تھے۔ اور ایشان کا بیٹا پرندار خان ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی میں بنگال کے سلطان کا وزیر خزانہ اور نیول کمانڈر تھا۔ دیکھیں سبھاش چندر بوس کی ادھوری خودنوشت سوانح حیات *An Indian Pilgrim* اور ضمیمے مشمولہ *Netaji Collected Works*، جلد ۱، نیتا جی ریسرچ بیورو، کلکتہ، ۱۹۸۰ء۔ سرت چندر بوس کے قریبی دوست اور بھارت کی تحریک آزادی کے صلاح کار ناراجول کے کمار دیبیندرالال خان تھے۔

۴۔ بنگالی میں ''شالا'' (یا ہندی میں ''سالا'') کا لغوی مطلب ہے برادر اِن لا (بیوی کا بھائی)۔

۵۔ *The Times*، لندن، ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء۔

۶۔ مشرقی پاکستان کے جن بنگالیوں نے ۱۹۷۱ء میں (پاکستان سے) یکسر علیحدگی کی حمایت نہیں کی تھی اکثر و بیشتر ان کا نقطۂ نظر اور تجربات اُس سال کی کشمکش پر لکھی جانے والی کتابوں اور تحریروں میں نہیں پائے جاتے۔ یہ بات حیرت انگیز بھی نہیں ہے، کیونکہ اس طبقے کو ایک آزاد بنگلہ دیش جیسی حقیقت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور نئی قومی ریاست کے قیام کی کوششوں سے الگ تھلگ رہنے کا انہیں مرتکب گردانا جاتا تو یہ بات ان کے لیے صریح خطرہ نہیں تو کم از کم پریشان کن ضرور ہوتی۔

۷۔ اس واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے، شرمیلا بوس ''The Truth about the Jessore massacre'' ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء کے *The Telegraph* میں۔

۸۔ مشرقی پاکستان میں عسکری ہوا بازی میں شریک ہیلی کاپٹر اڑانے والے لیفٹیننٹ جنرل (کیپٹن) علی قلی خان نے مجھے بتایا کہ بم لے جانے یا گرانے میں پاکستانی ہیلی کاپٹر استعمال نہیں کیے گئے تھے۔ دسمبر کے دوران بھارت کے دہرے انجن اور پروپیلر والے طیارے ہر رات آ کر بم گرا جاتے تھے، پُرشور ہونے کے باوجود انہیں کسی طرح کا خطرہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ پاکستان کی طیارہ شکن توپوں کی زد سے باہر ہوتے تھے۔ (لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان کے ساتھ مصنف کا ۲۰۰۵ء میں انٹرویو)۔ ۱۲ دسمبر کو *The Observer* میں اشاعت پذیر 'ڈھاکہ ڈائری' میں، جو گیون ینگ نے جمعہ ۱۰ دسمبر کو تحریر کی، بتایا گیا: 'پروپیلر والے بھارتی طیارے بھاری بم گراتے ہیں'۔ کسی ہیلی کاپٹر سے بم گرائے جانے کا صرف ایک واقعہ میرے علم میں آیا اور وہ بم بنگلہ دیش کی

طرف سے گرایا گیا تھا: بدرالعالم پاک فضائیہ میں تھا، منحرف ہو کر بنگلہ دیشی کاز کا حامی بن جانے کے بعد وہ مکتی باہنی کی فضائی قوت میں شامل ہو گیا تھا۔ ان کے پاس صرف چند پرانے طیارے اور ایک ہیلی کاپٹر تھا، لگتا ہے بھارت نے انہیں کچھ زیادہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ تاہم عالم کا کہنا تھا کہ دسمبر میں بھرپور جنگ کے دوران انہوں نے علامتی حملے کیے: اس نے بتایا کہ اس نے ہیلی کاپٹر پر جیسے تیسے بم رکھے اور لے جا کر نرسنگدی (Narsingdi) میں (ڈھاکہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک مقام) پاک فوج پر گرائے۔ جنگ آزادی میں حصہ لینے پر بنگلہ دیش نے عالم کو اعزاز سے نوازا۔ (۲۰۰۴ء میں مصنف کی بدرالعالم سے گفتگو)۔

۹۔ ایک پاکستانی افسر نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایسے گاؤں سے گزرا جہاں صرف بوڑھے افراد تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیوں تو کوئی نہیں بولا۔ جب ایک بچہ چلایا تو جھاڑیوں میں چھپا ہوا پورا گاؤں ملا۔ انہوں نے کہا کہ ان سے کہا گیا کہ آرمی نے مردوں کو مار دیا، عورتوں سے زیادتی کی اور بچوں کو کھا لیا۔

۱۰۔ گیون ینگ کی 'ڈھاکہ ڈائری' *The Observer*، ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء۔ یہ حکومت بنگلہ دیش کی دستاویزات میں بھی شائع ہوئی، جلد ۱۴، ص: ۴۲۵ تا ۴۲۶۔ ینگ نے یہ بھی بیان کیا کہ اس نے سات سے نو بھارتی طیاروں کو مار گرائے جانے کا منظر دیکھا۔ جنرل چک ییگر (Yeager)، وہ شخص جس نے ساؤنڈ بیریئر توڑنے کا کارنامہ انجام دیا تھا، ۱۹۷۱ء میں اسلام آباد میں امریکی محکمہ دفاع کے نمائندے طور پر تعینات تھا۔ اس نے اپنی خودنوشت سوانح میں پاکستانی پائلٹوں کی تعریف کی: 'وہ واقعی بہت عمدہ پائلٹ تھے، جنگجویانہ لڑائی کے ماہر، اور توپخانے اور فضائی حملے کی چالوں میں پختہ۔ میں ان سے بے حد متاثر ہوا' اس نے یہ بھی لکھا کہ فضائی جنگ میں پاکستان نے بھارت سے بہتر کارکردگی دکھائی: 'پاکستانیوں نے فضا میں ان کی خوب ٹھکائی کی تاہم زمینی لڑائی میں معاملہ الٹ تھا... بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا طیاروں کا نقصان ایک تہائی تھا، پاکستان نے بھارت کے روسی ساختہ ۱۰۲ جیٹ طیارے مار گرائے جبکہ اسے ۳۴ طیاروں کا نقصان ہوا۔ میں یہ اعداد و شمار پورے یقین سے دے رہا ہوں کیونکہ میں دن میں کئی کئی بار ہیلی کاپٹر میں جاتا تھا اور زمین پر پڑے ملبہ نما طیاروں کی گنتی کرتا تھا۔ میں نے پاکستانی علاقے میں پڑے ملبہ نما طیاروں کی گنتی کی، انہیں ترتیب وار درج کیا، پرزوں کو شناخت کیا'... جن بھارتی طیاروں کو مار گرایا گیا تھا اس نے ان طیاروں کے پائلٹوں سے سوال جواب بھی کیے... 'انہیں یقین نہ آتا تھا کہ میں پاکستان میں ہوں اور انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں وہاں کیا کر رہا ہوں'۔ جنرل ییگر نے لکھا کہ بھارت نے اسلام آباد ایئرپورٹ پر کھڑے اُس کے 'بیچ کوئن ایئر' (Beech Queen Air) پر بمباری کی، حالانکہ اس طیارے پر امریکی فوج کی مخصوص علامات تھیں اور دُم پر بڑا سا امریکی پرچم بنا ہوا تھا۔ 'یہ انکل سام کو چھیڑنے کا ایک بھارتی انداز تھا' (جنرل چک ییگر اور لیو جانوس، *Yeager: An Autobiography*، بینٹم بکس، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۱۱ تا ۳۱۲)۔ یہ بات دلچسپ ہے، کیونکہ جنگ میں پاک فضائیہ کے کردار کے حوالے سے کچھ تنازع موجود تھا۔ فضائی لڑائی سے متعلق بحث سے اس کتاب کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۱۔ *The Times*، ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء، مطبوعہ حکومت بنگلہ دیش، دستاویزات، جلد ۱۴، ص: ۴۳۶۔

۱۲۔ *The Ohserver*، ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء، مطبوعہ حکومتِ بنگلہ دیش، دستاویزات، جلد ۱۴، ص: ۴۲۵۔

۱۳۔ امام (۱۹۸۶ء)، ص: ۲۶۳ تا ۲۶۵۔

۱۴۔ دیکھیں باب ۵۔

۱۵۔ دیکھیں باب ۵۔

۱۶۔ دیکھیں باب ۷۔

۱۷۔ سین گپتا مشمولہ حیدر (مدیر) (۱۹۹۶ء)، ص: ۱۲۲ تا ۱۲۳۔ مصنف نے بنگالی سے ترجمہ کیا۔

۱۸۔ پراتیتی دیوی مشمولہ کبیر (مدیر) (۱۹۹۹ء)، ص: ۱۰۱ تا ۱۰۲۔ مصنف نے بنگالی سے ترجمہ کیا۔

۱۹۔ دیکھیں باب ۴۔

۲۰۔ جدول ۲، سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۳۲۔

۲۱۔ ساتھی براٹا (Sasthi Brata) "Big brother goes to war" ۱۸ ستمبر ۱۹۷۱ء کے *The Guardian* میں شائع ہوا۔ اگر مستقبل میں ایسی تحقیق کی جائے جس میں بنگلہ دیشیوں کی طرف سے سنائے گئے واقعات کا موازنہ ایسی کارروائیوں میں حصہ لینے والے بھارتیوں کے حلفی بیانات سے کیا جائے، نیز بھارتی دستاویزاتی مواد سے بھی مدد لی جائے تو یہ تحقیق نہایت دلچسپ ہوگی، بشرطیکہ بھارت اسکالروں، اور ایسی کارروائیوں میں مبینہ طور پر شریک ہونے والے اور زبان کھولنے والے بھارتی مسلح افواج اور خفیہ اداروں کے اہلکاروں تک دستاویزاتی رسائی کی اجازت دے دے۔

۲۲۔ نیازی (۲۰۰۲ء)، ص: ۱۱۸۔

۲۳۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۰۶ تا ۲۱۴۔

۲۴۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۱۴۔

۲۵۔ قریشی (۲۰۰۳ء)، ص: ۲۷۶؛ متھا (۲۰۰۳ء)، ص: ۳۳۹۔ وائٹ ہاؤس میں ۲۶ مارچ کو ہونے والی ایک میٹنگ میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر رچرڈ ہیلمز نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے ۲۰،۰۰۰ (بیس ہزار) فوجی ہیں۔ (FRUS، جلد ۱۱، ص: ۲۵)۔

۲۶۔ نیازی (۲۰۰۲ء)، ص: ۵۲۔

۲۷۔ نیازی (۲۰۰۲ء)، ص: ۲۳۷۔

۲۸۔ دیکھیے ابواب ۴ اور ۵۔ بھارت کی حراست سے فرار ہو جانے والے پاکستان جنگی قیدیوں کی تعداد پُر اسرار تاہم نامعلوم ہے۔ خیال ہے کہ ایسے مفرور جنگی قیدی تھوڑے ہی ہوں گے، لیکن اپنے جانی دشمن کی قید سے نکل بھاگنے والوں نے وہ کارنامہ انجام دیا جسے مغرب میں The Great Escape جیسے بلند پایہ کارنامے کا مقام دیا جاسکتا ہے۔ میجر جنرل ایچ اے قریشی نے اپنے فرار کی داستان میں سرنگ کھودنے جیسی ان کوششوں کا ذکر تحریر کیا ہے جو ہالی وڈ کی فلم میں دکھائی جاتی ہیں (قریشی (۲۰۰۳ء))۔ ۱۵ فرنٹیئر فورس کے کیپٹن شجاعت لطیف نے ایسی چلتی ٹرین سے اپنے فرار کی مسحور کن کہانی مجھے سنائی جو گڑبڑ کرنے والے جنگی قیدیوں کو آگرہ سے

رانچی لے جارہی تھی، جبکہ اتنی ہی تعداد میں قیدی وہاں سے آگرہ لائے جارہے تھے (انہیں بعد میں دوبارہ پکڑ لیا گیا)۔ پاکستان کے جنگی قیدیوں کے بقول کیپٹن شجاعت لطیف کے فرار کا بدلہ لینے کے لیے بھارتی گارڈز نے ایک افسر قیدی میجر نصیب اللہ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہ ایک سنگین الزام ہے، متعلقہ حکام کو جس کی تحقیقات کرنی چاہیے۔

۲۹۔ *The Times*، ۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء۔

۳۰۔ چودھری (۱۹۹۶ء) نے اس دور کے بنگلہ دیشی اخبارات اور سرکاری گزٹ نوٹسوں کا حوالہ دیا۔ چودھری نے ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس عبدالرحیم کی سربراہی میں ایک بارہ رکنی تحقیقاتی کمیٹی کا بھی نام لیا۔ بتایا جاتا ہے کہ تحقیقاتی کمیٹی کو اپنی رپورٹ ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء تک جمع کرا دینے کی ہدایت کی گئی تھی۔ چودھری کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قبل ازیں شیخ مجیب نے اپنے پارٹی کارکنوں اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو ہدایت کی تھی کہ متاثرین کے اعداد و شمار کے حوالے سے رپورٹیں جمع کرائیں اور یہ کہ ہلاک شدگان کے اہلخانہ کے لیے تلافی یا معاوضے کی اسکیموں کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ چودھری کے مطابق تحقیقاتی کمیٹی اور معاوضے کی کمیٹی دونوں سے ۱۹۷۱ء کی جنگ سے مرنے والوں کی مجموعی تعداد لگ بھگ پچاس ہزار معلوم ہوئی۔ یہ مرنے والوں کی مجموعی تعداد ہے جس میں جنگ کے تمام فریقوں کے لوگ، مرنے والے پناہ گزین اور وہ جھوٹے دعوے بھی شامل ہیں جن کا کبھی سراغ نہ لگا۔ میں نے سرکاری تحقیقاتی کمیٹی کی معلومات اور اس کی رپورٹ کے حصول کی درخواست کی تھی لیکن میں ان معلومات کی غیر جانبدارانہ تصدیق حاصل نہیں کرسکی۔

۳۱۔ جہاں (۱۹۷۲ء)، ص: ۲۰۳ تا ۲۰۴۔

۳۲۔ پاور (بیسک بکس، ۲۰۰۲ء)، ص: ۸۲۔ پاور کی کتابیات میں بنگلہ دیش سے متعلق واحد کتاب لارنس لفشلز (Lifschultz) کی *Bangladesh: The Unfinished Revolution* (زیڈ پریس، ۱۹۷۹ء) ہے جو ۱۹۷۱ء کے بجائے ۱۹۷۵ء کے واقعات کے بارے میں ہے۔ ۱۹۷۵ء کی بغاوتوں پر لفشلز کی کتاب کے تجزیے میں Sisson اور Rose کا کہنا تھا، '... ہم نے بنگلہ دیش پر کارنیگی فائلوں کا بغور مطالعہ کیا جو لفشلز کی تخیلاتی سازشی تھیوریز میں سے کسی تھیوری کی تصدیق نہیں کرتیں، بلکہ کئی مقامات پر اس نے انٹرویو دینے والوں کے تبصروں میں سے پسند کے جملوں، یا ادھوری بات کو لے کر ان کا نقطہ نظر توڑ موڑ کر پیش کیا'۔ سیزن اینڈ روز ۱۹۹۰ء، ص: ۳۰۲۔

۳۳۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۲۱۷۔

۳۴۔ *The Guardian*، ۶ جون ۱۹۷۱ء۔

۳۵۔ ایچ آر سی، ص: ۵۱۳، حمود الرحمان جو سہ رکنی کمیشن کے سربراہ تھے، بنگالی تھے۔

۳۶۔ ایچ آر سی، ص: ۵۱۳۔

۳۷۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء) ص: ۳۰۶۔

۳۸۔ سیزن اینڈ روز (۱۹۹۰ء)، ص: ۳۰۶۔

۳۹۔ جیکب (۲۰۰۱ء)،ص: ۱۵۷ تا ۱۵۸۔

۴۰۔ نیازی (۲۰۰۲ء)،ص: ۱۱۸۔

۴۱۔ قرطاس ابیض (۱۹۷۱ء)،ص: ۴۱۔

۴۲۔ مائیکل لارینٹ، *The Times*، ۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا کہ ''تقریباً ۷۰۰۰ پاکستانی دو روزہ لڑائی میں صرف ڈھاکہ میں مارے گئے۔''

منتخب کتابیات

Alam, Mahboob, *Guerrilla theke sammukh juddhey*, vol. 2, Sahitya Prakash, Dhaka, 1993.

Aziz, Qutubuddin, *Blood and Tears*, Karachi, 1974.

Bangladesh Government, Ministry of Information, *History of the War of Independence: documents*, vol. 1–15.

Baxter, Craig, *Diaries of Field Marshal Mohammad Ayub Khan 1966–1972*, Oxford University Press, 2007.

Blood, Archer, *The Cruel Birth of Bangladesh: Memoirs of an American Diplomat*, The University Press Limited, Dhaka, 2002.

Bose, Sarmila, 'Anatomy of Violence: Analysis of Civil War in East Pakistan in 1971', *Economic and Political Weekly* (Mumbai), vol. 40, No. 41, 8–14 Oct. 2005.

———, 'Losing the Victims: Problems of Using Women as Weapons in Recounting the Bangladesh War', *Economic and Political Weekly* (Mumbai), vol. 42, No. 38, 22–28 Sept. 2007.

———, 'Three Turbulent Years: Re-appraisal of the Yahya Khan Regime', in Long, ed., *History of Pakistan*, Oxford University Press (forthcoming).

Chaudhuri, Nirad C., 'Elections in Pakistan', *Hindustan Standard*, 31 December 1970

———, 'Judgement on the Bengali personality', *Hindustan Standard* (8 August 1971), 'Late reflexions on the Indo-Soviet treaty of friendship' (23 August 1971), 'Northern Ireland as 'Bangladesh'' (28 August 1971), 'The Contemporary Bengali mind' (19 September 1971), 'Maine on Bengalis: defence and warning' (19 October 1971), 'Neither magnificent, nor war' (5 December 1971).

Choudhury, G.W., *Last Days of United Pakistan*, C. Hurst and Company, London; Indiana University Press, Bloomington, 1974.

Chowdhury, M. Abdul Mu'min, *Behind the Myth of 3 Million*, Al-Hilal Publishers Ltd, London, 1996.

Cohen, Stephen P., *The Idea of Pakistan*, Brookings Institution Press, Washington, 2004.

———, *The Pakistan Army*, Oxford University Press, 2002.

Guhathakurta, Basanti, *Ekattorer Smriti*, University Press, Dhaka, 2000.

Haider, Rashid, (ed.), *Smriti: 1971*, Bangla Academy, Dhaka, vol. 1–13, 1988–2000.

———, *1971: Bhayabaha Abhignata*, Sahitya Prakash, Dhaka, 1989.
———, *Shaheed Buddhijeebi Koshgrantha*, Bangla Academy, Dhaka, 1985.
Hamoodur Rehman Commission, *Report of Inquiry into the 1971 War*, Vanguard Books, Lahore.
Hasan, Moidul, *Mooldhara '71*, University Press, Dhaka, 1986.
Hayat, Brigadier Muhammad, 'The Battle of Khulna', *Defence Journal* (Karachi), March 1998.
Husain, Syed Sajjad, *The Wastes of Time: Reflections on the Decline and Fall of East Pakistan*, Notun Safar Prokashani, Dhaka, 1995.
Ibrahim, Neelima, *Ami Birangona Bolchhi*, Jagriti Prakashani, Dhaka, 2001.
Imam, Akhtar, *Amar Jibankatha: Dhaka Viswavidyalay (1952–82)*, Dhaka, 2002.
———, 'Ekattorer ponchishe March ebong kichhu ghotona', in Akhtar Imam, *Vividha Rachana*, Dhaka, 1998.
Imam, Jahanara, *Ekattorer Deenguli*, Sandhani Prakashani, Dhaka, 1986.
Jackson, Robert, *South Asian Crisis: India-Pakistan-Bangladesh*, Chatto & Windus, 1975.
Jacob, Lt Gen. J.F.R., *Surrender at Dacca, Birth of a Nation*, Manohar, 2001.
Jahan, Rounaq, *Pakistan: Failure in National Integration*, Columbia University Press, 1972.
Kabir, Shahriar, ed., *Ekattorer Duhsaha Smriti*, Ekattorer Ghatok Dalal Nirmul Committee, Dhaka, 1999.
Karimullah, Brig., 'Log of Daily Events—POF, Ghazipur, 2 March to 3 April, 1971' (unpublished document).
Khan, Roedad, *Pakistan—A Dream Gone Sour*, Oxford University Press, Karachi, 2004.
Khan, Sahabzada Yaqub, *Strategy, Diplomacy, Humanity—Life and Work of Sahabzada Yaqub Khan*, compiled by Anwar Dil, Intercultural Forum, Takshila Research University, Islamabad, 2005.
Kissinger, Henry, *White House Years*, Weidenfeld & Nicholson and Michael Joseph, London, 1979.
Liberation War Museum, *Documents on Crimes against Humanity Committed by Pakistan Army and their Agents in Bangladesh during 1971*, Dhaka (no date given).
Lifshultz, Lawrence, *Bangladesh: The Unfinished Revolution*, Zed Press, London, 1979.
Loshak, D., *Pakistan Crisis*, McGraw Hill, 1971.
Mamoon, Muntassir, ed., *Chuknagarey Ganahatya: 1971*, Bangladesh Charcha (Centre for Bangladesh Studies), 2002.
Mascarenhas, Anthony, *The Rape of Bangladesh*, Vikas Publications, Delhi, 1971.
———, *Bangladesh: A Legacy of Blood*, Hodder and Stoughton, London, 1986.
Matinuddin, Lt Gen. Kamal, *Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968–71*, Services Book Club, Lahore, 1993.
Mitha, Maj. Gen. A.O., *Unlikely Beginnings: A Soldier's Life*, Oxford University Press, Karachi, 2003.
Niazi, Lt. Gen. A.A.K., *The Betrayal of East Pakistan*, Oxford University Press, 1998.

Nixon, Richard, *The Memoirs of Richard Nixon*, Grosset and Dunlap, New York, 1978.
Noman, Omar, *Pakistan: Political and Economic History Since 1947*, Kegan Paul International, London and New York, 1988.
Obermeyer, Z, C.J.L. Murray and E. Gakidou, 'Fifty Years of Violent War Deaths from Vietnam to Bosnia: Analysis of Data from the World Health Survey Programme', *British Medical Journal*, 336 (7659), 1482–6, 19 June 2008.
Pakistan, Government of, *White Paper on the Crisis in East Pakistan*, 5 August 1971.
Qadir, Brig. Shaukat (unpublished manuscript).
Qureshi, Maj. Gen. Hakeem Arshad, *The 1971 Indo-Pak War: A Soldier's Narrative*, Oxford University Press, 2002.
Rahman, Muhammad Anisur, *My Story of 1971*, Liberation War Museum, Dhaka, 2001.
Rahman, Maj. Gen. Muhammad Khalilur, *Purbapor 1971: Pakistani sena-gauhvar theke dekha*, Sahitya Prakash, Dhaka, 2005.
Raina, Asoka, *Inside RAW: the Story of India's Secret Service*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1981.
Riza, Maj. Gen. Shaukat, *The Pakistan Army 1966–71*, Services Book Club, Lahore, 1990.
Roy, Raja Tridiv, *The Departed Melody: Memoirs*, PPA Publications, Islamabad, 2003.
Safiullah, Maj. Gen. K.M., *Bangladesh at War*, Academic Publishing, 1989.
Saikia, Yasmin, 'Beyond the Archive of Silence: Narratives of Violence of the 1971 Liberation War of Bangladesh', *History Workshop Journal*, 58, 275–87, 2004.
———, 'Bodies in Pain: A People's History of 1971', in Bhagavan and Feldhaus, (ed.), *Claiming Power from Below: Dalits and the Subaltern Question in India*, Oxford University Press, 2008.
Salik, Siddiq, *Witness to Surrender*, The University Press (with permission from Oxford University Press, Karachi, 1977), Dhaka, 1997.
Siddiqi, Brig. A.R., *East Pakistan the Endgame: An Onlooker's Journal 1969–71*, Oxford University Press, Karachi, 2004.
Siddiqi, Kader, *Swadhinata '71*, Volumes 1 and 2, Dey's Publishing, Calcutta, 1985.
Singh, Maj. Gen. Lachhman, *Victory in Bangladesh*, Natraj Publishers, Dehra Dun, 1981.
Singh, Maj. Gen. Sukhwant, *The Liberation of Bangladesh*, vol. 1, Vikas, 1980.
Sisson, Richard and Leo Rose, *War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh*, University of California Press, 1990.
Talbot, Ian, *Pakistan: A Modern History*, St. Martin's Press, New York, 1998.
United States Department of State, *South Asia Crisis, 1971*, in *Foreign Relations of the United States, 1969–1976*, Volume XI, 2005.
Wilcox, Wayne Ayres, *The Emergence of Bangladesh: Problems and Opportunities for a Redefined American Policy in South Asia* (Foreign affairs study), American Enterprise Institute of Public Policy Research, Washington, 1973.
Williams, L.F. Rushbrook, *The East Pakistan Tragedy*, Tom Stacey, London, 1971.

Yeager, General Chuck and Leo Janos, *Yeager: An Autobiography*, Bantam Books, 1985.
Zaheer, Hasan, *The Separation of East Pakistan: The Rise and Realization of Bengali Muslim Nationalism*, Oxford University Press, 1994.

Audio-visual material

Sheikh Mujibur Rahman's speech in Dhaka, 7 March 1971.
Liberation War Museum, Dhaka, Recording of radio communication among army officers and units during military action in Dhaka, 25–26 March 1971 (I have obtained confirmation that the recording is authentic through my interviews with Pakistan army officers).
George Harrison and others, songs for Bangladesh, 1971.
Shei raater kotha boltey eshechhi, Bengali film, dir: Kawsar Chowdhury.
Tareque Masud, *Muktir Gaan*, documentary film.
Tanvir Mokammel, documentary film prepared for the Liberation War Museum, Dhaka; documentary film *Ekti Golir Atmakahini*; feature films *Nodir Naam Modhumoti*, *Chitra Nodir Parey*.
'War Crimes File', *Dispatches*, Channel 4 Television, UK, 1994.

DEAD RECKONING

(ڈھاکہ کہانی— کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی)

سرمیلا بوس

۱۹۷۱ء کی پاک-بھارت جنگ کے موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں جنگ کے واقعات، اس جنگ میں حصہ لینے والوں کی یادداشتوں کی بنیاد پر زمانی ترتیب میں پیش کیے گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کا سال پاکستان میں جاری تلخ ترین خانہ جنگی اور پاک-بھارت جنگ کی وجہ سے حد درجہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس جنگ میں بھارت کو سوویت یونین جبکہ پاکستان کو امریکا کی حمایت حاصل تھی۔ یہ جنگ مشرقی پاکستان میں لڑی گئی تھی جو بعد ازاں بنگلہ دیش کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔ زمینی واقعات کی مفصل تحقیقات کے ذریعے سرمیلا بوس اس جنگ کے انسانی پہلوؤں اور ان کے سیاق وسباق کو متعین کرتی ہیں اور وہ واقعات جو اس تنازع کی نوعیت اور حقیقت کے بارے میں انکشافات کرتے ہیں، ان کا تجزیہ بھی کرتی ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی داستان پر فاتح فریق کا نقطۂ نظر چھایا رہا ہے۔ جنگ کے تمام فریقین خصوصاً فاتح قوتیں اب بھی زمانۂ جنگ کے جانبدارانہ اسطوروں میں قید ہیں۔ سرمیلا بوس نے بنگلہ دیش اور پاکستان میں متعلقہ افراد کے انٹرویوز، تمام فریقین کی جانب سے جنگ میں حصہ لینے والوں کی بنگالی اور انگریزی میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادداشتوں، سرکاری دستاویزات، غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پر تمام واقعات کو ازسرنو ترتیب دیا ہے۔ ان کی کتاب اس تنازع کے اسباب سے جڑے مفروضات کو چیلنج کرتی ہے اور اُن صورتوں سے پردہ اٹھاتی ہے جن صورتوں میں ۱۹۷۱ء کا کھیل اب بھی کھیلا جا رہا ہے۔

"اعلیٰ تحقیقی علم اور تاریخ درست کرنے کے جذبے کی وجہ سے Dead Reckoning ۱۹۷۱ء کی مشرقی پاکستان/ بنگلہ دیش جنگ کے سماجی، ثقافتی اور سیاسی پہلوؤں کی سب سے بہتر اسٹڈی ہے۔ سرمیلا بوس سچ کی خدمت کے جذبے کے تحت لکھتی ہیں۔ ہم ان کے مقروض ہیں۔"
—اسٹیفن کوہن، مصنف The Idea of Pakistan
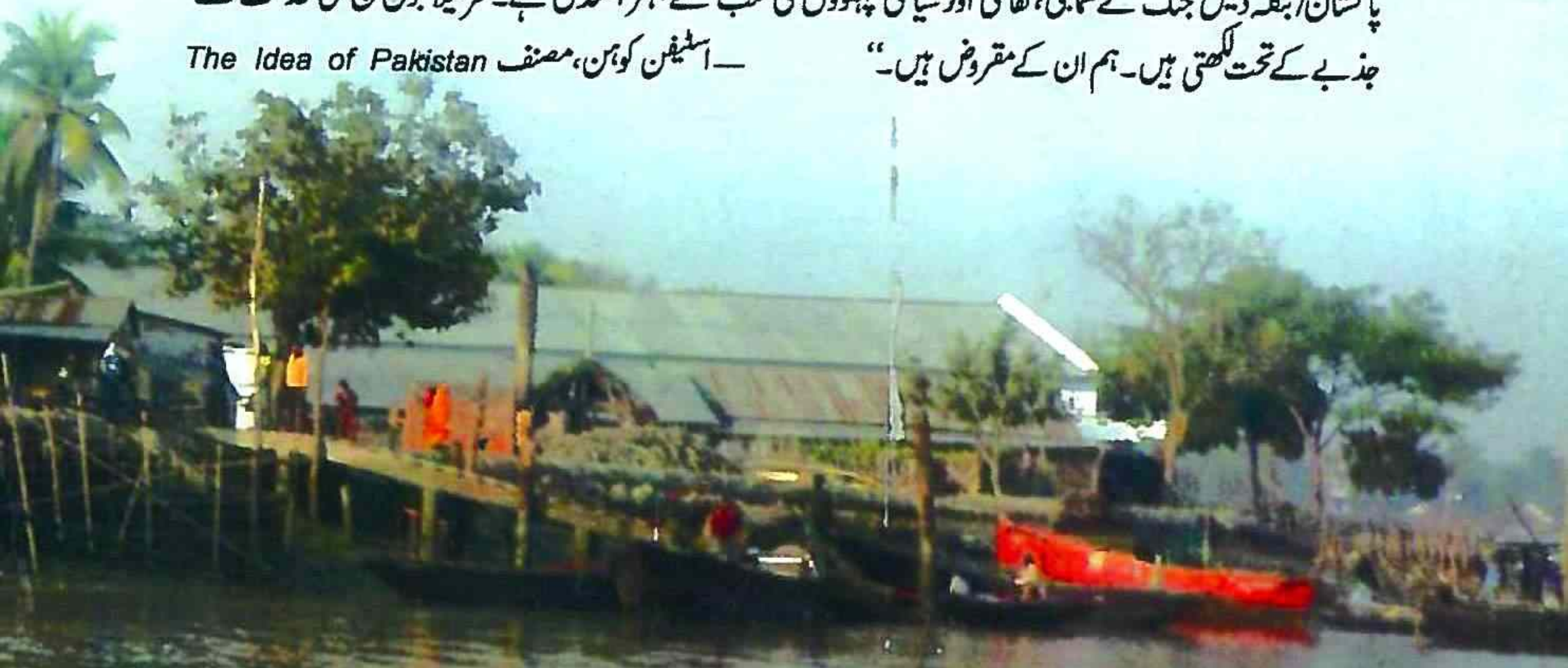
سرمیلا بوس اوکسفرڈ یونیورسٹی میں Politics of South Asia کے شعبے سے بطور سینئر ریسرچ فیلو منسلک ہیں۔ انھوں نے بھارت میں صحافی کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دی ہیں۔ بطور صحافی ان کا میدان سیاست تھا۔ وہ تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ سے بھی وابستہ ہیں۔ وہ Bryn Mawr کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں۔

Army Publishing House
2013